قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

جولائی 2015، قیمت -/15₹

ماہنامہ

اردو دنیا

دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

اردو ادب اور خواتین

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

بچّوں کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول
عجیب وغریب خبریں

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ان کے علاوہ:

دنیا کے مذاہب ♦ کامکس کہانی ♦ نانی کا صندوق

اردو ایس ایم ایس ♦ اردو فیس بک ♦ دماغی ورزش

ننھے فنکار ♦ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

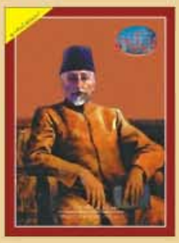

ہندوستان بھر میں سب سے زیادہ چھپنے والا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ : 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002 فون: 24415194 - 040

مشمولات

ماہنامہ اُردو دُنیا دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:17 شمارہ: 07 جولائی 2015

مدیر : پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)
نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی
اعزازی مدیر : نصرت ظہیر

ناشر اور طابع
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

مطبع:
ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل
کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: فیض الاسلام فیضی

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھرگٹی، حیدرآباد۔500002
فون: 040-24415194

اداریہ

ہماری بات 4

خطوط

آپ کی بات قارئین کے خطوط 5

انٹرویو

مدیر، شاعر افتخار امام صدیقی سے مکالمہ اشتیاق سعید 9

اردو ادب اور خواتین

اردو ادب میں خواتین کا حصہ دردانہ قاسمی 11

بھوپال کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ نواب شاہجہاں بیگم محمد نعمان خان 13
ہندی مراٹھی ادب میں تانیثیت بانو سرتاج 15
اردو ناول نگاری میں خواتین کا حصہ صادقہ نواب سحر 17
اردو کی چند کم معروف شاعرات ساجدہ شیروانی 19
اردو شاعری میں تانیثی و مزاحمتی رویے فوزیہ خانم 21
اردو ادب میں تانیثیت شیخ شبانہ بانو 25

زبان و تعلیم

دانش مندی بمعنی کتاب دانی غضنفر علی 28
انٹرنیٹ، اردو تحقیق میں مواد کی فراہمی کا جدید ذریعہ عبدالعزیز سہیل 32

ادبی مباحث

جدید اردو شاعری اور شاد عارفی شریف احمد قریشی 35
اردو میں افسانچہ نگاری مشتاق احمد وانی 37
بہار کے افسانہ نگاروں کا اسلوب شاہین سلطانہ 39

مشاہیر ادب

ناول نگار گیبریل گارسیا مارکیز حیات افتخار 42
آخر کار گیبریل گارسیا مارکیز ترجمہ: فاروق حسن 44

شخصیات

عاشقِ اردو: وجاہت علی سندیلوی جمال نصرت 46
فارسی زبان اور لچھمی نرائن شفیق عبدالقادر 48

خراج عقیدت

اقبال متین: کثیر الجہات ادبی شخصیت احمد علی جوہر 50

تہذیب و ثقافت

تصوف اور ہندوستان ناشر نقوی 52
اردو شاعری اور فلسفۂ تصوف زرنگار 57

صحت

گرمی دانے اور اس کا تدارک یونانی نقطۂ نظر سے بلال احمد 61

کتابوں کی دنیا

تبصرہ و تعارف 65

عالمی اردو نامہ

اردو نامہ ادارہ 77

خبر نامہ

اردو دنیا کی خبریں ادارہ 78

ہماری بات

انیس سال اور کچھ مہینے گزرے جب اپریل 1996 میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا حکومت ہند کے ایک خودمختار ادارے کے طور پر قیام عمل میں آیا اور کونسل پورے ملک میں اردو زبان و تہذیب کے فروغ کے سب سے بڑے ادارے کی صورت میں کام کرنے لگی۔ یہ اردو کونسل کی خوش قسمتی تھی کہ اسے ابتدا ہی سے اُن روشن شخصیتوں کی انتظامی قیادت میسر آئی جنھوں نے تقسیم وطن کے بعد پہلی بار اردو زبان کو نئے سماجی، اقتصادی و تہذیبی تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے اور اسے روزگار سے جوڑنے کی شعوری اور عملی کوشش شروع کی۔ ان انتظامی سربراہوں نے اردو زبان و ادب کی بڑی ہستیوں کے تعاون سے اردو کے فروغ کے کام کو نئی سمت دی، اسے ایک نئے وژن سے روشناس کرایا اور ترقیاتی منصوبوں کے لیے وہ رہنما خطوط متعین کیے جن پر قومی اردو کونسل آج بھی عمل پیرا ہے۔

کونسل کی تاریخ کا سب سے اہم اور انقلابی قدم اس کے سابق ڈائرکٹر ڈاکٹر حمید اللہ بھٹ کے دور میں تب اٹھایا گیا جب اردو کی تعلیم کو کمپیوٹر اور جدید ٹیکنالوجی سے جوڑتے ہوئے ملک کے طول و عرض میں اردو کے ہزاروں کمپیوٹر سینٹر کھولے گئے۔ اس وقت اردو کے کئی حلقوں نے اس منصوبے کی افادیت پر شک و شبہ ظاہر کرتے ہوئے اسے فضول خرچی قرار دیا تھا لیکن چند برسوں میں ہی یہ شبہات غلط ثابت ہوگئے۔ ان کمپیوٹر مراکز کی بدولت نہ صرف یہ ہوا کہ بے شمار لوگوں نے اردو کی تعلیم حاصل کی بلکہ لاکھوں لوگ کونسل کا باوقار کمپیوٹر ڈپلوما اور سرٹیفکیٹ حاصل کرکے برسرِ روزگار بھی ہو پائے۔ یہی نہیں، اردو کے غیر روایتی علاقوں تک اردو کی روشنی پہنچانے کی خدمت بھی ان مراکز نے ہی انجام دی۔

ایک اور بڑا کام اردو کونسل نے اردو زبان و ادب اور دیگر فنون سے متعلق ایسی نایاب کتابیں چھاپ کر انجام دیا جن کی اشاعت کو عام اردو پبلشر گھاٹے کا سودا سمجھتے آئے تھے۔ آج قومی اردو کونسل اردو کتابوں کے سب سے زیادہ ٹائٹلز چھاپنے والا ادارہ بن چکی ہے۔ مستزاد یہ کہ یہ سبھی کتابیں کونسل کی ویب سائٹ پر 'ای بکس لائبریری' کے تحت آن لائن دستیاب ہیں۔ اسی طرح قومی اردو کونسل ملک کے مختلف شہروں میں ہر سال جو اردو کتاب میلے منعقد کرتی ہے ان سے بھی تقسیم ہند کی ماری ہوئی اس زبان کو بے حد تقویت ملی ہے۔ اس کے علاوہ کونسل، اردو کتابوں اور رسائل و جرائد کی اشاعت اور مختلف ادبی سیمیناروں و تہذیبی و ثقافتی پروگراموں کے انعقاد کے لیے مالی امداد کی فراہمی کے ذریعے بھی اردو کو فروغ دے رہی ہے۔ کونسل کے تین اہم رسالے 'فکر و تحقیق'، 'اردو دنیا' اور 'بچّوں کی دنیا' اپنے اپنے حلقۂ طلب میں اردو کے اہم ترین رسالے مانے جاتے ہیں۔ 'اردو دنیا' ملک کا سب سے زیادہ چھپنے والا اردو ماہنامہ ہے اور 'بچوں کی دنیا' نے تو فروخت کے عالمی ریکارڈ قائم کردیے ہیں، جس سے نئی نسل کو بچپن سے ہی اردو زبان سے جوڑنے کا راستہ کھلا ہے۔

اردو کونسل کا یہ شاندار سفر ہم سبھی اردو والوں کے لیے باعث شادمانی ہے لیکن جیسا کہ ہر کامیاب سفر کے ساتھ ہوتا ہے، سفر کی کامیابیوں نے خود اردو کونسل کی ذمے داریاں بھی بڑھا دی ہیں۔ ان ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کونسل نے اگر ابھی سے خود کو تیار نہ کیا تو ایسی کامیابیوں کے ناکامیوں میں بدل جانے کا سلسلہ زیادہ دور نہیں ہوا کرتا۔ ضروری ہے کہ فروغ اردو کے اس سفر کے لیے نئے نشانِ راہ متعین کیے جائیں اور نئی منزلوں کو مقصودِ سفر بنایا جائے۔ کونسل کی نئی قیادت اس سلسلے میں سنجیدگی سے غور کررہی ہے اور کئی ایسی تجاویز کا جائزہ لیا جارہا ہے جو اردو کے فروغ و بقا کے لیے مثبت اور دوررس نتائج کی حامل ہوسکتی ہیں۔ کونسل کے بنیادی اغراض و مقاصد اور آج کی ضرورتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اب ادب سے زیادہ زبان کے فروغ پر توجہ دی جائے گی۔ ہماری کوشش رہے گی کہ کونسل کی سرگرمیوں اور بجٹ کا بڑا حصہ اردو زبان کے فروغ کے لیے استعمال ہو اور چونکہ ادب کے فروغ کو بھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا لہٰذا اس پر ضرورت کے مطابق توجہ دی جائے۔ کونسل اردو میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کے 50 ریسرچ اسکالرز کو وظیفے دے کر ایک نیا سلسلہ شروع کرنا چاہتی ہے جس سے اردو میں اعلیٰ تعلیم کے حصول کو فروغ ملے گا۔ اسی طرح کونسل کی ایک تجویز یہ ہے کہ اس کے مزید چار علاقائی مراکز یا ریجنل سینٹر کھولے جائیں تاکہ ملک کے ہر گوشے میں اردو کی ترقی کے کام اور بھی موثر انداز میں انجام پاسکیں۔ اس وقت کونسل کا صرف ایک ریجنل سینٹر حیدرآباد میں ہے۔ ملک کے شمال و جنوب، مشرق و مغرب اور وسطی علاقے میں اس کے اپنے مرکز کے قیام سے اردو زبان کو جو بے حساب فائدہ پہنچے گا اس کا اندازہ شاید آج نہ لگایا جاسکے لیکن اردو کی آنے والی نسلیں اس کے لیے یقیناً قومی اردو کونسل کی احسان مند ہوں گی اور اردو کا مؤرخ اسے کونسل کا ایک اور انقلابی قدم قرار دے گا۔

ان سب کے لیے تمام اردو والوں کے مثبت اور عملی تعاون کی ضرورت ہے اور ہمیں امید ہے کہ محبّانِ اردو مایوس نہیں کریں گے!

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

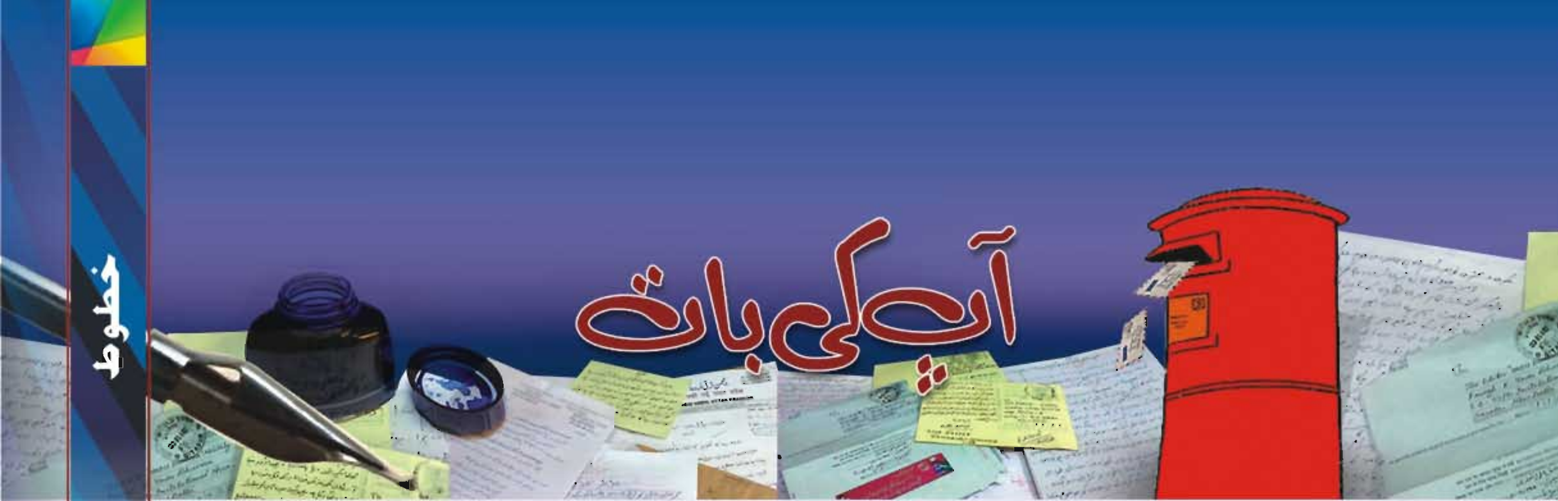

کرشن بھاوک

A-201، گورو نانک نگر، گلی نمبر K-18، پٹیالہ (پنجاب)

'اردو دنیا' جون کا شمارہ 'اردو اور سائنسی شعور' کے ساتھ ساتھ ہندوستانی فلسفۂ یوگ جیسے موضوعات کے اہم گوشوں پر مبنی ہے۔ اس میں محنت طلب کل مضامین میں مختلف زاویوں سے کور اسٹوری کا احاطہ کیا ہے اور قارئین اس کے لیے تمام مصنفوں کے ممنون ہیں۔ میری دانست میں معیاری ادب کی سب سے بڑی صلاحیت اس کے توسط سے دورِ حاضر کی حیات کے اہم مدعوں کو بذریعہ سوالات زبان عطا کرنا ہے۔ اس شمارے میں جناب مقصود الٰہی شیخ کے ساتھ ڈاکٹر عبدالحی نے جو بلند پایہ مشافحہ پیش کیا ہے، اس سے بھی ایسے ہی متعدد سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ محترمہ عصمت چغتائی کی نصیحت کے باوصف اور ان کے عقیدے کے خلاف شیخ صاحب کے اس ذاتی جواز سے صدفی صد متفق ہوا جا سکتا ہے کہ 'ادب میں گروہ پسندی' کی مخالفت کرنا ہی جائز ٹھہرتا ہے۔ نیز مقصود الٰہی شیخ صاحب کے اس نئے خیال کے بھی قارئین صدفی صد حامل ہوں گے کہ کسی تحریک سے متاثر ہونا اور وابستہ ہونا دو مختلف عمل ہوا کرتے ہیں۔ عجلت میں ہی شاید شیخ جی نے یہ غلط بیانی کر دی ہے کہ ''شتر مرغ اپنی راکھ سے دوبارہ سر اٹھاتا ہے۔ (صفحہ 10) اصل میں شتر مرغ کی بجائے Phoenix نام ہونا چاہیے تھا، جس کے بارے میں ایک لغت میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ ''یہ مصر کی دیومالاؤں سے وابستہ وہ پرندہ ہوتا ہے، جو کہ ہر پانچ سو سال بعد جل کر پہلے تو راکھ بنتا ہے، بعد ازاں اس کا تناسخ ارواح، یعنی وہ اپنی حیاتِ ثانی میں ظہور پذیر ہو جایا کرتا ہے۔ ('راجپال انگریزی ہندی شبد کوش، مرتب ڈاکٹر ہردیو باہری، ناشر: راجپال اینڈ سنز، دہلی۔ پانچواں ایڈیشن سنہ 1993 ص 512)

اسی غالباً فرضی پرندے کو عربی زبان میں 'ققنس' (مذکر لفظ) کہا جاتا ہے۔ اس کے یہ معنی درج ہیں۔ ''ققنس' ایک شیریں زبان والی ایسی چڑیا ہے، جس سے

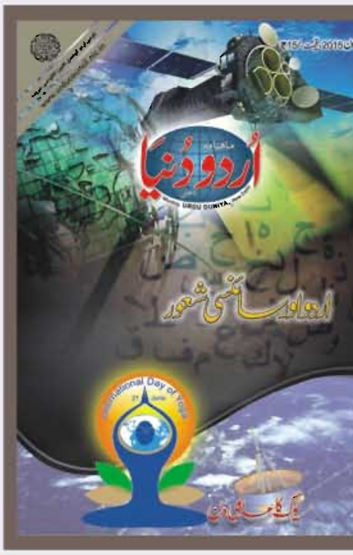

یونانیوں نے فنِ نغمگی سیکھی تھی۔ عوامی یقین کے بموجب اس کے گانے سے آگ لگ جایا کرتی ہے۔'' ('اردو ہندی شبد کوش'، مرتب: محمد مصطفیٰ خاں مداح، اترپردیش ہندی سنستھان، لکھنؤ، لفظ 'ققنس' ص 128) عوامی زبان میں اسی کو 'اگن پاکھی' کہا جاتا ہے اور اس کو استعارہ بنا کر مختلف زبانوں میں نظموں، افسانوں و ناولوں کی شاندار تخلیق کی جاتی رہی ہے۔

اس شمارے میں نذیر فتح پوری کا کالی داس گپتا رضا کی کتاب دوستی جیسے نایاب موضوع پر تحریر کردہ مقالہ ہے۔ اس میں ادب و کتب سے رضا صاحب کی لا انتہا محبت کی حقیقی عکاسی ہوئی ہے۔ اُنھیں کی نظم کے اس مصرعے ''میرا سب لے لو، مجھے میری کتابیں دے دو۔'' (ص 46) میں بلند پایہ مختصر، لیکن معیاری مضمون کے عنوان کا مکمل جواز مقید ہے۔ اس کے ساتھ ہی انھیں کی ایک رباعی کے اس آخری مصرعے ''محفوظ ہے جو ذہن میں، وہ سب لکھ ڈالو۔'' میں اردو ادب کے تئیں بے پناہ و بے مثل رغبت و محبت کا گویا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔

اسی طرح محترمہ نشاں زیدی نے پنجابی ادب و شاعری کی نمائندہ ادیبہ امرتا پریتم کے ناولوں میں نسائی کرداروں کا محاسبہ کرنے والا قابلِ تحسین مقالہ بطور خراجِ عقیدت بھی گردانا جا سکتا ہے۔

اس شمارے کے آخر سے قبل زیرِ عنوان 'تبصرہ و تعارف' کتاب گوپال متل: ذات و صفات' میں اسرار رازی کی تنقید معیاری ہے۔ ان کا یہ امر لائقِ مدح ہے کہ ''مختلف پیرایوں میں تکرار کا بھی الگ مزہ ہوتا ہے۔'' (ص 71) اگرچہ زیرِ عنوان کتاب 'رپیڈیکس کمپیوٹر کورس' ہر چند محبانِ اردو کے لیے از حد مفید ہے تاہم اس میں فقط ایم۔ ایس۔ ورڈ M.S.Word کو ہی بالخصوص مرکز بنایا گیا ہے۔ ورڈ کی بجائے فقط 'پیج میکر 7.0' میں ہی میری طرح ٹائپ کرنے والے سیکڑوں محبانِ اردو کے لیے بھی الگ سے ایک تکنیکی کتاب کی جلد از جلد اشاعت وقت کا تقاضا ہے۔ آخر میں 'عالمی اردو نامہ' جریدہ کے مستقل گوشے کے تحت اردو غزل کا ارتقا، جون ایلیا: فن اور شخصیت، قومی یک جہتی کے فروغ میں اردو زبان کا کردار، سرسید، منشی نول کشور، عرفان صدیقی، ریوتی سرن شرما اور متعدد شخصیات و اعزازات وغیرہ سے متعلق معلوماتی تقریبات کا کونسل کے توسط سے انعقاد قابلِ مدح ہے۔

تنویر پھول

نیویارک، امریکہ

'اردو دنیا' کے تازہ شمارے میں مقصود الٰہی شیخ کا انٹرویو بے حد معلوماتی اور وقیع ہے۔ اس انٹرویو کے سوالات کا جواب مقصو صاحب نے بڑے سلجھے ہوئے انداز میں دیا ہے جو نہایت دل چسپ ہے۔ انھوں نے کوئی بات چھپائی نہیں، صاف دلی سے سب کچھ بیان کر دیا ہے، اس میں انٹرویو لینے والے کا بھی کمال ہے۔ 'مسافرانہ تعلیم'، 'غریبانہ پرورش'، قلم کی مزدوری، خودسری لیکن اماں ابا کی فرماں برداری، یہ سب پڑھ کر بہت لطف آیا۔ مقصود صاحب نے 'پوپ کہانی' کہنے پر لوگوں کے بے جا اعتراض کا ذکر کیا ہے۔ اصل میں بات یہ ہے کہ کچھ لوگ تنقید برائے تنقید اور تنقید برائے تنقیص میں فرق ملحوظ نہیں رکھتے اور بعض کو خواہ مخواہ کیڑے نکالنے اور اپنے

دماغ کے کیڑے مارنے کا شوق ہوتا ہے، وہ حسد میں مبتلا ہوکر ایسی باتیں کہتے ہیں۔ نام سے کیا ہوتا ہے، کام دیکھنا چاہیے۔ آپ 'ہائیکو' اور 'سانیٹ' کے نام کو اردو میں معیوب نہیں سمجھتے تو 'پوپ کہانی' پر اعتراض کیوں؟ مشہور ہے کہ پھول کو جس نام سے بھی پکارو، وہ پھول ہی رہے گا۔ اس لیے نام نہیں کام دیکھنا چاہیے۔ مقصود صاحب نے بڑی درست بات کہی ہے کہ ''فی زمانہ اب پ ت سے ناواقف ان پڑھ نہیں کہلائے گا۔ میں تو کہوں گا جو کمپیوٹر پر انگلیاں چلانے کا اہل نہیں وہ اصلی اور سب سے بڑا ان پڑھ ہے۔''

محمد عارف اقبال
مدیر، اردو بک ریویو، نئی دہلی

ماہنامہ اردو دنیا کے شمارہ جون 2015 کے خبرنامہ کے کالم میں جناب معصوم مرادآبادی اور جاوید اختر کے ایوارڈ کی خبر روزنامہ جدید خبر (مورخہ 21 اپریل 2015) کے حوالے سے شائع ہوئی ہے۔

اس خبر میں معروف مجلّہ 'اردو بک ریویو' کے حوالے سے ایک خلافِ حقیقت بات شائع ہوگئی ہے۔ اس میں جناب جاوید اختر کو 'اردو بک ریویو' کا بانی ایڈیٹر لکھا گیا جو خلافِ واقعہ ہے۔ جناب جاوید اختر کو تکنیکی اعتبار سے بانی پرنٹر، پبلشر کہا جاسکتا ہے نہ کہ ایڈیٹر۔ 'اردو بک ریویو' کا پہلا شمارہ نومبر 1995 میں منظرِ عام پر آیا۔ اس کے بانی ایڈیٹر جناب اسرار عالم تھے اور راقم السطور اوّل شمارے سے اس مجلّے کا منیجنگ ایڈیٹر رہا۔ جناب اسرار عالم ستمبر 1996 تک اس کے ایڈیٹر رہے۔ اس کے بعد فروری 1998 تک راقم منیجنگ ایڈیٹر کے ساتھ عملاً اس کا مدیر بھی رہا۔ مارچ 1998 سے جناب جاوید اختر اس کے مدیر (اعزازی) بن گئے۔ راقم السطور اردو بک ریویو کا مدیر مسئول رہا۔ جاوید اختر اگرچہ فروری 2001 تک مدیر (اعزازی) رہے لیکن دیگر ادارتی امور کے ساتھ اداریہ لکھنے کا فریضہ بھی مدیر مسئول ہی ادا کرتا رہا۔ اطلاعاً عرض ہے کہ مارچ 2001 سے تاحال راقم ہی اردو بک ریویو کا کلّی طور پر مدیر ہے۔

اسلم مصباحی
ریسرچ اسکالر جے این یو، نئی دہلی

جون کا تازہ شمارہ وقت پر نظر نواز ہوا بڑی خوشی ہوئی۔ تمام مشمولات عمدہ ترین ہیں، لیکن جو مضامین سائنسی، طبی یا پھر اطلاعاتی ہوں ان میں اس بات کا خاص خیال رکھنا چاہیے کہ جن اصطلاحوں کو دوسری زبان سے لیا گیا ہے اور ان کا رواج اردو میں ابھی تک نہیں ہوا ہے ان کو جلی حروف میں یا پھر قوسین میں لکھنا زیادہ بہتر ہوگا، جو

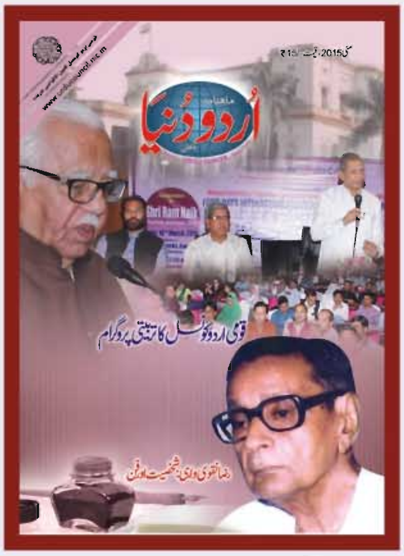

اصطلاحیں انگریزی سے ماخوذ ہیں ان کا براہ راست ترجمہ نہ شائع کیا جائے بلکہ قوسین میں ترجمہ اور اصطلاح کو بعینہٖ نقل کردیا جائے تاکہ مفہوم تک پہنچنے میں زیادہ کھینچ تان سے بچا جاسکے۔ سرورق دیدہ زیب ہے اور خوب ہے مگر اندرون صفحہ تزئین کاری اس حد تک نہ کی جائے کہ بعض جگہ الفاظ Background کی رنگت میں چھپ جائیں۔ کسی بھی مقبول و معروف شخصیت کا انٹرویو شائع کرتے وقت شروع میں اس کے متعلق خاص نکات اور احوال کا ذکر کردیا جائے تو پڑھنے میں دل چسپی برقرار رہتی ہے۔

ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی
سابق ممبر راجیہ سبھا، نئی دہلی

حسن طباعت و کتابت سے مزین محققانہ و معلوماتی مضامین پر مشتمل مئی 2015 اردو دنیا کا شمارہ موصول ہوا۔ طنز و ظرافت کے معروف و مشہور شاعر رضا نقوی واہی کے گوشے کے تحت: قصہ شعرستان کا، طنز و ظرافت کا شاعر، اردو کی طنزیہ شاعری اور رضا نقوی واہی، واہی اور ضیاء الحق قاسمی کی منظوم خط و کتابت، واہی کا فن اور طنز و مزاح، زبان و تعلیم کے تحت: جدید تعلیمی منظرنامہ اور فکر اقبال کی معنویت، ادبی مباحث کے تحت: اکیسویں صدی میں ادب کی معنویت، تہذیب و ثقافت کے تحت: دہلی کی ادبی و تہذیبی فضا اور تبصرے، متعدد نامانوس اور ادق الفاظ اس شمارے میں نظر سے گزرے۔ مثلاً: تکلیف، تعاہد، ترادفیت، شعریات کا لفظ بھی تھا۔

اس طرح یہ صحیح نہیں کہ امت مسلمہ کے زوال کے ذمے دار علما ہیں۔ مسلمانوں کے زوال کی وجہ اسلامی تعلیمات کے صریح مخالف عہد اسلامی اثرات کے تحت زندگی گزارنا اور عہد اسلامی زندگی گزارنے والے قانون کی پیروی کرنا ہے۔

مصطفیٰ ندیم خاں غوری
زرینہ منزل، ورنداون کالونی، قدیم جالنہ، ضلع جالنہ، مہاراشٹر

'اردو دنیا' مئی 2015 کے حوالے سے عرض ہے کہ تبصرہ دراصل تنقید کا خلاصہ ہوتا ہے۔ تنقید میں زیرِنظر مواد کے محاسن و معائب دونوں کو ہی پیش کیا جاتا ہے۔ محاسن کے تحت مواد کے مفید پہلوؤں کو اُجاگر کیا جاتا ہے جس سے قاری و مصنف دونوں کو ہی یک گونہ اطمینان و تقویت حاصل ہوتی ہے۔ اور اگر تصنیف میں کچھ عیوب در آگئے ہوں تو ان کا اظہار اِس سلیقے سے کیا جاتا ہے کہ مواد میں تصحیح بھی ہوجائے، مصنف پر گراں بھی نہ گزرے اور قاری کی طبیعت مکدر نہ ہونے پائے۔ اس کا عین مقصد یہ ہے کہ آئندہ ایسی کوتاہی سے اجتناب کرتے ہوئے صحت مند ادب پیش کیا جاسکے۔ ایسی گزارش 'اردو دنیا' میں اکثر 'آپ کی بات' کے تحت کی جاتی رہی ہے۔ مزید یہ کہ کسی غلطی کا اس کسوٹی پہ بے لاگ، منصفانہ اور شائستہ اظہار درکار ہے۔ اگر طلبہ کے لیے تنقید یا تبصرہ کیا جارہا ہو تو یہ سخت ذمے داری کا کام ہے۔ اس سلسلے میں ناقد یا مبصر کا انتخاب نہایت احتیاط سے کیا جانا چاہیے۔ محولہ بالا شمارے میں کوئی پندرہ کتابوں پر تبصرے شامل ہیں۔ ماشاء اللہ سبھی مبصرین نے بڑے عالمانہ انداز اور دیانت داری سے اپنے تبصروں میں توازن کو برقرار رکھا ہے۔ بس ایک دو جگہ ذرا دھیان دینے کی ضرورت تھی کہ تبصرہ 'اردو صوتی لغت' (ص 55) کے تحت دی گئی صفحات، قیمت اور سنہ اشاعت کی تفصیلات سہواً جوں کی توں تبصرہ 'فکر و تحقیق' (نئی نظم نمبر) ص 57) میں در آگئیں۔ دوسرے اِس تبصرے میں ''ایمانداری و ہوش مندی کے ساتھ ادب کے اساتذہ و طلبہ کے دلوں سے رشتہ بآسانی جوڑ لینے'' کی بات کہی گئی ہے۔ لیکن اس کے کچھ مشمولات کی نزاکتوں سے گو کہ اساتذہ واقف ہوسکتے ہیں۔ لیکن کہیں کہیں طلبہ کی علمی زبان کا اندازہ لگانا دشوار ہے۔

پرویز اشرفی
ڈی 321، دعوت نگر، اے ایف انکلیو، نئی دہلی

ہمیشہ کی طرح ماہ مئی کا اداریہ قابل توجہ اور معلوماتی ہے۔ پروفیسر خواجہ اکرام الدین نے اپنے اداریے میں درست فرمایا ہے کہ ''اردو صرف ایک زبان نہیں بلکہ ایک تہذیب، ایک ثقافت، یہاں تک کہ رہن سہن اور ہندوستانی انداز فکر کا دوسرا نام بن چکی ہے۔''

اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا دائرہ عمل مشترکہ قومی زندگی کو سجانے، سنوارنے کے معاملے میں دور دور تک پھیل گیا ہے۔ اس

عمل نے اس لاجواب زبان کو جنم دیا اور ہر دل عزیز بنایا ہے۔ مگر سوال یہ ابھرتا ہے کہ زبان کو قائم اور رائج رکھنے کی ذمے داری صرف سرکاری محکموں کی ہے؟ یا ہمارا بھی کوئی فرض ہے؟ زبان ہماری ہے، ہم اس کے محافظ اور نگراں ہیں۔ ہم کیوں اپنی زبان جو بقول دانشوران ملک ایک تہذیب ہے۔ اس کے باوجود ہم سب اپنی اس تہذیب سے پہلوتہی کر رہے ہیں۔ آخر کیوں؟

صدر عالم گوہر نے مبارک بیگم کا انٹرویو لے کر اردو دنیا کے قارئین کو نئی معلومات فراہم کی ہیں۔ راجستھان کے ریگزار سے موسیقی کے شعبے میں کئی نگینے نکلے ہیں۔ مبارک بیگم کی آواز کی اگر کوئی تشبیہ دی جاسکتی ہے تو میں یہی کہوں گا کہ جیسے شیشے سے شیشہ ٹکرانے پر جو آواز اُبھرتی ہے، وہی آواز ہے۔ گوشۂ رضا نقوی واہی کا کیا کہنا، اُن کے فکر وفن اور شخصیت کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ گوشہ اتنا وسیع ہے کہ اس چھوٹے سے خط میں سبھی مضامین کا احاطہ مشکل ہے۔ لیکن سید احمد قادری، منظر اعجاز، ہمایوں اشرف، ابوالفیض (نٹ کھٹ عظیم آبادی) جاوید احمد ڈار، محمد جابر زماں دلی مبارکباد کے حقدار ہیں۔

اردو دُنیا مئی 2015 کا شمارہ حددرجہ محققانہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ ان کی اشاعت پر دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔ یہ مضامین ہیں جدید تعلیمی منظرنامہ اور فکر اقبال کی معنویت، اکیسویں صدی میں ادب کی معنویت، باسط بھوپالی کی غزل گوئی، ٹیلی ویژن کے اردو پروگرام: اہمیت وتشکیل۔

عبداللہ عثمانی
گدیواڑہ، دیوبند، ضلع سہارنپور

’اردو دنیا‘ کا تازہ شمارہ ماہ مئی 2015 باصرہ نواز ہوا، اس میگزین کا معیار اشاعت وتخلیقات دیکھ کر دل کو قرار آتا ہے کہ ابھی اردو کے دیس میں اس کے محبان زندہ ہیں۔ یوں اردو کی حالتِ زار اس کے وطن میں کس سطح پر ہے یہ وضاحت کی ضرورت نہیں۔ اردو کا ادنیٰ عاشق ہونے کے ناطے دل چاہتا ہے کہ اس شمارے میں شائع شدہ چند مضامین پر اپنے تاثرات قارئین تک پہنچادوں۔ رسالے کا اداریہ دعوتِ فکر دیتا ہے اردو کی نئی نسل کو جس کے کاندھوں پر اس کی بقا اور وجود کا بار ہے’ آپ کی بات‘ کسوٹی ہے۔ اردو دنیا میں مطبوعہ تخلیقات کی، احقر کی نظر میں یہ بڑی قدر کی چیز ہے۔ جس میں نہ صرف عام قارئین بلکہ اردو کے ناقدین اور اکابرین کی آرا سامنے آجاتی ہیں۔ صفحہ 13 پر دیارِ میر میں... عمدہ رپورٹ ہے جس کے ذریعے اردو کے شہر لکھنؤ کی پرانی یادیں تازہ ہوگئیں۔ رضا نقوی واہی پر کئی تحریریں قابل مطالعہ ہیں ان میں ہمایوں اشرف، ابوالفیض قابل داد ہیں، محمد اسداللہ کا مضمون ’اکیسویں صدی میں ادب کی معنویت محمد رضا علی کا ’دلی کی ادبی وتہذیبی فضا‘ بھی پسند آئے۔ محمد کوثر کی کاوش ’ٹیلی ویژن کے اردو پروگرام، اہمیت وتشکیل‘ کے بارے میں عرض ہے کہ جدید ذرائع ابلاغ زبان وادب کی تشہیر کا وسیلہ تو ہیں مگر ان میں شائع شدہ زبان ومکالمے اردو کا اکثر مذاق اڑاتے ہیں۔ اردو دنیا کے اس شمارے میں صفحہ 65 تا 98 ملک بھر میں ہونے والی اردو کی سرگرمیوں کا بہترین احاطہ ہے، اس کالم میں اردو کی چھوٹی بڑی سبھی تمام قسم کی امنگیں جمع کرنا بھی قابل مبارکباد ہے۔

ایس ایس علی
اکولہ (مہاراشٹر)

’اردو دنیا‘ مئی 2015 کا شمارہ پوری آب وتاب کے ساتھ باصرہ نواز ہوا۔ اس شمارے کے تمام مشمولات پر تبصرہ طوالت کا باعث ہوگا اس لیے صرف ایک موضوع پر اظہار خیال پر اکتفا کروں گا۔ کالم ’ادبی مباحث‘ کے تحت جناب محمد اسداللہ کا مضمون ’اکیسویں صدی میں ادب کی معنویت‘ تخلیقی تنقید کا ایک خوبصورت مرقع ہے۔ مصنف کی سائنٹفک اپروچ نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ ان کا مشاہدہ (Observation) عمیق ہے، قدرت نے انھیں تجزیہ (Analysis) کا ملکہ عطا فرمایا ہے۔ نتیجہ اخذ کرنے (Inference) کی صلاحیت بھی سنِ بلوغ کو پہنچ چکی ہے۔

سلمان جونپوری
23، اقرا ڈیلکس، احمد آباد، گجرات

’اردو دنیا‘ مئی کا شمارہ حسبِ معمول بذریعہ ڈاک موصول ہوا۔ طنز ومزاح کے بہترین شاعر جناب رضا نقوی واہی پر گوشہ بہت پسند آیا۔ گوشۂ رضا نقوی واہی میں جتنے مضامین شامل ہیں تمام اپنی انفرادیت کے حامل ہیں اس کے علاوہ کوراسٹوری کا موضوع قومی اردو کونسل کا تربیتی پروگرام بھی خاصے کی چیز ہے اور رضا نقوی واہی کے کلام کا انتخاب بھی بہت خوب ہے۔ تبسم نقی کی تحریر ’جدید تعلیمی منظرنامہ اور فکر اقبال کی معنویت‘ محمد اسداللہ کا مضمون ’اکیسویں صدی میں ادب کی معنویت‘ بہت خوب ہے۔ سیفی سرونجی کا مضمون باسط بھوپالی کی غزل گوئی بہت اچھا لگا محمد رضا علی صاحب کی تحریر دہلی کی ادبی وتہذیبی فضا بہت اہم مضمون ہے اس کے علاوہ مبارک بیگم سے انٹرویو بھی بہت دلچسپ ہے بقیہ صفحے بھی لائق مطالعہ ہیں۔

محمد فرحان
34 فیئرس لین کلکتہ (مغربی بنگال)

مارچ کا ’اردو دنیا‘ موصول ہوا۔ آپ کے رسالے میں کچھ ایسے مضامین بھی شائع ہوتے ہیں جو قارئین کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں۔ اس شمارے میں بھی فرزانہ نسیم کا مضمون سب سے اعلیٰ ہے۔ عبداللہ عثمانی کا مضمون بھی بہت اچھا ہے۔ اس شمارے میں شکایت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

محراج الدین
پوسٹ آفس سلر، پہلگام، کشمیر

میں کافی طویل عرصے سے رسالہ اردو دنیا کا مطالعہ کر رہا ہوں صرف میں ہی نہیں بلکہ میرے گاؤں کے زیادہ تر لوگ رسالہ اردو دنیا کے طلب گار رہتے ہیں مجھے تو اس رسالے سے اتنا زبردست لگاؤ ہوگیا ہے کہ اس کا مطالعہ کیے بغیر ادھوراپن محسوس ہوتا ہے۔ مارچ 2015 کا شمارہ اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جلوہ افروز ہوا۔ یوں اس شمارے کے تمام مضامین ہماری بات، تبصرہ وتعارف، عالمی اردو نامہ، قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں، خبرنامہ کونسل کے مالی تعاون سے اردو سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں تعریف کے قابل ہیں۔ لیکن جناب انجینئر محی بخش قادری صاحب کا مجروح سلطانپوری غزل گوئی سے فلمی شاعری تک پڑھ کر بےانتہا خوشی ہوئی۔

شرافت حسین
قاضی پورہ، ٹانڈہ، امبیڈکر نگر

’اردو دنیا‘ اور ’بچوں کی دنیا‘ دونوں رسائل اردو حلقے میں مقبول عام ہو رہے ہیں اور اردو کی جڑیں مضبوط کرنے میں معاون ثابت ہو رہے ہیں۔ قومی کونسل کی سلامتی کے لیے دعا گو ہوں۔

ڈاکٹر خورشید جمال قاسم
امین میڈیکل اسٹور سٹی بلیا، (یوپی)

میں چار پانچ سالوں سے ’اردو دنیا‘ کا قاری ہوں۔ اس رسالے کے سبھی کالم کافی اہم ہوتے ہیں اور معلومات میں اضافہ کرتے ہیں۔ لیکن وقت اور حالات کے اعتبار سے اگر ایک کالم کا اور اضافہ کردیا جائے تو اس کی مقبولیت بڑھ جائے گی۔ مثلاً اردو داں طبقے کے لیے اردو میں کیا کیا اسکوپ ہیں اس کی اس رسالے کے ہر شمارے میں رہنمائی کی جائے، اور دوسرے یہ کہ اردو سے متعلق اپنی بات اور اسامیوں کے بارے میں اس رسالے کے ہر شمارے میں شائع کیا جائے۔ اس سے اردو داں طبقے کو کافی مدد ملے گی اور رسالے کا دائرہ بھی وسیع ہوگا۔

گزارش

قلمکار خواتین و حضرات سے گزارش ھے کہ اپنے مضامین کے ساتھ اپنا ایک مختصر تعارف، بایوڈاٹا (Biodata)، مضمون کے غیرمطبوعہ ھونے کا تصدیق نامہ اور پاسپورٹ سائز کی ایک تصویر ضرور ارسال کریں۔ (ادارہ)

اشتیاق سعید

مدیر 'شاعر' افتخار امام صدیقی سے مکالمہ

1930 میں علامہ سیماب اکبر آبادی نے آگرہ سے ماہنامہ 'شاعر' کا اجرا کیا۔ مُلک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے آپ کے شاگردوں نے ہر خاص و عام سے 'شاعر' کو متعارف کرانے میں اہم رول ادا کیا۔ نتیجتاً کم مدّت ہی میں 'شاعر' کا شمار مُلک کے اہم اور معیاری رسائل میں ہونے لگا۔ مُلک کی آزادی کے بعد غالباً پہلا انڈو پاک مشاعرہ کراچی میں منعقد ہوا، جس میں علامہ سیماب اکبر آبادی نے بھی شرکت کی تھی۔ ابھی وہ کراچی ہی میں قیام پذیر تھے کہ اُن پر فالج کا حملہ ہوا اور وہ وہیں رہ گئے۔ گھر خاندان کی ذمے داری علامہ کے فرزندِ ارجمند اعجاز صدیقی کے ناتواں کندھوں پر آپڑی۔ سال دو سال تو کسی طرح واہی تباہی میں گزارا، جب گزارے کی چادر بجائے پھیلنے کے سُکڑتی گئی تب چارو ناچار اپنے آبائی وطن آگرہ کو خیر باد کہہ کر بمبئی کے لیے رختِ سفر باندہ لیا۔ ان کے قافلے میں اہلیہ کے علاوہ بیٹے تاجدار احتشام، ناظر نعمان، افتخار امام اور ایک بیٹی رانی تھی جو گود میں تھی۔ افتخار امام کی ولادت 19 نومبر 1947 کو آگرہ میں ہوئی تھی۔ اس لحاظ سے اُس وقت وہ محض تین برس کے تھے۔ سامانِ سفر میں کپڑے لتّے اور دوسری ضروری اشیا کے ساتھ ساتھ علامہ سیماب اکبر آبادی کی یادگار کے طور پر 'شاعر' کے چند پرانے شمارے تھے۔

جس طرح جزر کے وقت سمندر ندی نالوں کے پانی کو اپنے اندر شامل نہیں ہونے دیتا، اسی طرح بمبئی نے بھی اعجاز صدیقی اور اُن کے اہلِ خانہ کو قبول نہیں کیا۔ نتیجتاً انھیں بڑی مشقت اور کسمپرسی بھری زندگی گزارنی پڑی۔ اعجاز صدیقی کو اہلِ خانہ کی زندگی کے ساتھ ساتھ 'شاعر' کو بھی زندہ رکھنا تھا۔ جس کے لیے ضرورت تھی لہو کی۔ بہر حال وہ اپنے جسمِ ناتواں سے قطرہ قطرہ لہو نچوڑ کر 'شاعر' کو دینے لگے، ساتھ ہی اُنھیں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس اور مہندر ناتھ جیسے ادیبوں کا اخلاقی تعاون بھی شامل رہا۔ بتدریج ہی سہی 'شاعر' ہاتھ پاؤں نکالنے لگا۔ خیر سے اب اپنی عمر کے 85 ویں پڑاؤ پر ہے۔ اعجاز صدیقی کے بعد اسے اپنا لہو دینے والوں میں تاجدار احتشام اور تادمِ تحریر افتخار امام صدیقی ہیں۔ افتخار امام مدھے پورہ (بہار) سے کل ہند مشاعرہ پڑھنے کے بعد بمبئی لوٹ رہے تھے کہ 11 مارچ 2002 کو کٹنی (مدھیہ پردیش) ریلوے اسٹیشن پر چلتی ٹرین سے گر گئے اور کولہے اور ریڑھ کی ہڈّی مسخ ہو گئی تھی۔ ہسپتال میں کئی ماہ تک مسلسل زندگی اور موت آپس میں متصادم رہے، اخیر میں زندگی نے موت پر فتح پائی۔ حالانکہ افتخار امام صدیقی کے شب و روز گزشتہ 12 برس سے بستر تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ باوجود اس کے پوری توانائی اور دانائی کے ساتھ کام کرتے ہیں، 'شاعر' کے لیے اختراع اور ارتقا کے نئے نئے پہلو تلاشتے ہیں غرض یہ کہ ان کے عزائم اور حوصلے اب بھی بلند ہیں۔ پیشِ خدمت ہے مدیر 'شاعر' سے بات چیت کے چند اقتباس۔ (اشتیاق سعید)

اشتیاق سعید: افتخار بھائی، آپ اُس خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں جس کا اوڑھنا بچھونا ہی شاعری ہے، آپ نے کب اور کیسے شاعری کا آغاز کیا؟

افتخار امام: مجھے بچپن میں محمد رفیع کے فلمی نغمے گانے کا بڑا شوق تھا، نغمے گاتے گاتے میں نے محسوس کیا کہ غزلیں بھی ترنم سے پڑھ سکتا ہوں، لہٰذا اسکول اور دیگر تقریبات میں اپنے دادا کی نعتیں اور غزلیں ترنم سے پڑھنے لگا۔ پھر جوں جوں شعور کی منزلیں طے کرتا گیا، رفتہ رفتہ موضوعاتی نظمیں کہنے لگا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اُن دنوں میں آٹھویں جماعت کا طالبِ علم تھا۔

اس: کیا وہ نظمیں آپ نے کسی کو دکھائی؟

افتخار امام: نہیں... میں چاہتا تھا کہ غزل ہو جائے تو والدِ محترم اعجاز صدیقی کو دکھاؤں۔

اس: تو غزل کب کہی اور پہلا شعر کیا تھا؟

افتخار امام: غزل تو نہیں ہوئی البتہ دو شعر ضرور ہوئے۔ دیکھیے:

یہ زندگی ہے یارب یا موت کی علامت
ہوتا ہے روز پیدا ایک انقلاب تازہ
ہر شب ذہن کی آنکھیں یہ سوچتی ہیں شاید
پردہ کی دل نشینی لائے شراب تازہ

اس: واہ! مکمل غزل کب کہی اور اُس کا مطلع کیا تھا؟

افتخار امام: اُنھی دنوں بمبئی میں دو برادران داؤد بھائی فاضل بھائی ایک شعری مقابلے کا انعقاد کیا کرتے تھے۔ اُس مقابلے میں شامل ہونے کے لیے ایک غزل کہی جس پر پہلی بار والدِ محترم قبلہ اعجاز صدیقی نے اصلاح دی۔ مطلع اور ایک شعر حاضرِ خدمت ہے:

اس میں کوئی شکوہ، نہ شکایت، نہ گلہ ہے
یہ بھی کوئی خط ہے کہ محبت سے بھرا ہے
چہرے میں ہے آئینہ کہ آئینے میں چہرہ
معلوم نہیں، کون کسے دیکھ رہا ہے

اس غزل کو معروف گلوکارہ چترا سنگھ نے گایا ہے۔ اسی سبب ہر کس و ناکس کی زبان پر یہ غزل چڑھی ہوئی ہے۔

اس: تو اُس شعری مقابلے میں اوّل انعام کس کے حصّہ میں آیا تھا؟

افتخار امام: ظاہری بات ہے مجھے ہی ملا تھا البتہ دوسرا انعام ظفر گورکھپوری کے حصّے میں آیا تھا۔ سردار جعفری، مجروح سلطانپوری اور جاں نثار اختر ججوں کے پینل میں تھے۔

اس: یہ تو خوش آئند امر ہے کہ اُس دور کے تین جید شعرا نے آپ کی غزل کو اوّل انعام دے کر اعزاز بخشا۔ جہاں تک میرے علم میں ہے اُس زمانے میں 'شاعر' میں کسی تخلیق کا

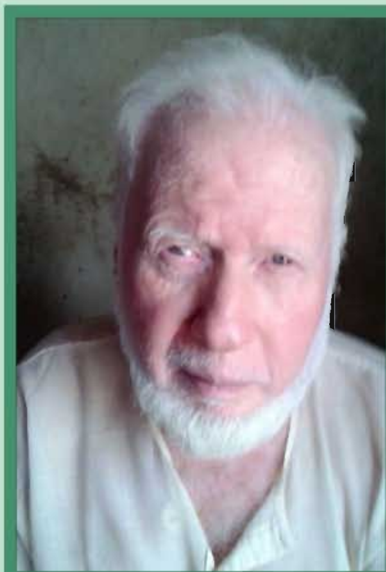

غالباً 1975 میں پہلا مشاعرہ ریاست گجرات کے بڑودہ شہر میں پڑھا تھا۔ جیسا کہ میں نے پہلے ہی عرض کردیا ہے کہ میں طالب علمی کے دوران اسکول میں ہونے والے فنکشن اور دوسری تقریبات میں اپنے دادا جان علامہ سیماب اکبر آبادی کی نعتیں اور غزلیں ترنم سے پڑھا کرتا تھا۔ چنانچہ مجھے مائک اور سامعین کا فوبیا نہیں تھا۔ اس مشاعرے میں میری غزل اور ترنم کو سامعین نے خوب سراہا۔

چھپ جانا بھی تخلیق کار کے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں ہوتا تھا۔ یہ بتایئے کہ "شاعر میں آپ کی پہلی غزل کب شائع ہوئی؟"

افتخار امام: 'شاعر' کا 'ہم عصر اُردو ادب نمبر' 1977 میں منظرِ عام پر آیا تھا۔ اُس میں میری پہلی غزل شائع ہوئی تھی۔ جس کا مطلع حاضر تھا:

وہ نہیں ملتا مجھے، اِس کا گلہ اپنی جگہ
اُس کے میرے درمیاں کا فاصلہ اپنی جگہ

یہ غزل بھی چترا سنگھ نے گائی۔ فلم 'ارتھ' میں اس غزل کو شامل کیا گیا تھا لیکن فلم کی لینتھ بڑھ جانے کی وجہ سے اسے فلم سے نکال دیا گیا۔

اس: فلم 'ارتھ' کے موسیقار تو جگجیت سنگھ تھے، انھوں نے آپ کی کئی غزلیں بھی گائی ہیں، پھر آپ کی غزل کو فلم سے کیوں نکال دیا؟

افتخار امام: جگجیت سنگھ میری شاعری کے بڑے مداح تھے، وہ چاہتے تھے کہ فلم میں میری غزل رہے، لیکن کیفی اعظمی صاحب کی ایما پر غزل کو فلم سے نکالنا پڑا۔

اس: آپ کے خیال میں مشاعرے کی شاعری اور ادبی شاعری میں فرق کیا ہے؟

افتخار امام: مشاعرے کی شاعری سطحی ہوتی ہے، جبکہ ادبی شاعری میں گیرائی اور گہرائی ہوتی ہے جو رسائل اور جرائد میں شائع ہوتی ہے۔

اس: کیا مشاعروں کا معیار پہلے بھی ایسا ہی تھا جیسا کہ اب ہے؟

افتخار امام: نہیں! پہلے مشاعرے خالص ادبی ہوا کرتے تھے۔ اُن میں ادب کے جید شعرائے کرام ہی بلائے جاتے تھے۔ بمبئی سے بالخصوص سردار جعفری، مجروح سلطانپوری، ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی، جاں نثار اختر اور اعجاز صدیقی مشاعروں کی کامیابی کی ضمانت سمجھے جاتے تھے۔ علاوہ ازیں اُس دور کے سامعین بھی شعر فہم ہوا کرتے تھے۔

اس: لیکن اُس دور میں بھی تو 'مشاعرہ باز' شعرا تھے۔ جیسے راز الہ آبادی، شمیم جے پوری، خمار بارہ بنکوی اور فنا نظامی کانپوری۔

افتخار امام: ہاں! یہ مشاعرہ باز ضرور کہلاتے تھے، وجہ یہ تھی کہ انھوں نے اپنے آپ کو مشاعروں تک ہی محدود کر رکھا تھا لیکن بنیادی طور پر یہ سبھی شاعر تھے۔ انھوں نے کبھی سطحی شاعری نہیں کی۔

اس: اب جب بات مشاعروں کی چل نکلی ہے تو لگے ہاتھ آپ یہ بھی بتا دیجیے کہ آپ نے پہلا مشاعرہ کب اور کہاں پڑھا نیز مشاعرہ پڑھتے وقت آپ کی کیفیت کیا تھی؟

افتخار امام: غالباً 1975 میں پہلا مشاعرہ ریاست گجرات کے بڑودہ شہر میں پڑھا تھا۔ جیسا کہ میں نے پہلے ہی عرض کردیا ہے کہ میں طالبِ علمی کے دوران اسکول میں ہونے والے فنکشن اور دوسری تقریبات میں اپنے دادا جان علامہ سیماب اکبر آبادی کی نعتیں اور غزلیں ترنم سے پڑھا کرتا تھا۔ چنانچہ مجھے مائک اور سامعین کا فوبیا نہیں تھا۔ اس مشاعرے میں میری غزل اور ترنم کو سامعین نے خوب سراہا۔

اس: 'شاعر' کی ادارت کی آپ نے ذمے داری کب سنبھالی؟

افتخار امام: والد محترم اعجاز صدیقی کی رحلت کے بعد 1978 میں گھر کے اور 'شاعر' کے اخراجات پورا کرنے کی غرض سے بڑے بھائی تاجدار احتشام برائے ملازمت سعودی عرب چلے گئے، لہٰذا شاعر کی ادارت کی ذمے داری مجھ ناتواں کے کندھوں پر آن پڑی۔

اس: لیکن آپ اُس زمانے میں فلم انڈسٹری میں اسٹرگل کر رہے تھے؟ تو آپ 'شاعر' اور اپنے فلمی اسٹرگل کو کیسے Manage کرتے تھے؟

افتخار امام : اُن دنوں میں پروڈیوسر ڈائریکٹر سورج پرکاش کے لیے جنھوں نے فلم 'آمنے سامنے' بنائی تھی۔ ایک سسپنس فلم کی اسکرپٹ لکھ رہا تھا، جسے وہ ششی کپور اور شرمیلا ٹیگور کو لے کر بنا رہے تھے جبکہ موسیقی کلیان جی آنند جی کی تھی۔ افسوس کہ فلم کے ابتدائی مراحل میں ہی سورج پرکاش کا انتقال ہوگیا۔ اس سانحہ سے میں بھی بے طرح متاثر ہوا پھر فلموں سے کنارہ کشی اختیار کرلی اور اپنی تمام تر توجہ 'شاعر' پر مرکوز کردی۔

اس: ادبی دنیا میں 'شاعر' کی جو دھوم پہلے تھی، اب غالباً نہیں رہی، کیوں؟

افتخار امام : اس کی سب سے بڑی وجہ میرا اپاہج پن ہے۔ میری دنیا اس 200 مربع فٹ کے کمرہ میں سمٹ کر رہ گئی ہے اور باہر کی دنیا سے یکسر کٹ کر رہ گیا ہوں۔ اس لیے لوگوں کی ترجیحات کیا ہیں، ان سے انجان ہوں۔ دوسری وجہ آج ادب میں گروپ ازم کا زور ہے۔ میں نے کبھی کسی گروپ کو قبول نہیں کیا اور نہ ہی کسی بڑی شخصیت کو اپنے رسالے کا سرپرست بنایا، میں آزادانہ طور پر کام کرنے پر یقین رکھتا ہوں اور شاعر میں کچھ نہ کچھ نیا کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔

اس: گزشتہ چند برسوں سے ادبی دنیا میں یہ بات گشت کر رہی ہے کہ 'شاعر' کا معیار جو گزشتہ صدی میں تھا وہ نئی صدی میں نہیں رہا؟

افتخار امام : یہ بات اس لیے ہو رہی ہے کہ 'شاعر' 85 برس سے اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ جاری و ساری ہے، اور ماہ بہ ماہ پابندی سے بازار میں پہنچ جاتا ہے۔ حالانکہ 'آجکل' اور ایوانِ اُردو کے علاوہ سرکاری اور اُردو اکادمیوں کے رسائل بھی تمام وسائل کے باوجود پابندی سے شائع نہیں ہوتے۔ رہی معیار کی بات تو کسی رسالے کا معیار ایک جیسا کبھی نہیں رہ سکتا۔ شمس الرحمن فاروقی کے 'شب خون' کو ہی لے لیجیے، پہلے اُس میں کٹر جدیدیوں کی مہمل شاعری اور لایعنی افسانے شائع ہوا کرتے تھے۔ یہی شب خون کا معیار تھا، لیکن بعد میں فاروقی صاحب کو اپنے اس معیار سے سمجھوتا کر کے تخلیقی بیانیہ کی طرف لوٹنا پڑا۔ پھر تو شب خون میں وہ شعرا اور افسانہ نگار بھی شائع ہونے لگے جنھیں فاروقی صاحب دیکھنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔

اس: آپ نے شاعر میں پیڈ گوشوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع کیا، جسے لوگ اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے اور اس کام کو ادبی بدعت سے تعبیر کرتے ہیں؟

افتخار امام : حاسدین اور منافقین کی نگاہیں کسی زمانے میں اچھی نہیں رہی ہیں۔ اگر ہم گوشہ شائع کرنے کے عوض اُس پر آنے والا صرفہ طلب کرتے ہیں تو یہ ادبی بدعت کیسے ہوئی؟ فی زمانہ ہر کس و ناکس اپنی شہرت چاہتا ہے، شہرت کے لیے تشہیر ضروری ہے۔ اب تشہیر کے لیے روپیہ تو خرچ کرنا ہی ہوگا۔ ہم اتنے بڑے دھنّہ سیٹھ تو ہیں نہیں کہ اپنا روپیہ، اپنا وقت، اپنی محنت لگا کر آپ کی تشہیر کریں۔ پھر یہ گوشہ شائع کرانے والے لوگ بھی تو دوسری دنیا کے مخلوق نہیں ہیں، یہ بھی تو ادب ہی کے لوگ ہیں، جب یہ لوگ اپنا روپیہ لگا کر اپنی تخلیقات کو قارئین کے سامنے لا رہے ہیں تو لوگوں کو کیا پریشانی ہے۔ جبکہ ساری اُردو دنیا جانتی ہے کہ میں مشاعروں کے توسط سے اپنا اور شاعر کے اخراجات پورے کیا کرتا تھا، لیکن ٹرین کے حادثے نے اس سلسلے کو موقوف کردیا۔ گھریلو اور شاعر کے اخراجات کے علاوہ میرے علاج پر آنے والا صرفے کی بھرپائی کے لیے مجھے پیڈ گوشے کو آمدنی کا ذریعہ بنانا پڑا، ویسے ہم نے اعزازی گوشے بھی شائع کیے ہیں۔ جیسے اُردو ادب کی تپائی، سلام بن رزاق، انور قمر اور انور خان'؛ 'قرۃ العین حیدر کا گوشہ' اور 'ایک شمارہ 1980 کے نام'۔ ہم نے اس شمارہ میں سال 1980 کو مکمل طور پر مختلف ابواب میں پیش کیا تھا۔ مثلاً 'اُردو خبرنامہ، مرحومین کی صدی، وفیات، علاوہ ازیں 500 رسائل اور کتب پر تبصرے شامل کیے تھے۔

اس: افتخار بھائی واقعی، آپ حادثے کے بعد سے اب تک مسلسل بستر پر ہیں، جبکہ حادثے سے پہلے مسلسل سفر میں رہتے تھے۔ آپ کا بیگ ہمیشہ تیار رہتا تھا اور تین چار پیشگی ریزرویشن ٹکٹیں جیب میں ہوا کرتی تھیں۔ اب آپ باہر کی دنیا سے کٹ گئے ہیں تو کیسا محسوس کرتے ہیں یا اس تعلق سے کیا سوچتے ہیں؟

افتخار امام : میں بستر پر پڑے پڑے اللہ تعالیٰ کو محسوس کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اللہ جو بھی کرتا ہے اپنے بندے کی بھلائی کے لیے ہی کرتا ہے، ممکن ہے میرے اس حادثے میں بھی میری کوئی بھلائی مضمر ہو، کبھی کبھی یہ بھی سوچتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے میری زندگی جتنی رکھی ہے اور اس زندگی کے دوران میرے قدموں کے لیے جس قدر سفر لکھے ہیں وہ میں نے شاید وقت سے پہلے ہی مکمل کرلیے۔ البتہ میں اپاہج ضرور ہوگیا ہوں لیکن میرے قویٰ مضمحل نہیں ہوئے بلکہ دماغی خلیے پہلے کی بہ نسبت زیادہ تیز ہوگئے ہیں۔ تخلیقی صلاحیتیں بڑھ گئی ہیں، نئے نئے خیالات ذہن میں کوندتے رہتے ہیں۔

اس: افتخار بھائی بتائیں آپ کا اپنے اور 'شاعر' کے تعلق سے آگے کا لائحہ عمل کیا ہوگا؟

افتخار امام : اپنے تعلق سے میں یہ دعا کرتا ہوں کہ میں جلد از جلد اچھا ہوجاؤں اور ہندو پاک کے علاوہ عالمی مشاعروں میں شرکت کروں۔ رہا 'شاعر' تو اس کے لیے شاعر ادبی ٹرسٹ کا قیام عمل میں لانا چاہتا ہوں جس میں اعجاز صدیقی گھرانے کے لوگ شامل رہیں گے۔

میں بستر پر پڑے پڑے اللہ تعالیٰ کو محسوس کرتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ اللہ جو بھی کرتا ہے اپنے بندے کی بھلائی کے لیے ہی کرتا ہے، ممکن ہے میرے اس حادثے میں بھی میری کوئی بھلائی مضمر ہو، کبھی کبھی یہ بھی سوچتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے میری زندگی جتنی رکھی ہے اور اس زندگی کے دوران میرے قدموں کے لیے جس قدر سفر لکھے ہیں وہ میں نے شاید وقت سے پہلے ہی مکمل کرلیے۔ البتہ میں اپاہج ضرور ہوگیا ہوں لیکن میرے قویٰ مضمحل نہیں ہوئے بلکہ دماغی خلیے پہلے کی بہ نسبت زیادہ تیز ہوگئے ہیں۔

Ishtiyaque Saeed, Abdullah Mansion, Room No.: 44, Haryana Wala Lane, Kurla (w), Mumbai - 400 07
E-mail: ishtiyaquesaeed@rediffmail.com
Iftekhar Imam Siddiqui
202/228,Dinath Building, 3rd Floor, Room No. 12, P.B. Marg, Mumbai - 400 004

دردانہ قاسمی

اردو ادب میں خواتین کا حصہ

دنیا کی دوسری ادبیات کی طرح اردو ادب میں بھی خواتین کی آمد نسبتاً بہت بعد کے زمانے سے شروع ہوئی۔ دوسری تہذیبوں کی طرح ہی ہماری تہذیب بھی ایک معنی میں پدرانہ تہذیب تھی جس میں مردوں کا تسلط نہ صرف یہ کہ زندگی کے عام معاملات میں جاری وساری تھا، بلکہ زبان بندی کی اگر کوئی شرط ہوسکتی ہے تو وہ عورتوں کے لیے صادق آتی تھی۔ شعروادب میں اپنے اظہار کے لیے لکھنے لکھانے کا عمل تو بہت دور کی بات ہے جب ہمارے معاشرے میں حرف شناسی بھی گزشتہ دو تین صدیوں سے عام ہوئی اور مردوں نے مذہبی چیزوں کے پڑھنے اور یاد کرنے کا سلسلہ تو کافی پہلے شروع کر دیا تھا مگر عورتوں میں یہ رجحان بھی خاصا بعد میں شروع ہوا۔ حد یہ ہے کہ انیسویں صدی کے اواخر میں جب سرسید احمد خاں نے زندگی کی ہر سطح پر روشن خیالی اور تعلیم حاصل کرنے کی تحریک چلائی تو اس میں بھی یہ فرض کرلیا گیا کہ جب مرد تعلیم یافتہ ہوجائیں گے تو وقت کے ساتھ ساتھ اپنے آپ علم کی طرف عورتوں کو راغب کرلیں گے۔ مگر سرسید تحریک کے آغاز کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ان کی ہی درس گاہ کے ایک عظیم سپوت شیخ محمد عبداللہ نے اس تحریک کو عورتوں کی تعلیم تعلّم سے جوڑ دیا۔ شیخ عبداللہ نے اپنی آپ بیتی میں تفصیل سے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ شمالی ہند میں عورتوں کی تعلیم عام کرنے میں ان کو کن کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔

شیخ محمد عبداللہ یوں تو کشمیر سے تعلق رکھتے تھے مگر تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے علی گڑھ جا کر انھوں نے اپنی زندگی عورتوں کی خواندگی کے لیے وقف کردی اور بیسویں صدی کے بالکل ابتدائی برسوں میں لڑکیوں کا ایک اسکول قائم کیا جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایک بڑے اور ہمہ جہت کالج کی شکل میں پروان چڑھ گیا۔ شیخ صاحب نے اس سلسلے میں اپنی بیگم کا تعاون حاصل کیا اور دونوں نے مل کر اس تحریک کو نقطۂ عروج پر پہنچانے کی کوشش کی۔ اسی انداز میں لکھنؤ کے مولوی کرامت حسین نے لکھنؤ میں بچیوں کی تعلیم کا سلسلہ اس کے کچھ ہی عرصے کے بعد شروع کر دیا تھا جو بعد کے زمانے میں کرامت حسین ڈگری کالج کی شکل میں پھولا اور پھلا۔ لکھنؤ اور علی گڑھ کی طرح ہندوستان کے دوسرے علمی مراکز مثلاً حیدرآباد، لاہور، بمبئی وغیرہ میں بھی اس طرح کی تحریکیں وقت کے ساتھ ساتھ سامنے آئیں اور خواتین کی تعلیمی بیداری ایک معنی میں ہمہ جہت تحریک بن گئی۔ تاہم یہ باتیں تو تعلیمی تحریک کی ہیں، انفرادی طور پر ہندوستان کے مختلف علاقوں اور شہروں میں ایسے تعلیم یافتہ خاندان شروع سے ہی موجود رہے ہیں جن میں خواتین نے اپنے پڑھنے اور پڑھانے کا سلسلہ جاری رکھا اور پہلے مذہبی تعلیم اور اس کے بعد عام دلچسپی کی چیزوں کا مطالعہ عام ہوا۔ ان میں بہت سی حوصلہ مند خواتین ایسی بھی تھیں جن کو شعروادب کی کتابوں اور ادبی رسائل وجرائد کے مطالعے کا بھی موقع ملا۔ یہ وہ اہم موڑ تھا جب ہندوستان کی متعدد خواتین نے کہیں شعروادب کی سطح پر، کہیں قصہ کہانیوں کی صورت میں اور کہیں عام سماجی اصلاحات اور مذہبی موضوعات اور معلومات کی شکل میں کچھ نہ کچھ لکھنے لکھانے کا سلسلہ شروع کر دیا۔

ادب کی مختلف اصناف میں جیسا کہ عرض کیا گیا خواتین کی شمولیت بہت بعد کے عرصے میں ہوئی، مگر شاعری کے میدان میں خواتین شاعرات کی تخلیقات ہمیں انیسویں صدی کے وسط سے ہی ملنا شروع ہوجاتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی کا زمانہ اردو کی شعری سرگرمیوں کے نقطۂ عروج کا زمانہ تھا۔ اس لیے ایسا ممکن نہ تھا کہ حرف شناس خواتین شعری اظہار سے لاتعلق رہتیں۔ مغلوں کے آخری زمانے میں بسم اللہ بیگم کے نام سے ایک شاعرہ تھیں جن کا کلام مختصر سہی مگر مل ضرور جاتا ہے۔ وہ مظہر جان جاناں اور انعام اللہ خاں یقین کی شاگرد بھی تھیں۔ اسی زمانے کی ایک اور شاعرہ کا کلام ملتا ہے جن کا نام کاملہ بیگم جعفری تھا، مگر 1857 کے آس پاس حیات النساء صبا بیگم نے اچھی خاصی شہرت حاصل کرلی تھی۔ ان کے علاوہ نواب اختر محل اختر کو بھی ایک اچھی شاعرہ کے طور پر جانا جاتا تھا۔ انیسویں صدی کے اواخر میں ایک شاعرہ جو نسلاً کشمیری تھیں مگر بمبئی میں مقیم تھیں، ان کے گرد بعض باذوق خواتین شاعرات کی چہل پہل رہا کرتی تھی۔ ان کے علاوہ بادشاہ بیگم مفتی نے بھی شاعری میں کافی شہرت حاصل کی جب کہ بہادر شاہ ظفر کے زمانے میں امراؤ نام کی شاعرہ بھی خاصی جانی جاتی تھی۔ یہ امراؤ، مرزا رسوا کی امراؤ جان ادا سے پہلے معروف ہوچکی تھیں۔

اس سلسلے کی ایک اہم بات یہ ہے کہ پرانی تہذیب میں طوائف خانوں کو رقص ونغمہ کا مرکز تصور کیا جاتا تھا اور بہت سے شرفا بھی اپنے بچوں کو وہاں تہذیب سیکھنے کے لیے بھیجا کرتے تھے۔ اس لیے بہت سی طوائفوں کے اندر شاعری کا ملکہ ہونا بھی فطری تھا، چنانچہ بعض شاعرات پیشہ کے اعتبار سے شاعری کو موسیقی کے ساتھ گاتی تھیں۔ ان میں سے بعض باذوق طوائفیں خود اپنا کلام بھی گا کر سناتی تھیں۔ ایسی شاعرات میں کلکتہ کی محمد جان شباب، شرم اور ملکہ جان ملکہ بڑی مشہور ہوئیں۔ لکھنؤ کی اس نوع کی شاعرات میں مشتری بیگم اور فرح بخش فرح کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ یہ وہی زمانہ تھا جب امراؤ جان ادا نام کی طوائف کو کچھ تو شاعری اور عقل ودانش کی وجہ سے اور زیادہ تر مرزا رسوا کے ناول کی وجہ سے غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی۔ یہ اس ناول کا ہی کمال تھا کہ ان کا ایک شعر زبان زد خاص وعام ہوگیا:

کس کو سنائیں حالِ دلِ زار اے ادا
آوارگی میں ہم نے زمانے کی سیر کی

امراؤ جان ادا کے علاوہ بیسویں صدی کے شروع میں رابعہ بریلوی پنہاں، خورشید آرا بیگم خورشید، سلمٰی حیدرآبادی اور غزالہ

بریلوی نے بھی اردو شاعری کی تاریخ میں اپنے نشانات قائم کیے۔ تاہم اس طرح کی شاعرات میں جس شاعرہ کو وقت کے ساتھ ساتھ زیادہ مقام و مرتبہ ملا وہ 'فرح بخش' تھیں جنھوں نے بعض رسائل میں بھی اپنا کلام چھپوایا۔

جہاں تک بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی کا سوال ہے تو اس زمانے میں ترقی پسند تحریک کے اثر سے شاعری کا ذوق مردوں کے ساتھ عورتوں میں بھی عام ہوا اور مردوں کے شانہ بہ شانہ انھوں نے ترقی پسند تحریک یا بعد کی شاعرات میں جدیدیت وغیرہ کی نمائندگی کرنے کی کوشش کی۔ پاکستان کی ادا جعفری کو ایک مستند شاعرہ کی حیثیت حاصل ہوئی جب کہ حیدرآباد کی شفیق فاطمہ شعریٰ نے دانش ورانہ موضوعات اور مذہبی شعور کے ساتھ اپنی اہمیت منوائی۔ ان کے بعد جو شاعرات اردو میں ہمارے سامنے آئیں، انھوں نے مردوں کے لب و لہجے میں شاعری کم کی اور عورتوں کی حیثیت، ان کے مسائل یا صنفی اور جنسی اختلاف کے مسائل کو نمایاں کر کے پیش کرنے کی کوشش زیادہ کی۔ ان میں فہمیدہ ریاض، کشور ناہید، پروین شاکر، سارہ شگفتہ اور ترنم ریاض کو امتیازی حیثیت رہی۔ ان شاعرات کے معاصرین میں ہر چند کہ ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، بلقیس ظفیر الحسن اور زہرہ نگاہ نے بھی بہت اعلیٰ درجے کی شاعری کی مگر ان کی شاعری میں تانیث کے نشانات برائے نام ہی تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ اسی زمانے میں کنیڈا کی پروین شیر کے علاوہ شاہین مفتی، صادقہ نواب سحر، ریحانہ عاطف اور پاکستانی شاعرہ حمیرا رحمان اور فاطمہ حسن کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ جدید لب و لہجے کی شاعرات میں جن شاعرات کو بہت اہمیت حاصل ہے ان میں شہناز نبی، شاہین مفتی، شبنم عشائی، گلنار آفرین اور نسرین نقاش نے اپنے گہرے نقوش مرتسم کیے ہیں۔ اس پس منظر میں کہا جاسکتا ہے کہ دوسری اصناف ادب کے مقابلے میں شاعری کا میدان گزشتہ دو صدیوں سے خاتون شاعرات کی ہماہمی سے آباد رہا ہے اور روایتی شاعری سے لے کر تانیثیت ترقی پسندی اور جدیدیت جیسے تمام رجحانات کی نمائندگی کرنے والی شاعرات آج کے ادبی منظر نامے پر نمایاں انداز میں اپنی موجودگی کا احساس دلاتی رہتی ہیں۔

ان معروضات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جس طرح شاعری کی صنف میں مرد شاعروں کا غلغلہ بلند رہا، اسی طرح ادب کی دوسری اصناف کے مقابلے میں شاعری کی صنف خصوصیت کے ساتھ خواتین شاعرات کی دلچسپی کا مرکز بنی رہی۔ مگر چوں کہ اردو ادب کا پورا منظر نامہ صرف نظموں اور غزلوں سے مکمل نہیں ہوتا بلکہ فکشن کے میدان میں بھی عرصے سے خواتین اپنی موجودگی کا احساس دلاتی رہتی ہیں، اس لیے مناسب نہ ہوگا کہ اس ضمن میں خواتین ناول نگاروں اور افسانہ نگاروں کی کارکردگی کو اہمیت نہ دی جائے۔ ادبی رسائل کے صفحات میں جس کثرت سے افسانے شائع ہوتے رہتے ہیں، اس میں ایک بڑا حصہ خواتین کی تخلیقات کا بھی ہوتا ہے۔ بلکہ بسا اوقات تو خواتین کی تعداد افسانہ نگاری کے منظر نامے میں زیادہ بڑھی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ افسانہ نگاری کا سلسلہ چوں کہ بیسویں صدی کے اوائل سے شروع ہوا تھا اور اردو شاعری کی طرح اس کی تاریخ زیادہ قدیم نہیں ہے اس لیے اس زمانے میں پریم چند، سجاد حیدر یلدرم اور راشد الخیری کے ابتدائی افسانے سامنے آئے۔ اس کے کچھ ہی عرصے کے بعد نذر سجاد حیدر کے افسانے سامنے آنا شروع ہو گئے تھے۔ بنت نذر الباقر، جو شادی سے پہلے اپنے اصلی نام سے افسانے لکھتی تھیں وہی خاتون سجاد حیدر یلدرم سے شادی کے بعد نذر سجاد حیدر کے نام سے مشہور ہوئیں۔ شادی سے پہلے بھی ان کی کہانیاں اور اصلاحی تحریریں بیسویں صدی کے اوائل کے

ادبی رسائل کے صفحات میں جس کثرت سے افسانے شائع ہوتے رہتے ہیں، اس میں ایک بڑا حصہ خواتین کی تخلیقات کا بھی ہوتاہے۔ بلکہ بسااوقات تو خواتین کی تعداد افسانہ نگاری کے منظرنامے میں زیادہ بڑھی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ افسانہ نگاری کا سلسلہ چوں‌کہ بیسویں صدی کے اوائل سے شروع ہوا تھااور اردو شاعری کی طرح اس کی تاریخ زیادہ قدیم نہیں ہے

رسائل میں چھپنا شروع ہو گئی تھیں۔ ان کی کہانیوں میں اصلاح کا رنگ غالب تھا مگر اس کے ساتھ ہی ان کے ہاں روشن خیالی کا انداز بھی شامل تھا۔ نذر سجاد کے بعد رومانی نثر کے زمانے میں حجاب امتیاز علی کے افسانوں سے ہمارا واسطہ پڑتا ہے جن کی تحریروں میں منظر نگاری اور فضا آفرینی بہت نمایاں تھی۔

ترقی پسند تحریک یوں تو 1936 سے شروع ہوئی۔ مگر ایک نوع کا انقلابی اور انحرافی انداز رشید جہاں کے یہاں اس سے تین چار سال پہلے شروع ہو گیا تھا۔ چنانچہ رشید جہاں کے ساتھ صاحب زادہ محمود ظفر، سجاد ظہیر اور احمد علی کے بعض باغیانہ افسانے ترقی پسند تحریک سے پہلے ہی ''انگارے'' میں شائع ہو چکے تھے، مگر معاشرے میں اشرافیہ طبقے کے غلبے کی وجہ سے رشید جہاں کی ان باغیانہ کہانیوں کو زیادہ پذیرائی نہیں مل سکی۔ ان کے بعد کے زمانے میں عصمت چغتائی، رضیہ سجاد ظہیر، واجدہ تبسم وغیرہ کو اردو افسانے کی دنیا میں آنے کا موقع ملا۔ ان سب میں عصمت چغتائی نے جو فکری اور فنی کارنامے انجام دیے، ان سے ہر شخص واقف ہے۔ لیکن ممتاز شیریں اپنا ایک الگ مقام رکھتی ہیں جو ایک بالغ نظر نقاد بھی تھیں اور ایک بہترین افسانہ نگار بھی۔ جہاں تک قرۃ العین حیدر کا سوال ہے تو انھوں نے افسانوں کو عالمی ادب کی سطح پر پہنچانے کا کارنامہ انجام دیا اور قصہ گوئی کے فن کے ساتھ انصاف کرتے ہوئے اپنے افسانوں اور ناولوں کو دانش ورانہ بلندی بھی عطا کی۔ تقسیم ہند کے بعد کی افسانہ نگاروں میں ذکیہ مشہدی، بشریٰ رحمان، زاہدہ حنا، خدیجہ مستور اور ہاجرہ مسرور کو بے حد اہمیت حاصل ہوئی۔ جب کہ جدید تر نسل کی افسانہ نگاروں میں نگار عظیم، ترنم ریاض، غزال ضیغم، نعیمہ ضیاء الدین اور قمر جمالی کا نام لیا جاسکتا ہے۔

افسانہ نگاری ہی کی طرح اردو ناول کی تاریخ میں خواتین کی خدمات غیر معمولی ہیں۔ ممتاز ترین ناول نگاروں میں قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی، جمیلہ ہاشمی، خدیجہ مستور، بانو قدسیہ اور رضیہ سجاد ظہیر کو اہم خواتین ناول نگار کی حیثیت حاصل ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ یہ تمام ناول نگار خواتین، ناول کے ساتھ افسانہ نگاری میں بھی اپنی اپنی اہمیت منوا چکی ہیں۔ قرۃ العین حیدر کے ناول 'آگ کا دریا'، عصمت چغتائی کے ناول 'ٹیڑھی لکیر'، جمیلہ ہاشمی کے ناول 'دشت سوس' اور بانو قدسیہ کے ناول 'راجہ گدھ' کو عورتوں کے ناولوں میں ہی نہیں بلکہ اردو کے ممتاز ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے اور ناول کے میدان میں ان ناولوں کی وجہ سے مردوں کے مقابلے میں عورتوں کا مرتبہ کچھ زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔

فکشن کے علاوہ خودنوشت، سفرنامے اور رپورتاژ میں یوں تو اَن گنت خواتین نے قسمت آزمائی کی مگر خواتین کی زیادہ تر دلچسپی خودنوشت سوانح میں رہی۔ اس ضمن میں کشور ناہید، حمیدہ سالم، قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی وغیرہ کو غیر معمولی شہرت ہوئی۔ قرۃ العین حیدر کی 'کار جہاں دراز ہے'، کشور ناہید کی 'خودنوشت، بری عورت کی کتھا'، حمیدہ سالم کی 'خودنوشت شورشِ دوراں' اور اسی طرح کی بعض اور آپ بیتیوں مثلاً 'ڈگر سے ہٹ کر'، 'کاغذی پیرہن' اور 'جنت سے نکالی گئی حوا' جیسی کتابوں کو آسانی سے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

ان معروضات کے بعد یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ آج اردو کے ادبی منظر نامے پر خواتین ادیبوں کی کارکردگی بہت نمایاں ہے اور صحیح معنوں میں خواتین آج اردو شعر و ادب کے نصف بہتر ہونے کا ثبوت فراہم کر رہی ہیں۔

■

Prof. Durdana Qasmi, Dept of Urdu, Womens College, Aligarh Muslim University, Aligarh - 202002 (UP)

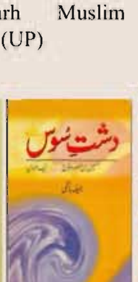

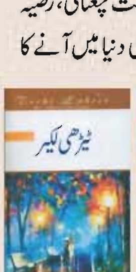

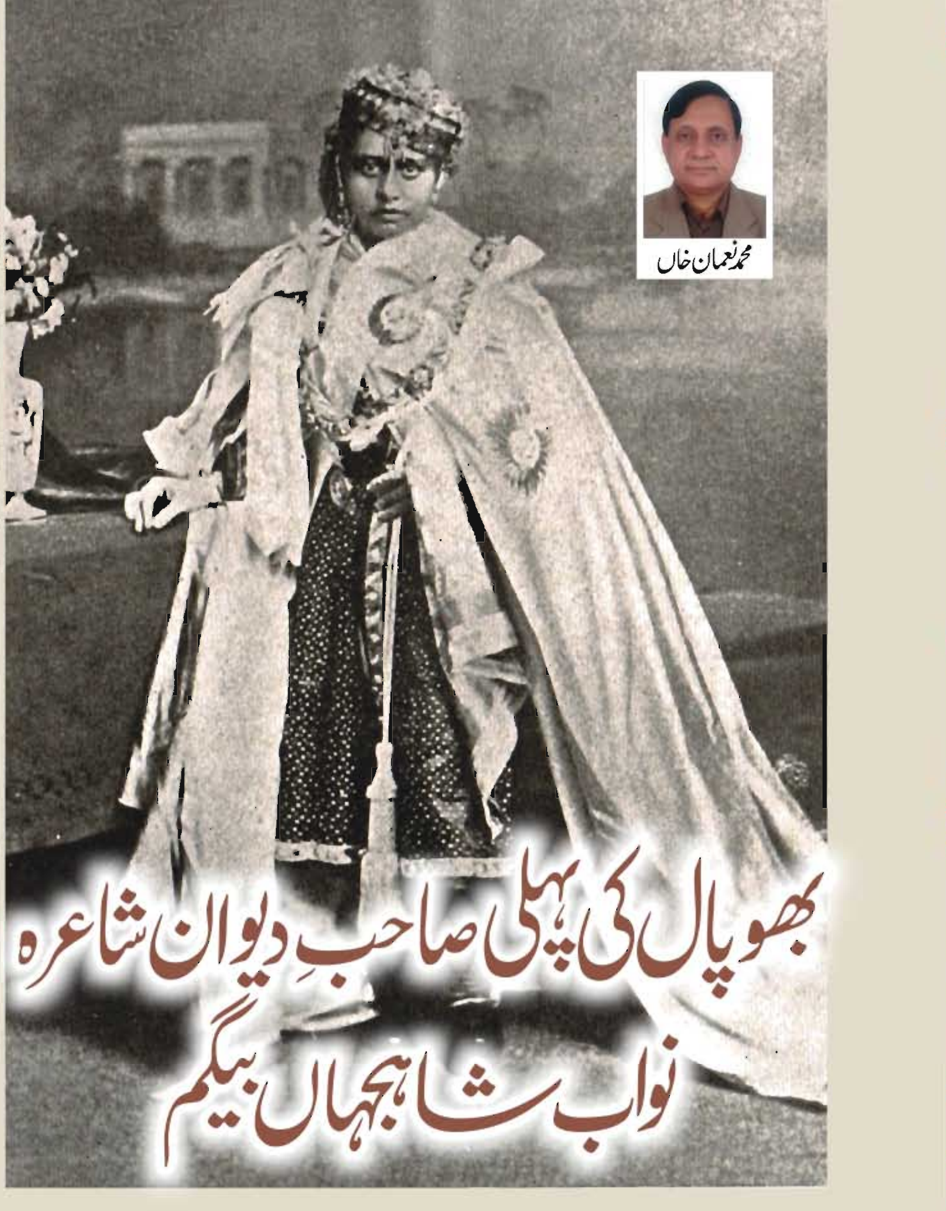

بھوپال کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ نواب شاہجہاں بیگم

محمد نعمان خاں

نواب شاہجہاں بیگم، المتخلص بہ تاجور وشیریں، روپ رتن 'GCSI'، کراؤن آن انڈیا، اسٹار آف انڈیا، فرمانروائے ریاست بھوپال 6 جمادی الاوّل 1252 ہجری مطابق 30 جولائی 1838 کو بھوپال کے نزدیک واقع 'شاہی محل' اسلام نگر میں پیدا ہوئی تھیں۔ اُن کی تعلیم اور شاہانہ تربیت میں ان کی والدہ محترمہ نواب سکندر جہاں بیگم اوران کے عہد کے معروف و مستند اساتذہ مولوی حسیب احمد، حاجی عبدالکریم انصاری، مولوی حیدر علی خاں، منشی رضا حسین اور دیوان ٹھاکر پرشاد نے کلیدی کردار ادا کر کے انھیں امورِ خانہ داری، فنِ سپہ گری اور جملہ مروّجہ علوم وفنون سے آراستہ کرکے صغرسنی ہی میں ماہر و کامل بنا دیا تھا۔

نواب شاہجہاں بیگم کی شخصیت، حلیے، مزاج و ماحول اور مشاغل سے متعلق اُن کی صاحبزادی نواب سلطان جہاں بیگم نے لکھا ہے:

''سرکارِ عالیہ کا قد پستہ اور بدن دُہرا تھا۔ آواز نہایت رعب دار تھی لیکن طرزِ گفتگو دل نشین تھا...... طرزِ معاشرت بالکل ہندوستان کی بیگمات کی طرح تھی۔ طبیعت سادگی پسند واقع ہوئی تھی...... زنانہ دست کاری اور ہنر سے خاص رغبت تھی۔ حافظہ قوی، ذہن تیز اور طبیعت میں شوق تھا...... نظم سے بہت شوق تھا جو ورثۂ پدری تھا...... غذا سادہ تھی...... مذہبی امور وفرائض کی نہایت سختی سے پابند تھیں۔ نماز کبھی قضا نہ ہوتی تھی...... روزہ ہائے ماہِ صیام برابر رکھتی تھیں۔ رمضان میں معمولاً تلاوتِ کلام مجید کرتی تھیں۔ دل پر خدا کا خوف بے انتہا غالب تھا۔ حشر ونشر اور وعید کے بیانات پر آنکھوں سے آنسو رواں ہوجاتے تھے۔ زمانۂ علالت میں اُن کو جب مایوسی ہوگئی تو محض مواخذۂ اُخروی کے خیال سے ایک عام اعلان شائع کیا جس کا مضمون حسب ذیل تھا:

''ہمارے 33 سالہ دورِ حکومت میں کسی شخص کو عمداً یا سہواً کوئی ضرر ہماری طرف سے پہنچا ہو تو بوجہ اللہ معاف کرے۔''

(بحوالہ: حیاتِ شاہجہانی)

نواب شاہجہاں بیگم ابھی آٹھ سال کی ہی تھیں کہ اُن کے والد نواب جہانگیر محمد خاں دولہ کی جواں مرگی کے سبب وہ سایۂ شفقتِ پدری سے محروم ہوگئیں۔ گورنر جنرل بہادر کے خریطے 28 دسمبر 1844 کے تحت شاہجہاں بیگم کی مسند نشینی کا اعلان ہوا اور صغر سنی کے سبب پہلے فوج دار محمد خاں اور پھر اُن کی والدہ سکندر جہاں بیگم کو مختارِ ریاست اور شاہجہاں بیگم کو ولی عہدِ ریاست مقرر کیا گیا۔

4 ذی قعدہ 1271 ہجری کو ان کی منگنی کی رسم باقی محمد خاں نصرت جنگ بخشی اور سپہ سالار ریاست بھوپال کے ساتھ انجام پذیر ہوئی۔ شاہجہاں بیگم کے ہونے والے شوہر باقی محمد خاں کو 'نواب نظیر الدولہ امراؤ دولہا' کا خطاب عطا کیا گیا۔ 11 ذی قعدہ کو ان کا عقد ہوا۔ شاہجہاں بیگم کے بطن سے دو صاحبزادیاں سلطان جہاں بیگم اور سلیمان جہاں بیگم تولد ہوئیں۔ آخرالذکر نے پانچ سال بعد مرضِ چیچک میں مبتلا ہوکر انتقال کیا۔

شاہجہاں بیگم کی والدہ نواب سکندر جہاں بیگم 9 سال تک ریاست بھوپال کی فرمانروا رہیں۔ 13 رجب 1285 ہجری کو ان کا انتقال ہوجانے کے سبب 17 رجب 1285 مطابق یکم مئی 1860 کو شاہجہاں بیگم، ریاست بھوپال کی فرمانروا مقرر ہوئیں۔

نواب شاہجہاں بیگم نے زندگی کی 29 بہاریں ہی مکمل کی تھیں کہ وہ بیوہ ہوگئیں۔ تین سال تک بیوگی کے عالم میں وہ ریاست بھوپال کے نظم ونسق اور اس کی اصلاح وترقی کے کاموں میں ہمہ تن مصروف رہیں۔ حضرت پیر ابو احمد صاحب کی ہدایت، انگریز پولیٹکل ایجنٹ اور خاندانی نیز درباری بہی خواہوں کے مشورے اور اصرار سے انھوں نے معروف عالم، ادیب، شاعر اور دانشور مولوی سید صدیق حسن خاں توفیق میر منشی روبکار خاص اور میر دبیر دخانی ریاست بھوپال سے 8 مئی 1871 کو عقدِ ثانی کرلیا۔ صدیق حسن خاں کو دربارِ عام میں شاہی خلعت اور جاگیر عطا کرکے انھیں 'معتمد المہام' کے خطاب سے سرفراز کیا گیا اور نواب شاہجہاں بیگم کی کوشش اور سفارش سے انگریز حکومت نے صدیق حسن خاں کو 'نواب والا جاہ امیر الملک' کا خطاب عطا کیا اور ان کے نام پچھتر ہزار چار سو بہتر روپے دس آنے کی جاگیر مقرر کی گئی۔ ریاست بھوپال کے جملہ امور میں نواب صدیق حسن خاں نواب شاہجہاں بیگم کے شریکِ کار اور معاون رہے۔

مذکورہ بالا ذی علم اور تجربے کار شخصیات کی مدبرانہ کوششوں کے سبب ریاست بھوپال کو نہ صرف معاشی خوش حالی، سیاسی استحکام اور امن وامان حاصل ہوا بلکہ مذہبی، تہذیبی، تعمیراتی، تعلیمی اور ادبی امور کو بھی غیر معمولی فروغ حاصل ہونے اور مشاہیر علم وادب کی وابستگی کے سبب ریاست بھوپال کو 'بغداد الہند' اور عہدِ شاہجہانی کو 'عہدِ زریں' سے موسوم کیا جانے لگا۔

20 فروری 1890 میں نواب صدیق حسن خاں کے مرضِ استسقا میں انتقال ہوجانے کے سبب شاہجہاں بیگم کو دوبارہ

ہوگی کا غم برداشت کرنا پڑا۔ انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور پوری مستعدی اور کامیابی کے ساتھ حکمرانی کے فرائض انجام دیتی رہیں۔ وہ محض ادب نواز اور دین دار خاتون ہی نہ تھیں کامیاب منتظم اور پہلی صاحب دیوان شاعرہ بھی تھیں۔ عنانِ حکومت ہاتھوں میں آتے ہی وہ ریاست بھوپال اور اس کے عوام کی فلاح اور اس کی ہمہ جہت ترقی کے کاموں میں منہمک اور مصروف ہوگئی تھیں۔ انھوں نے شاہی خزانہ اور توشک خانہ کا بذاتِ خود جائزہ لے کر ریاست بھوپال پر سات لاکھ روپے قرض کی ادائیگی کا بندوبست کیا۔ معرضِ التوا میں پڑے ہوئے مقدمات و معاملات کے انسداد اور تصفیے کے لیے خصوصی محکمہ 'تصفیہ مثلۂ سنین ماضیہ' قائم کر کے سہ ماہی، ماسک باری قاعدہ جاری کیا اور بہ نفس نفیس انفصال مقدمات کی سعی کی۔

خاندانی ورثے اور نواب صدیق حسن خاں کی رفاقت کے سبب تصنیف و تالیف کی طرف بیگم صاحبہ کی دلچسپی اور توجہ میں خاصا اضافہ ہوگیا تھا۔ انھوں نے نظم و نثر و لغت اور تاریخ سے متعلق جو اہم تصنیفات یادگار چھوڑی ہیں اُن میں دو مطبوعہ دیوان 'تاج الکلام' اور 'دیوانِ شیریں'، ایک مثنوی 'صدق البیان'، تاریخی کتاب 'تاج الاقبال'، خواتین کے معاملات و مسائل سے متعلق کتاب 'تہذیب النسواں و تربیت الانسان' اور لغتِ شاہجہانی کے علاوہ چھ زبانوں کے الفاظ و مصطلحات پر مشتمل ایک لغت 'خزانۃ اللغات' ان کے نام سے منسوب ہیں۔

نواب شاہجہاں بیگم نے تاجور و شیریں اور روپ رتن کے تخلص سے اردو، فارسی اور ہندی تینوں زبانوں میں طبع آزمائی کی ہے۔ انھیں اردو کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ شاہجہاں بیگم بنیادی طور پر غزل کی شاعرہ تھیں۔ ان کا کلام خالص روایتی انداز بلکہ عامیانہ رنگ کا حامل ہے، جس میں ان کے شاہانہ مزاج و ماحول کی عکاسی نہیں ہوتی۔ بطورِ نمونہ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

صورت تمھاری آئینۂ دل پہ ہے عیاں
پردہ میں تم نے منہ کو چھپایا تو کیا ہوا
عشق بازی ہے یہ کچھ کھیل نہیں ہے اے دل
کھا کے غم خونِ جگر بھی تجھے پینا ہوگا
پاس بیٹھے ہیں عدو، دور کھڑے ہیں عاشق
یہی شاید تری محفل کا قرینہ ہوگا

غزلیاتِ شاہجہانی میں ان کے مزاج و ماحول کا عکس بھلے ہی نہ جھلکتا ہو لیکن ان کی تخلیق کردہ تہذیبی مثنوی 'صدق البیان' میں ان کی شخصیت، علمیت، فکر و فن اور ان کے عہد کے حالات کا عکس نمایاں نظر آتا ہے۔ عام منظوم داستانوں سے ہٹ کر یہ ایک ایسی مثنوی ہے کہ اس میں عشقیہ داستان کے بجائے مختلف علوم و فنون، رسوم، موسموں، تیج تہواروں، فصلوں، جانوروں اور اشیائے خورونوش سے متعلق تفصیلات کے ساتھ ساتھ شہنشاہ تیمور اور راجا پتوار کی جنگ کے واقعات کو سچائی اور روانی کے ساتھ نظم کیا گیا ہے۔ زبان و بیان کے اعتبار سے یہ ایک دلچسپ، معیاری اور معلوماتی مثنوی ہے جس کے مطالعے سے ہندوستان کے قدیم تہذیبی اور جغرافیائی حالات کا علم ہوتا ہے۔ چند اشعار پیشِ خدمت ہیں:

پنگھٹ کا نمونہ

پلا ساقیا بادۂ دل ستاں
کہ ہے سیرِ دریا کا کچھ اب بیاں
عجب حسن کا واں تھا پنگھٹ بنا
کہ ہر سو نیا نقشہ تھا گھاٹ کا
پری وش، حسیں دلربا، خوبرو
فراہم وہاں ہوتی تھیں چار سو

عہدِ شاہجہانی کو اس اعتبار سے بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے کہ اِس عہد میں نہ صرف بھوپال کا پہلا تذکرہ 'تذکرۂ فرح بخش' شائع ہوا بلکہ بقیہ 13 مطبوعہ تذکرے بھی اسی عہد کی یادگار ہیں۔ تذکرہ نگاری کے ساتھ ساتھ تاریخ نویسی میں بھی یہ عہد اپنی الگ پہچان رکھتا ہے۔ اِس عہد میں مولوی محمد عباس، رفعت شروانی نے کئی تاریخی کتب تصنیف و تالیف کیں۔

وہ بن بن کے آتی تھیں اور پھر وہاں
تھیں گھونگھٹ میں کرتی نظر بازیاں
مٹکتی چمکتی وہاں آتی تھیں
اُسی ڈھنگ سے پھر چلی جاتی تھیں
کوئی دھوتی تھی پا لبِ آب پر
کوئی چھینٹوں سے اُس کو کرتی تھی تر
کوئی شوخ تر اُس سے واں بیٹھ کر
اُڑاتی تھی چھینٹے اِدھر اور اُدھر
کوئی گاگریں دھو کے پھر اُس میں آب
جھکولے سے بھرتی تھی با آب و تاب
کوئی اپنی پایل بجاتی ہوئی
چلی جاتی تھی جھونکے کھاتی ہوئی

تاریخی کتاب 'تاج الاقبال' میں بانی ریاست بھوپال سردار دوست محمد خاں کے عہد سے عہد شاہجہانی یعنی 169 سال کے سیاسی و تاریخی حالات رقم کیے گئے ہیں۔ کتاب کے آخر میں بطورِ ضمیمہ سرکاری محکمہ جات، گوشوارۂ مردم شماری، قلعہ جات اور ریاست میں پیدا ہونے والی فصلوں کی تفصیلات درج ہیں۔ اس تاریخی کتاب کی اہمیت کے پیشِ نظر اُسے فارسی اور انگریزی زبانوں میں بھی شائع کیا گیا تھا۔

شاہجہاں بیگم کا بڑا لسانی کارنامہ ان کی معروف و مفید لغت 'خزانۃ اللغات' ہے جس میں چھ زبانوں یعنی عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت، انگریزی اور اردو زبانوں کے تقریباً ساڑھے پانچ ہزار الفاظ کے معنی و متبادل پیش کیے گئے ہیں۔ اس لغت کی خوبی یہ بھی ہے کہ سنسکرت اور انگریزی الفاظ کو فارسی کے رسمِ خط کے ساتھ اُنھیں زبانوں کے اصل رسمِ خط میں بھی لکھا گیا ہے تاکہ پڑھنے والے کو صحتِ تلفظ اور ادائیگی میں دشواری پیش نہ آئے۔

نواب شاہجہاں بیگم نے اردو نثر و نظم میں اپنی بہترین علمی ادبی اور لسانی صلاحیتوں کا اظہار ہی نہیں کیا بلکہ اپنی ذاتی دلچسپی، ادب نوازی اور سرپرستی سے اردو زبان و ادب کی ہمہ جہت ترقی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ شاہجہاں بیگم نے امیر مینائی اور سرسید احمد خاں اور بعض دیگر مشاہیرِ ادب کی ادبی قدر افزائی اور معاونت بھی کی۔

عہدِ شاہجہانی کو اس اعتبار سے بھی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے کہ اِس عہد میں نہ صرف بھوپال کا پہلا تذکرہ 'تذکرۂ فرح بخش' شائع ہوا بلکہ بقیہ 13 مطبوعہ تذکرے بھی اسی عہد کی یادگار ہیں۔ تذکرہ نگاری کے ساتھ ساتھ تاریخ نویسی میں بھی یہ عہد اپنی الگ پہچان رکھتا ہے۔ اِس عہد میں مولوی محمد عباس، رفعت شروانی نے کئی تاریخی کتب تصنیف و تالیف کیں۔ منشی جگل کشور کی تاریخی کتاب 'فسانۂ رنگیں' 1870 میں فارسی زبان میں لکھی گئی مولوی سید مہدی علی کی تاریخی کتاب 'الکۂ بھوپال' اور ایاز محمد خاں کی 'تاریخ نوری' عہد شاہجہانی کی تصانیف ہیں۔

نواب شاہجہاں بیگم نے 33 سال حکومت کی، وہ بیدار مغز، باسلیقہ اور باصلاحیت حکمراں تھیں۔ ریاست کی سربراہی اور فرمانروائی ان کے نزدیک حصولِ عیش و آرام اور اظہار جاہ و جلال اور شان و شوکت کا ذریعہ نہیں بلکہ خدمتِ خلق کا وسیلہ تھی، وہ ساری زندگی اسی مشن میں مصروف رہیں۔ ان کی عہد ساز، ہمہ گیر اور ہمہ جہت خدمات کو عوام و خواص سبھی نے بہ نظرِ استحسان دیکھا اور اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔ وہ اپنی ذات والصفات اور طویل ہمہ جہت خدمات کے سبب ایک ادارے کی حیثیت رکھتی تھیں۔

Dr. M. Nauman Khan, F-3, Goyal Hari Apart. PNB Colony, Idgah Hills, Bhopal - 462001 (MP)

بانوسرتاج

ہندی مراٹھی ادب میں تانیثیت

زمانۂ قدیم میں گروکل آشرموں میں، گرو کے ساتھ رہ کر شاگرد علم حاصل کرتا تھا۔ گروکل میں داخلہ آسان نہیں تھا۔ گرو پہلے امتحان لیتے، پھر مناسب سمجھتے تو داخلہ دیتے۔ چانکیہ جب داخلہ لینے کے لیے پہنچے تو گرو نے پوچھا۔

''کون ہو؟''

چانکیہ نے فوری جواب دیا ''یہی جاننے تو آیا ہوں؟''

انھیں داخلہ مل گیا۔

ہم کون ہیں؟ ہمارا دنیا میں بھیجے جانے کا مقصد کیا ہے؟ ہمیں زندگی کس طرح گزارنی ہے؟ یہ سب تو علم حاصل کرنے سے معلوم ہوتا ہے اور علم حاصل کرنے کے لیے گرو سے — اِس جہان سے روبرو ہونا پڑتا ہے۔ عورت کو سمجھنے کے لیے بھی بہت سی باتوں کے روبرو ہونا پڑتا ہے... زمانۂ قدیم سے لے کر آج تک اس کی حیثیت کا تعین نہیں ہوا... ان حالات کا تجزیہ کرنا، اُس کی بہتری کے لیے اُسے اس کے حقوق حاصل کرنے میں مدد کرنا، بہادری سے اپنے حقوق حاصل کرنے والی عورتوں کے کارناموں سے دنیا کو واقف کرانا اِستری ومرش ہے۔ ڈاکٹر جورام یالام نابام نے ایک کتاب کا ذکر کیا ہے '''ششی تھا رور اور للتا نے وومین رائٹنگ ان انڈیا Women writing in India میں، ہندی میں، ان کی عورتوں کی، جو ادب کی تخلیق کرتی ہیں، تفصیل دی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے:

''اس ملک میں پہلی خاتون ادیب تھیری (بھکشنی) ہے جنھوں نے تھیری گاتھا کو گایا اور لکھا۔ وہ گاتی ہے ''میں تھیری ہوگئی اور اس کے چلتے گرنے سے بچ گئی۔ اس کا مطلب یہ لے سکتے ہیں کہ وہ تھیری یا تھکشنی بن کر آزاد ہوگئی... آزاد ہوگئی اپنے بدصورت، کُبڑے پتی کے تشدد سے... اس کے علاوہ آزاد ہونے کا ان عورتوں کے پاس دوسرا راستہ شاید نہیں ہے۔''

پندرہویں صدی میں، میرابائی کا ذکر ملتا ہے جس نے کرشن کو پانے کے لیے کیا کیا نہیں کیا؟ کرشن کے پریم میں پاگل ہوگئی۔ عورت کی آزادی میں سب سے بڑا روڑا لوک لاج کا ہے جس کا میرا نے بہادری سے مقابلہ کیا۔ یہ مسئلہ اب تمام دنیا کا مسئلہ بن چکا ہے۔ اپنے پتی سے مہادیوی ورما نے کہا ''اگر تم ازدواجی فرض نہیں نبھا سکتے تو مجھے آزاد کردو... میں اپنی زندگی اپنے طریقے سے جیوں گی...'' اور انھوں نے ویسا ہی کیا بھی۔ امرتا پریتم نے سماج سے لڑکر اپنے شریک حیات سے علاحدگی اختیار کی اور پھر نئی زندگی کا آغاز کیا۔

ڈاکٹر جورام یالام نابام کے مطابق ''ہندی ادب میں آزادی کے بعد نئی کہانی کے ساتھ ہی استری ومرش شروع ہوتا ہے۔ وہ پورے استحکام کے ساتھ کہانیوں میں داخل ہوتی ہے۔''

ہندی اور مراٹھی ادب میں عورت کے مختلف کردار، رنگ اور زمانے دیکھے جاسکتے ہیں: کرشنا سوبتی کی کہانی 'مِتّو مرجانی' عورت کی آزادی اور اس کی باوقار حیثیت کی شناخت کراتی ہے۔ ان کی کہانی ایک لڑکی عورت کے ممتا بھرے روپ کا مناسب بیان کرتی ہے... وہ ایک کردار سے کہلواتی ہیں — ''اپنی ہم شکل پیدا کرنا ایک عورت کے لیے بے حد اہم ہے۔ بیٹی کے پیدا ہوتے ہی ماں امر ہوجاتی ہے... وہ آج تو ہے، کل بھی رہے گی، ماں سے بیٹی تک، اگلی سے اگلی... یہی دنیا کا قانون ہے۔''

نیلاکشی سنگھ کی کہانی 'اُس برس کے موسم' کی مرکزی کردار ڈاکٹر ہے۔ وہ اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں ہے اس لیے ایک بچہ گود لے لیتی ہے اور پھر سنگھرش کا آغاز ہوتا ہے۔ کوکھ سے پیدا کرنے والی ماں اور ڈاکٹر بن کر بچہ گود لینے والی ماں کے درمیان کا... اُسے آخر قبول کرنا پڑتا ہے کہ ''بچوں کی ڈاکٹر ہونا الگ بات ہے بچے کی ماں ہونا دوسری بات۔ بچے کو صرف ڈاکٹر رہ کر نہیں پالا جاسکتا کیونکہ بچے کا مزاج اسٹیتھسکوپ سے نہیں ہاتھوں سے ٹٹول کر جانا جاتا ہے۔''

مردولا گرگ نے 'کتنے قیدی' کہانی میں کھوکھلے تعلقات کی پول کھولنے کی جرأت کی ہے تو 'ٹک' کہانی میں مختلف نظریوں کے ہوتے ہوئے بھی اپنی محبت، اپنی حسیت کی وجہ سے شوہر سے بندھے رہنے پر مجبور عورت کے جذبات کی تصویر کشی کی ہے۔

چترا مدگل نے 'معاملہ آگے بڑھے گا ابھی' کہانی میں محبت اور شادی کے فرق کو موضوع بنایا ہے... وقت کے ساتھ ہونے والی تبدیلی پر دھیان دلایا ہے۔ کہانی کی ہیروئن کہتی ہے ''مجھے تو بس رہنے کو گھر ملا ہے۔ ساری موج مستی وقت کاٹنے کی ہے۔ صاحب کہنے کو ہسبنڈ ہیں اور میں کہلانے کو بیوی۔''

سارہ رائے کی ایک کہانی ہے 'جھینگر' اس میں انھوں نے رشتے میں آئی دراڑ کو نظر انداز کرنے کی مرد کی فطرت کو پیش کیا ہے۔ اپنی شادی نہ کرتے ہوئے شیکھر کے ساتھ رہتی ہے۔ پھر اسے چھوڑ کر دوسرے مرد کے پاس چلی جاتی ہے۔ شیکھر اسے مائنڈ نہیں کرتا، کہتا ہے ''وہ اب بھی مجھے چاہتی ہے... اس نے صرف رہنے کی جگہ تبدیل کی ہے۔''

والدین کو نظر انداز کرنا، والدین اور بچوں کے درمیان ٹوٹتے رشتے، دور حاضر کی کہانیوں میں خوبصورتی سے بیان ہورہے ہیں۔ راجی سیٹھ کی کہانی 'سمانتر چلتے ہوئے' کسم انسل کی 'اسپیڈ بریکر' بانو سرتاج کی 'سہارے زندگی کے' کہانیوں میں ماں باپ دونوں کی ذمے داری سنبھالنے میں اولاد انھیں بانٹ لیتی ہے... زندگی کی شام میں میاں بیوی ایک دوسرے سے دور کردیے جاتے ہیں۔ بانو سرتاج کی کہانی 'پھینکی ہوئی عورت' میں ماں، شادی شدہ بیٹے کے لیے اس اخبار کی مانند ہوجاتی ہے

جو دوسرے ہی دن بے کار ٹھہرا کر کونے میں پھینک دیا جاتا ہے۔ بانو سرتاج ہی کی ایک اور کہانی 'چلواب مرجائیں' میں شوہر کی تیمارداری کے ساتھ بیٹے کی جی حضوری میں لگی ماں آخرکار بیٹے کی بے اعتنائی سے اس قدر دل برداشتہ ہوتی ہے کہ خود بھی زہر پی لیتی ہے شوہر کو بھی زہر پلا دیتی ہے... عصرِ حاضر کا یہ المیہ عورت کو بوڑھا ہونے سے ڈرانے لگا ہے۔

عصمت دری، گھریلو تشدد، جنسی استحصال وغیرہ مسائل کو ہندی مراٹھی تانیثی ادب میں بہت اہمیت دی گئی ہے۔ چترا مدگل کی کہانی 'جب تک بملائیں زندہ ہیں' میں بیٹی کی عصمت دری کرنے والوں سے بدلہ لینے والی بملا سب کے لیے مثال بن جاتی ہے۔ برسوں سے تشدد کی شکار عورت آج مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو رہی ہے۔ منو بھنڈاری کی کہانی 'رانی ماں کا چبوترا' اور بانو سرتاج کی کہانی 'عورت' کا مرکزی کردار عورتیں، شرابی شوہر کو گھر سے نکال باہر کرتی ہیں اور مزدوری کر کے اپنا اور بچوں کا پیٹ بھرتی نظر آتی ہیں۔

تنہائی کا المیہ جیا جادوانی کی کہانی 'آخری بار سے پہلے' میں ابھر کر سامنے آیا ہے جہاں تنہائی کی زندگی کی یکسانیت سے تنگ آکر عورت غلط راستہ اختیار کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہے مگر اس کی فطرت اس کی فلاسفی، 'اچھے کو اچھا ہی رہنا چاہیے' اُسے روک لیتی ہے۔

جہاں تک مراٹھی تانیثی ادب کا سوال ہے بقول ریکھا دیش پانڈے اور روپالی شندے ''عورتوں کا سنگھرش وقت کی ضرورت اور معاشرتی بدنظامی کی وجہ سے شروع ہوا۔ اور ادیبوں نے اُسے اپنی تخلیقات میں جگہ دینے کا تہیہ کر لیا جس دن یہ بات سمجھ میں آئی کہ عورت کے استحصال کی جڑ وہ سماج ہے جس پر مردوں کا اقتدار ہے تو اسی دن سے استری سنگھرش یا عورتوں کی جدوجہد کا آغاز ہوا۔

مراٹھی کا تانیثی ادب عورتوں کے تجربوں کا نچوڑ ہے۔ ان پر جو گزری، انھوں نے جو دیکھا، سنا، محسوس کیا اسی کو لکھا اسی لیے مراٹھی ادب میں یکسانیت اور اکتاہٹ زیادہ ہے جو ناقدین اور قارئین کے درمیان بحث کا موضوع بنا رہتا ہے۔ بھال چندر پھڑکے نے جب عورت کے تجربات کو محدود اور غیر معیاری قرار دیا تو اعتراض ہوئے، بحث ہوئی، الزام تراشی ہوئی لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ خواتین اپنے تخلیقی عمل کے تئیں ایماندار رہتی ہیں۔ اپنے تجربات کو ہوٗ بہو پیش کرنے میں مخلص رہنا، کسی بھی طرح کی ترغیب کو درگزر کرنا مراٹھی ادیباؤں کی خصوصیت ہے۔

1950 سے 2000 کے درمیان لکھی گئی کہانیوں میں دو خاص باتیں نظر آتی ہیں، اوّل تو تفریحی ادب کی تخلیقات اور دوسرے نفسیاتی تجزیات پر مبنی کہانیاں، مراٹھی افسانوی ادب میں تانیثیت کے تحت عورت کے روایتی مثالی روپ کو ترجیح دی گئی ہے۔ چول اور مول (चूल आणि मूल) یعنی امور خانہ داری اور بچوں کی پرورش و پرداخت تک محدود، تیاگ کی مورتی، شوہر کو خدا ماننے والی، (पति परमेष्वर) گھر اور خاندان کے لیے اپنے وجود کو مٹا دینے والی عورت خاتون، مصنّفین کی تخلیقات کا مرکز رہی ہے۔

شیلجا راجے کی کہانی प्रचीती (پرچیتی) میں طلاق شدہ عورت، اپنے پتی کی وفات کے بعد اس کی بیوی اور بچوں کی پرورش کی ذمے داری قبول کرتی ہے تو संस्कार (سنسکار) کہانی میں آئے اے ایس آفیسر بیوی اپنے شوہر پر آئی مصیبت میں اس کی مدد کرنے کے لیے اپنی ملازمت چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔

आली परत ती اور کلس دونوں کہانیوں میں شوہر کو چھوڑ جانے والی عورتیں ہار کر واپس شوہروں کی پناہ میں لوٹ آتی ہیں۔ روہنی جوگلیکر کی کہانیوں میں عورت ازل سے 'ہاری ہوئی' عورت ہے اور تعلیم یافتہ اور مصنوعی سماجی نظام کی نمائندگی کرتی ہے۔

عصمت دری، گھریلو تشدد، جنسی استحصال وغیرہ مسائل کو ہندی مراٹھی تانیثی ادب میں بہت اہمیت دی گئی ہے۔ چترا مدگل کی کہانی 'جب تک بملائیں زندہ ہیں' میں بیٹی کی عصمت دری کرنے والوں سے بدلہ لینے والی بملا سب کے لیے مثال بن جاتی ہے۔ برسوں سے تشدد کی شکار عورت آج مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہورہی ہے۔ منو بھنڈاری کی کہانی 'رانی ماں کا چبوترا' اور بانو سرتاج کی کہانی 'عورت' کا مرکزی کردار عورتیں، شرابی شوہر کو گھر سے نکال باہر کرتی ہیں اور مزدوری کر کے اپنا اور بچوں کا پیٹ بھرتی نظر آتی ہیں۔

سمتی شیتر ماڑے نے اپنی کہانیوں میں عورت کی آزادی، عورت کے حقوق، غیر شادی شدہ ماؤں کا المیہ وغیرہ مسائل کو پیش کیا ہے مگر عورت کی روایتی مثالی شبیہ کو دھکا نہیں لگنے دیا۔

سینہہ لتا دسنور کرنے مرد کے غیر عورتوں سے تعلقات پر اُس کی ڈھٹائی اور مجبور عورتوں کی رُلائی کو زبان دی ہے۔ مرد چاہے جو کرنے کے لیے آزاد ہے... عورت کے لیے ہر قدم پر بندھن ہیں۔ وہ غیر مرد کی طرف نظر بھی ڈالے تو سزا کی حقدار ہے۔

پتی پرمیشور ہوتا ہے مگر کب تک؟ مظالم کی انتہا ایک دن اُسے توڑ دیتی ہے۔ وہ پتی کے خلاف جانے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ 'میجر' وسودھا پاٹل کی کہانی میں ایک طرف تو ایک عورت نامرد شوہر کے ساتھ زندگی گزارنے پر مجبور ہے، تو ان ہی کی دوسری کہانی 'بلا' میں ایک عورت ظالم شوہر کی وفات پر اطمینان کی سانس لیتی ہے۔ سینتی آفلے (सुनीती आफले) کی کہانی میں ایک مظلوم عورت دل ہی دل میں شوہر کی موت کی خواہش کرتی ہے کیونکہ وہ اور کچھ کر نہیں سکتی۔ سینتی کی نَر (नर) اور (तलघर) (تہہ خانہ) کہانیوں میں بیوہ عورت کی جہنم جیسی زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ایک مخصوص سماج میں بیوہ کا سر مونڈ دینے کی ذلیل اور شرمناک رسم سے کہانی کی ہیروئن اس قدر متاثر ہوتی ہے کہ ذہنی توازن کھو کر پاگل خانے پہنچ جاتی ہے۔ 'تَل گھر' کے مرکزی کردار کے بال اس کے بیوہ ہونے کے بعد جب کاٹ دیے جاتے ہیں تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس سے اُس کا عورت پن چھین لیا گیا ہے۔

ساہتیہ اکادمی انعام یافتہ افسانہ نگار آشا بگے کا تخلیقی ادب بھی عورت کو مرکز میں رکھ کر لکھا گیا ہے۔ عورت کے روایتی روپ پر منحصر ہے۔ ان کی عورت پُراعتماد ہے مگر صرف روایتوں کی پاسداری تک۔ احتجاج کرنے کی ہمت اُس میں نہیں ہے۔

مرنالنی جوگلیکر، مرنالنی جوشی، شانتا بدھی ساگر کی کہانیوں میں پتی پتنی کے ego سے پیدا شدہ ٹکراؤ، شادی شدہ مرد کے غیر اخلاقی تعلقات Extramarital Relations جنریشن گیپ وغیرہ وغیرہ مسائل کا عورت کی زندگی پر کیا اثر پڑتا ہے انھیں بڑی خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔

دوسری طرح کی کہانیوں میں مختلف عصری مسائل کو پیش کیا گیا ہے۔ لیلا شری واستو نے Live in relationship کے تحت عارضی معاہدے پر بغیر شادی کے مرد کے ساتھ رہنے، بڑی عمر کی کنواری عورتوں، ہوسٹل میں رہنے والی لڑکیوں کے مسائل پر کہانیاں لکھی ہیں۔

سنہ ساٹھ کے بعد کی مراٹھی کہانیوں میں سدھا مرونے، سریتا بدکی، تارا بنارسے، جیوتسنا دیودھر، پدمنی بنی وال، پدمجا پھاٹک، روہنی کلکرنی، جیا راج ادھیکش وغیرہ نے عورت کی طاقت کو ہائی لائٹ کرنے کی کوشش کی ہے۔ جیا کی کہانیوں، 'جانکی دیسائی چاپرشن' اور 'جھوکا' میں بالترتیب طلاق کی کگار پر پہنچے پتی پتنی کے رشتے اور عورت کی طاقت سے خوفزدہ مرد کے جذبات کی عکاسی کی ہے۔

سچ تو ہے کہ تانیثیت کا مطالعہ کرنے کے لیے ہندوستان کی تمام زبانوں میں لکھے گئے ادب کا تقابلی موازنہ ضروری ہے جو اس مختصر مضمون میں ممکن ہے نہ مناسب!

■

Dr. Bano Sartaj, Opposite Akashwani, Civil lines, Chandrapur - 442401 (MS)

صادقہ نواب سحر

اردو ناول نگاری میں خواتین کا حصہ

خواتین کی شکایت یہ ہے کہ اردو ادب ہی نہیں، ہر زبان کے ادب کی تاریخ میں خواتین کو مرد ادیبوں کے بعد پیش کیا جاتا رہا ہے۔ دراصل یہ سماجیات کی تاریخ کا نفسیاتی پہلو ہے اور دنیا کی مختلف زبانوں پر اس کا اثر ہوتا آ رہا ہے۔ یہ شکایت کچھ کچھ حقیقت ہے۔ ڈاکٹر بچّن سِنگھ کی مشہور کتاب 'ہندی ساہتیہ کا دوسرا اتہاس' میں خواتین ادیبوں کو صرف تیرہ سطروں میں نپٹا دیا گیا ہے۔ یہ سامنے کی بات ہے اور غور کرنے والی بھی۔

یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ادب کی دنیا میں آج انتشار کی کیفیت ہے۔ چالیس پچاس سال پہلے ادب اعلیٰ تفریح کا نام تھا۔ اس کا اثر قاری کی اخلاقیات، نفسیات اور کردار پر پڑتا تھا۔ آج الیکٹرانک میڈیا ہر طرف چھایا ہوا ہے۔ بازار واد نے آدمی کو چھوٹا کر دیا ہے۔ ادب کی حیثیت دوسرے درجے پر آ گئی ہے اور اب اس کو زندگی میں پہلے جیسی اہمیت نہیں دی جاتی۔ اب نِسائی ادب ہی نہیں، پورا ادب ہی حاشیے پر ہے۔ غنیمت ہے کم از کم ڈسکورسوں، وِمرشوں کے نام پر دلتوں آدی واسی قبائلیوں کو، گاؤں کو، خواتین کو ہائی لائٹ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ چلیے یہی سہی۔ اِس بہانے سماج کے نظر انداز کیے ہوئے حصّے روشنی میں آ جائیں۔ واقعہ یہ ہے کہ مرد لکھنے والوں کی تعداد سماج میں زیادہ ہوتی ہے۔ انگریزی میں بھی دس مرد مشہور ہیں تو دو تین خواتین، مگر یہ بھی تو ایک بات ہے قرۃ العین حیدر، عصمت چغتائی کو کسی مرد نے کر اس نہیں کیا ہے یا اس سے آگے کی کوئی بات نہیں کہی ہے!

جس زمانے میں ترقی پسند تحریک اپنے پورے عروج پر تھی، اس وقت تحریک سے وابستہ خواتین کی تحریروں پر تنقید، تعریف، تبصرہ و گفتگو ہوتی تھی۔ صالحہ عابد حسین، رشید جہاں، قرت العین حیدر، جیلانی بانو، عصمت چغتائی، رضیہ سجّاد ظہیر وغیرہ کی ادبی حلقوں میں گونج تھی اور آج بھی ہے۔ انھیں کے ساتھ خواتین کا ایک بہت بڑا حصہ اور تھا جن کو نہ ادبی حلقوں میں پڑھا گیا، نہ ان پر بات ہوئی۔ پھر بھی یہ ناول نگار خواتین اپنے لاکھوں قارئین کے دلوں پر راج کرتی رہیں اور یہ تھیں نادرہ خاتون، عفت موہانی، اے آر خاتون اور ان کی بیٹی زبیدہ خاتون، بشریٰ رحمن، رضیہ بٹ، فاطمہ مبین، ہاجرہ نازلی اور مسرور جہاں وغیرہ۔ یہ پڑھی لکھی مگر عام طور پر گھریلو پردہ نشین خواتین تھیں جو نئی نسل کی ذہن سازی کر رہی تھیں۔ ان کے ناول پڑھ کر ایک نسل نے اپنے بچوں کو اور خاص طور پر بیٹیوں کو پڑھایا، تربیت کی۔

یہ دور ترقّی پسندوں کا تھا اور جو لوگ تحریک سے علاحدہ لکھ رہے تھے، انھیں عام طور پر شکایت ہوتی کہ انھیں نظر انداز کیا جاتا ہے۔ کسی مبصر اور تنقید نگار نے ان پر بات نہیں کی۔ معاشرتی اور گھریلو ناول کا ٹھپّہ لگا کر ان کے ناولوں کو پس پشت ڈال دیا گیا جبکہ یہ سوچ غلط تھی کیونکہ ان ناولوں میں زندگی سے متعلق بہت کچھ تھا۔ گھر اور باہر کے مسائل پر پوری بحث یا چھینٹا کشی ہوتی تھی۔ دنیا کی آدھی آبادی کے مسائل پر آخر لکھے گا کون؟۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ترقی پسندی کے دائرے کے باہر کے لوگوں کو معتبر ادیب کا درجہ نہیں ملا۔ جبکہ عام لوگوں نے ترقی پسندوں کی تحریروں کو کم ہی پڑھا ہے۔ میں ان میں سے ایک ناول نگار کا خاص طور پر ذکر کرنا چاہوں گی۔ ہاجرہ نازلی۔

ہاجرہ نازلی نے اٹھارہ ناول اور ایک ناولٹ 'شبِ آرزو' لکھا۔ ان کے پہلے دو ناول 1953 میں 'صبیحہ' اور 'نغمہ' کے نام سے آئے۔ 'صبیحہ' میں بچّیوں کی تعلیم و تربیت اور 'نغمہ' میں 1947 کے واقعات کا احاطہ ہے۔ اس کے بعد 'شمع بُک ڈپو' نے ان کا ناول 'نئے قدم' چھاپا۔ جس میں نئے زمانے میں کو آپریٹیو سوسائٹیوں کے ذریعے آگے بڑھنے کی بات کہی گئی ہے۔ اس کے بعد کے سارے ناول یعنی غم دوراں، غم جاناں، شبینہ، دو روپ، انتظارِ سحر، نشاطِ غم، نمودِ سحر وغیرہ نسیم بُک ڈپو سے شائع ہوئے۔ ہاجرہ نازلی کا انتقال 2002 میں ہوا۔

ہاجرہ نازلی کی دُختر 'شہناز کنول غازی' نے پانچ ناول اور ایک ناولٹ 'وقت کا مسافر' لکھا۔ ان کا پہلا ناول 'بادل کا سایہ' 1972 میں منظرِ عام پر آیا۔ جس میں خواتین کی زندگی کے مسائل، ٹوٹے خاندان، اور نئی نسل کی لڑکیاں بکھرے حالات میں کیسے خود کو سنبھالتی ہیں، اس موضوع پر نظر ڈالی گئی ہے۔

شہناز کنول غازی کے دوسرے ناول 'شہابی' کا موضوع یہ ہے کہ مشرق و مغرب میں شرم و حیا کے پیمانے ایک سے ہوتے ہیں جبکہ مغرب کی ہر لڑکی کو بد کردار سمجھنا غلط ہے۔ ان کا تیسرا ناول 'جوہی کی کلیاں' ایک طلاق شدہ عورت کی کہانی ہے۔ ناول 'آبگینہ' ایک ایسی طوائف کے ارد گرد گھومتی ہے جو شادی کر کے شریفوں کے سماج میں آ تو جاتی ہے، مگر سماج اس کی اولاد کو قبول نہیں کرتا، سِوائے کچھ پڑھے لکھے لوگوں کے۔ شہناز کنول غازی کا پانچواں ناول 'مہکتا آنچل' عورت کی ممتا پر روشنی ڈالتا ہے۔ ان کا ناولٹ 'وقت کا مسافر' ایران سے متعلق ایک تاریخی واقعے سے تعلق رکھتا ہے۔ شوہر کے ذریعے چھوڑ دیے جانے کے بعد عورت غلط راستے پر چلی جاتی ہے اور اس کا احساس اس کی اولاد کو بھی ہوتا ہے۔

زمانے نے یہ دیکھا کہ کل جو عام تھے آج خاص اور بہت خاص ہیں۔ نظیر اکبر آبادی کو دیکھ لیجیے۔ پاپولر ادب اپنی اہمیت منوانے لگا ہے۔ جاسوسی ادب کو ادبی تخلیق نہیں کہا جاتا تھا۔ اب ابنِ صفی روشنی میں آئے ہیں کہ نہیں!

بقول اقبال 'حیات ذوقِ سفر کے سوا کچھ اور نہیں'۔ آج کل تین چار ناولوں کی گونج ہے۔ سب سے پہلے میں ایک طویل افسانے 'قصہ جانکی رمن کا' کا ذکر کروں گی۔ پہلے یہ 'شب خون' میں شائع ہوا اور اس کے بعد پاکستان کے 'آجکل' میں ناولٹ کے طور پر چھپا۔ اگر یہ کتابی شکل میں آ جاتا تو ثابت ہوتا کہ پانچ خوبصورت افسانوی مجموعوں کی مصنفہ ذکیہ مشہدی اچھی ناول نگار بھی ہیں۔

ترنم ریاض نے دو ناول لکھے ہیں 'مورتی' اور 'برف آشنا پرندے'، 'مورتی' میں ناول کی صفات موجود ہیں۔ پھر بھی ضخامت کے اعتبار سے کچھ نقادوں کو وہ ایک اچھا طویل افسانہ یا ناولٹ سا محسوس ہوا۔

'برف آشنا پرندے' انھوں نے بڑی محنت سے لکھا ہے۔

کشمیر کی پوری زندگی، رسم و رواج، کہیں غریبی، دہشت گردی، کی جھلکیاں اس میں ملتی ہیں۔ ناول میں رومانیت زیادہ چھائی ہوئی لگتی ہے کہ وہاں قدرت نے اپنی خوبصورتی بکھیر دی ہے۔ اس خوبصورت ناول میں جزئیات نگاری بھی کمال کی ہے۔

ثروت خان کا ایک ناول 'اندھا یگ' 2005 میں منظرِ عام پر آیا ہے۔ یہ بھی اپنے مقامی ذائقہ کے لیے اہم ہے۔ ایسی رسم جسے اردو دنیا کے لوگ نہیں جانتے تھے، انھوں نے دکھائی ہے اور راجستھان کے کلچر سے روبرو کرایا ہے۔ اس ناول میں عورت پر ظلم کی داستان بیان ہوئی ہے۔ رواں دواں زبان میں انھوں نے اس ناول میں ایسے کردار بھی رچے ہیں جو اردو میں نایاب ہیں۔

شائستہ فاخری کا ناول 'نادیدہ بہاروں کے نشان' اپنی بیباکی کی وجہ سے اہم ہے۔ آزادیِ نسواں کا تصور ان کے یہاں ایک مختلف پیرائے میں عمل پیرا نظر آتا ہے۔ مرد کے استحصال کی داستان ان کے یہاں سخت ردِّعمل کو جنم دیتی ہے۔ ان کی ہیروئن مرد کی ضرورت سے صاف انکار کرتی ہے اور اپنی دنیا خود تخلیق کرتی ہے۔ ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے ذریعے بچّے کی پیدائش عمل میں آتی ہے۔ مصنفہ نے والد اور شوہر کے گھر سے ہٹ کر عورت کے اپنا گھر بنانے کا سکون بخش تصور یہاں پیش کیا ہے۔ اس ناول کا پلاٹ چار کرداروں پر مشتمل ہے۔ ایک طرف دو خواتین ہیں، علیزہ اور اس کا ساتھ دینے والی اس کی ڈاکٹر دوست تانیہ اور دوسری جانب علیزہ کا شوہر فرحان اور اس کے احسانوں تلے دبا ہوا اس کا چچیرا بھائی اعیان۔ شائستہ بھی ایک اچھی فنکارہ ہیں۔ اپنی بات کو خوبی کے ساتھ پیش کرنا جانتی ہیں۔ انھوں نے اس ناول کے ذریعے جو آزادی اور خود انحصاری عورت کو بہم پہنچائی ہے، اس پر یہ سوال بھی اٹھتا دیکھا ہے کہ وہ کس کو راس آئی ہے؟ سوال یہ بھی ہے کہ کیا عورت نے اپنے آپ کو نئی دوطرفہ ذمے داریوں میں باندھ کر مرد کو آزاد کر دیا ہے۔ مزید استحصال کرنے کے لیے!

ناصرہ شرما ہندی کی مقبول ناول نگار ہیں۔ ان کے ناول 'زندہ محاورے' اور 'شالملی' کے علاوہ کچھ اور ناول اردو میں بھی شائع ہوئے ہیں۔ ان کے ناولوں میں عورت کا احتجاج تو ہے مگر وہ بیباکی سے بچتی ہیں اور گھر پریوار کو جوڑ کر رکھنے کی بات کرتی ہیں۔

اپنے ناول 'کہانی کوئی سناؤ، مِتاشا' (ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2008) کے بارے میں کچھ کہنا خود ستائی سی لگتی ہے۔ صرف سلام بن رزاق کے الفاظ دہرا دیتی ہوں، "میرے نزدیک فکشن کی پہلی شرط اس کا مطالعاتی وصف ہے اور یہ وصف 'کہانی کوئی سناؤ، مِتاشا' میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ اپنے تخلیقی اظہار، رواں دواں بیانیہ اور حقیقی کردار نگاری کے سبب یہ ناول شروع سے آخر تک قاری کو نہ صرف باندھے رکھتا ہے بلکہ ورق ورق اس کے اندر ایک دبی دبی سی کسک کا احساس بھی پیدا کرتا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار مِتاشا، پورے ناول میں لہر لہر ڈوبتی اور گھاٹ گھاٹ ابھرتی ہے۔ ناول ختم ہو جاتا ہے مگر متاشا قاری کے ذہن پر دیر تک دستک دیتی رہتی ہے۔"

شہزاد پبلی کیشنز، کراچی کے علاوہ یہ ناول ہندی میں بھی بھاونا پرکاشن، دہلی سے چھپ کر مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔

اکیسویں صدی میں خواتین کے کئی ناول منظرِ عام پر آئے ہیں۔ علی گڑھ کی نسترن فاتحی نے کیمپس کی زندگی پر 'لفٹ' نامی ناول لکھا ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار ایک پروفیسر ہے۔

بنگلور کی فریدہ رحمت اللہ نے 'قسمت کے خریدار' اور 'درد کی چوکھٹ' کے عنوان سے دو ناول لکھے ہیں۔ اول الذکر ناول جہیز کے خلاف آواز اٹھاتا ہے تو آخر الذکر آزادیِ ہند کے بعد جاگیر دار کثیر الاولاد گھرانوں میں تعلیم کی کمی کی وجہ سے بکھراؤ کے مسئلے کا احاطہ کرتا ہے۔ فریدہ 'زرین شعاعیں' کی مدیرہ ہیں۔

آزادیِ نسواں کا تصور ان کے یہاں ایک مختلف پیرائے میں عمل پیرا نظر آتا ہے۔ مرد کے استحصال کی داستان ان کے یہاں سخت ردِعمل کو جنم دیتی ہے۔ ان کی ہیروئن مرد کی ضرورت سے صاف انکار کرتی ہے اور اپنی دنیا خود تخلیق کرتی ہے۔ ٹیسٹ ٹیوب بے بی کے ذریعے بچّے کی پیدائش عمل میں آتی ہے۔ مصنفہ نے والد اور شوہر کے گھر سے ہٹ کر عورت کے اپنا گھر بنانے کا سکون بخش تصور یہاں پیش کیا ہے۔ اس ناول کا پلاٹ چار کرداروں پر مشتمل ہے۔ ایک طرف دو خواتین ہیں، علیزہ اور اس کا ساتھ دینے والی اس کی ڈاکٹر دوست تانیہ اور دوسری جانب علیزہ کا شوہر فرحان اور اس کے احسانوں تلے دبا ہوا اس کا چچیرا بھائی اعیان۔ شائستہ بھی ایک اچھی فنکارہ ہیں۔

پونے کی خورشید نکہت کے پانچ چھے ناول لاہور سے شائع ہوئے ہیں۔ انھوں نے انگریزی کتابوں کے ترجمے بھی کیے ہیں۔ امسال ان کی وفات سے چند روز قبل 'اسباق پبلی کیشنز' نے ان کا ناول 'تنہا تنہا' شائع کیا، جس میں ایک ناکام محبت کی داستان درج ہے۔ اس ناول میں ایک طرف شکیل اور نازاں کی پاک اور شرمیلی محبت ہے اور دوسری جانب آنند کی نازاں کی سہیلی سے محبت۔ کشمیر کے خوبصورت پسِ منظر میں لکھے اس ناول کا انجام موت جیسے المیے پر ہوتا ہے۔ خورشید نکہت نے ایک جگہ لکھا ہے کہ انھیں ٹریجڈی پسند ہے اور ان کے ناولوں کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے۔ 'تنہا تنہا' ناول پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ مصنفہ نے یہ ناول ایک زمانہ پہلے لکھ رکھا تھا، شائع اب ہوا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اشاعت سے قبل اسے نظرِ ثانی کی ضرورت تھی۔

'دھند میں کھوئی ہوئی روشنی' افسانہ خاتون کا ایک بولڈ ناول ہے۔ اس میں دہری شخصیت کے نفسیاتی مسئلے کی ترجمانی ہی نہیں کی گئی ہے بلکہ مسئلے کا حل بھی تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ناول کی ابتدا ایک نوجوان جوڑے کے کسی خوبصورت مقام کے ہوٹل میں داخلے سے ہوتی ہے۔ سنتوش اور شالنی بظاہر بہت خوش ہیں لیکن ہر بار اور ہر بات پر شالنی کے سامنے سمیر آ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ اس طرح بڑے منجھے ہوئے طرز پر ایک منظر میں شالنی کے ساتھ سنتوش ہے تو دوسرے میں سمیر کا خیال۔ محبوب اسے ہواؤں میں اڑاتا تھا اور اس کے لیے وہ مر مٹنے کو تیار تھا۔ یہی افلاطونی محبت وہ شوہر میں بھی تلاش کرتی ہے۔ شالنی جذبات کے مدوجزر میں پھنسی ہوئی ہے۔ سنتوش کو بھی اس کی ذہنی غیر حاضری کھٹکتی ہے اور وہ اس کا ذکر اپنے ڈاکٹر دوست سے بھی کرتا ہے۔ ناول کے آخر میں شالنی کو احساس ہو جاتا ہے کہ سمیر صرف خواب ہے اور سنتوش حقیقت۔ اس ناول میں سمیر ایک بار بھی سامنے نہیں آتا مگر اس کی موجودگی کا احساس ہمیشہ رہتا ہے۔

اس ناول کا پلاٹ مختصر ہے اور چونکہ ہندوستانی ذہنیت کا غماز ہے۔ اس لیے چند صفحات کے بعد ہی قاری کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ آخر میں کیا ہوگا۔ شالنی اور سمیر کے کردار سپاٹ ہیں اور سنتوش ایک گول کردار ثابت ہوتا ہے۔ ابتدا میں وہ ایک بے حس شوہر سا لگتا ہے مگر آگے چل کر وہ اپنی بیوی کو جس طرح وقت دیتا ہے کہ وہ اپنے نئے حالات میں خود کو ڈھال لے اور ایم اے کی پڑھائی کر کے ذہنی طور پر خود کو مصروف رکھے، غیر متوقع سچویشن تھی۔

میں سمجھتی ہوں کہ ناول میں جس نفسیاتی پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے، وہ ہے احساسِ گناہ، self pity اور اپنے آپ کو معاف کرنے کی ضرورت پر اسرار اور حالات سے مفاہمت۔ اس زاویے سے دیکھا جائے تو ناول کا مقصد وسیع ہو جاتا ہے کہ انسان کی زندگی میں کچھ باتیں ضرور ایسی ہوتی ہیں، جنھیں یاد کے کولڈ اسٹوریج میں رکھنا پڑتا ہے۔ محبت کمزوری نہیں طاقت ہے، شاید یہ احساس دینا بھی اس ناول کا مقصد ہے۔

ناول میں شاید کچھ بولڈ مناظر رکھنے کی مصنفہ نے یوں ضرورت محسوس کی ہوگی کہ یہ ایک ہنی مون جوڑا ہے!

اِن ناولوں کے علاوہ نسرین بانو کا ناول 'ایک اور کوسی'، آشا پربھات کا 'جانے کتنے موڑ'، برجیس بانو کا 'کفارہ'، مشہور شاعرہ ساجدہ زیدی کا ناول 'موجِ ہوا پیما' بھی ابھی توجہ چاہتے ہیں۔

Sadiqa Nawab Saher, Asso. prof & Dept of Hindi, KMC College, Khapoli, Distt. Raigarh - 410203 (MS)

ساجدہ شیروانی

اردو کی چند کم معروف شاعرات

دنیا کے ہر حصے اور ہر ملک میں خواتین نے تہذیب و تمدن، معاشرت، علم وفلسفہ وسیاست وحکومت اور زبان وادب غرض کہ ہر میدان میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے ہیں ہاں یہ بات ضرور ہے کہ اس ملک یا خطے کے اپنے مخصوص حالات کے تحت ان کا حصہ مردوں کے مقابلے کم رہا ہو۔

یورپ ہو یا ایشیا، عرب ہو یا عجم، چین ہو یا جاپان یا پھر برصغیر، لاتعداد خواتین نے اپنی فکر کی روشنی سے آسمان شعر وادب کو بھی منور کیا ہے یوں بھی عورت کے مزاج اور طبیعت کو فطری طور پر شعر وشاعری جیسے فن لطیف سے ایک مناسبت ہے پھر کوئی وجہ نہیں کہ اردو کا گلشنِ شعرو شاعری ان کے خیالات کی خوشبو سے نہ مہکتا۔

لیکن اردو شعرا کے تذکروں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات کھٹکتی ہے کہ ان میں یا تو خواتین کے نام نظر نہیں آتے یا پھر ان کی تعداد انتہائی قلیل ہے اس کی ایک وجہ تو یہ ہوسکتی ہے کہ یہ تذکرے مردوں نے ترتیب دیے ہیں اس لیے خواتین کو ان میں جان بوجھ کر نظر انداز کیا گیا دوسری وجہ جو میری نظر میں اہم ہے یہ ہوسکتی ہے کہ عورت کی فطری شرم وحیا نے اسے اور اس کے فن کو پردے میں چھپائے رکھا اور اس کی ذہنی کاوشوں کو منظر عام پر نہ آنے دیا اُدھر مردوں نے بھی ان کی اس پردہ دری کے احترام میں اسے ظاہر کرنا مناسب نہ سمجھا پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ابتداً شاعری کے اظہار کا طریقہ مشاعرے ہی تھے جن میں عورتوں کے شریک ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تذکروں کا دور بعد میں شروع ہوا۔

بہر حال وجہ کچھ بھی ہو تذکروں میں خواتین شعرا کا ذکر نہ ہونے کی وجہ سے ایک بڑا ادبی اور تاریخی نقصان یہ ہوا کہ ادب کے اس سرمائے سے جو خواتین کی وجہ سے عالم وجود میں آیا ہم ناواقف ہیں یا بہت کم علم رکھتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ خود ان تذکروں کی اپنی افادیت، اہمیت اور حقیقت نگاری پر بھی ایک سوالیہ نشان ابھر آیا ہے۔

میر تقی میر کے نکات الشعرا کا شمار اردو شعرا کے ابتدائی اور اہم تذکروں میں کیا جاتا ہے جس میں کسی خاتون شاعرہ کا حتیٰ کہ خود میر کی محبوب صاحبزادی، جن کا تخلص بیگم تھا، کا بھی نہ ذکر ہے اور نہ نمونہ کلام۔ حالانکہ یہ بات قرین قیاس نہیں کہ ان کو اپنی ہی دختر کے ذوق شاعری کا علم نہ ہو۔

بیگم کی ایک غزل کے دو شعر پیش ہیں:

برسوں خمِ گیسو میں گرفتار تو رکھا
اب کہتے ہو کیا تم کہ مجھے مار تو رکھا
کچھ بے ادبی اور شب وصل نہیں کی
ہاں یار کے رخسار پہ رخسار تو رکھا
اس عشق کی ہمت کے میں صدقے ہوں کہ بیگم
ہر وقت مجھے مرنے پہ تیار تو رکھا

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ غالباً پہلے اہم تذکرہ نگار ہیں جنھوں نے 'گلشن بے خار' میں چند شاعرات کا ذکر کیا ہے۔ ان کے علاوہ شیخ کریم الدین نے طبقات شعرائے ہند میں اور عبدالغفور نساخ نے 'سخن شعرا' میں 39 خواتین کا مختصر ذکر کیا۔ انگریز شاعرہ نے ملکہ کا ذکر اپنی شاگرد کی حیثیت سے کیا ہے اور چند شعر بھی تحریر کیے ہیں دو شعر اس طرح ہیں:

ہوگئی نیند بھی ہمسایہ کی تا صبح حرام
میں نے نالہ جو کسی رات سر شام کیا
ہجر میں دل کو بیقراری ہے
جوش فریاد آہ و زاری ہے

رائے درگا پرشاد نے تذکرۃ النسا نادری، مولانا آسی نے تذکرۃ الخواتین کے نام سے مختصر تذکرے اردو کی خواتین شعرا کے ترتیب دیے اس کے علاوہ بھی خواتین شعرا کے چند تذکرے شمیم سخن، گلشن ناز چمن انداز وغیرہ کے نام سے تالیف کیے گئے جن کے مطالعے سے یہ بات تو عیاں ہے کہ بہت سی خواتین مردوں سے بہتر شعر کہتی تھیں اور آج بھی کہتی ہیں۔ شاعری کے لیے علاوہ دیگر خصوصیات کے جس لطیف احساس، نازک طبعی، حساس دل اور پر درد مزاج کی ضرورت ہے وہ قدرت نے مردوں سے زیادہ عورت کو عطا کیا ہے۔ زبان و بیان بھی ان کی سادہ اور شستہ ہوتی ہے۔ اس لیے قدرتی طور پر ان کے اشعار میں مردوں سے زیادہ تاثیر ہوتی ہے۔ اور ان کا کلام بھی پر درد ہوتا ہے۔

اردو کی پہلی شاعرہ کون تھی اور اس نے پہلا شعر کب اور کہاں کہا یہ کہنا تو قریب قریب ناممکن ہے لیکن اس بات کے کافی شواہد ہیں کہ اردو کی پہلی صاحب دیوان شاعرہ چندا ساکن حیدرآباد تھی جس کا نام مہ لقا تھا اور شیر محمد خاں ایمان کی شاگرد تھی۔ اس کا ایک شعر درج ہے:

یک لخت پارہ پارہ کر ڈالوں آئینے کو
پر کیا کروں کہ تیرا منہہ درمیان رہے گا

یہ بھی دلچسپ اتفاق ہے کہ اردو کا پہلا صاحب دیوان مرد شاعر بھی دکن کا ولی ہے۔

بعض حضرات کی تحقیق کے مطابق جن میں صاحب جلوۂ خضر بھی شامل ہیں اردو کی پہلی شاعرہ بادشاہ جہانگیر کی بیوی مہر النسا یا نور جہاں کو قرار دیا گیا ہے۔ جو اشعار اس کی طرف منسوب کیے ہیں ان میں سے چند ملاحظہ کریں:

کل تم جو یہ کہتے تھے شمشیر ہے اور میں ہوں
یہ طشت ہے، یہ سر ہے، تقصیر ہے اور میں ہوں
چمن میں ہے جو یہ ننھی سی بوٹی
نگہ کے بوجھ سے جاتی ہے ٹوٹی

اور

ظاہر میں مرے حال کو سر سبز نہ جانو
پوشیدہ جگر رکھتی ہوں مانند حنا کے

جہانگیر کی بیٹی زیب النسا بیگم کا تخلص مخفی کہا جاتا ہے اس کا یہ شعر دیکھیں:

جدا ہو مجھ سے مرا یار یہ خدا نہ کرے
خدا کسی کے تئیں دوست سے جدا نہ کرے

بیسویں صدی کے آتے آتے بہت سی اردو شاعرات کا کلام منظر عام پر آنے لگا تھا۔ کیونکہ اب ماحول بدلنے لگا تھا اور سماج میں خواتین کی قدر و منزلت بھی بڑھنے لگی تھی ادھر زمانہ بھی ان کی صلاحیتوں کا معترف ہو رہا تھا۔ ان شاعرات میں سے چند کا مختصر ذکر کرنا چاہوں گی کہ نہ تو وہ شاعرات اب اس دنیا میں موجود ہیں اور ان کا کلام بھی

وقت کے ساتھ ساتھ ذہنوں سے محو ہو رہا ہے

سیدہ خیر النساء بہتر رائے بریلوی: 1878 میں رائے بریلی میں پیدا ہوئیں 1904 میں مشہور عالم مولانا کلیم سید عبدالحئی مرحوم سے شادی ہوئی۔ بڑی عابدہ و زاہدہ خاتون تھیں۔ کلام پر بھی مذہبی رنگ غالب رہا۔ مشہور عالم دین ابوالحسن علی ندوی آپ کے ہی فرزند تھے 1968 میں انتقال ہوا۔

ایک شعر ملاحظہ ہو:

گھبرا نہ ہم سے دنیا تجھ میں نہ ہم رہیں گے
اپنا وطن عدم ہے جا کر وہیں بسیں گے

امت الفاطمہ مخفی: لکھنؤ کی شاعرات میں ایک نام امت الفاطمہ مخفی لکھنوی کا بھی ہے جو 1902 سے 1953 تک حیات رہیں، شعر ہے:

کون پہنچے گا مرے اوج سخن کو مخفی
بام گردوں سے بھی کچھ دور ہے پرواز جہاں

آمنہ خاتون عفت: آمنہ خاتون عفت مظفر نگری 1903 میں پیدا ہوئیں اور 1974 میں انتقال کیا شاعری کے ساتھ ساتھ سماجی اور سیاسی میدان میں بھی سرگرم رہیں میونسپل بورڈ اور ڈسٹرکٹ بورڈ کی ممبر رہیں۔ ان کے دو شعر پیش ہیں:

صلہ پائے گی آہ نا رسا کیا
ہلے گی پردۂ عرش علا کیا
ہر اک آنسو ہے روح عشق عفت
دُر و گوہر سے اس کو واسطہ کیا

عصمت آرا بیگم عصمت لکھنوی: 1905 میں اطبا کے مشہور خاندان میں پیدا ہوئیں خلافت تحریک میں پردے میں رہ کر سرگرم رہیں۔ ان کا ایک شعر ہے:

چلا کے تیر نظر دل کو کردیا پامال
جو زخم تو نے دیے ہیں دکھا نہیں سکتے

1976 میں راہی ملک عدم ہوئیں۔

اس دور کی شاعرات میں نور جہاں نور بدایونی اور زاہدہ خلیق الزماں لکھنوی کی مخصوص حیثیت ہے۔

نور جہاں نور: نور جہاں نور 1905 میں پیدا ہوئیں غزل کے ساتھ ساتھ نظم کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی اور اقبال کی تقلید کی کوشش کی۔ مشہور شاعر عندلیب شادانی نے آپ کی بڑی تعریف کی ہے اور انھیں ایک مضبوط اور معتبر شاعرہ قرار دیا ہے۔ شعر ملاحظہ کریں:

ہے یہی آئینۂ ہستی یہی رازِ حیات
زندگی کیا ہے عمل کا اک مسلسل امتحان
چارہ گر بہر خدا چھوڑ دے فکر درماں
بھر سکے وقت کا مرہم یہ وہ ناسور نہیں

ان اشعار پر بھی غور کریں:

ابھی تقدیر کا انداز ستم باقی ہے
زیست بے کیف نہیں لذت غم باقی ہے
آخری فیصلہ قسمت کا سنانے والے
ہاتھ میں کاتبِ قدرت کا قلم باقی ہے

1978 میں آپ کا انتقال ہوا۔

زاہدہ خاتون زاہدہ: زاہدہ لکھنوی نے جو مشہور مسلم لیگی لیڈر چودھری خلیق الزماں کی بیگم تھیں 1915 میں جنم لیا، بہت اچھی شاعرہ تھیں، ان کے کلام میں سوز و گداز، شعریت، نغمگی، زبان و بیان کی معصومیت کے ساتھ ساتھ تغزل بھی رچا ہوا ہے۔ شروع میں قومی نظمیں بھی کہی ہیں ایک شعر ملاحظہ ہو:

ہم اپنا ملک اپنا تخت اپنا تاج لے لیں گے
کہے دیتے ہیں ہم اس سال میں سوراج لے لیں گے

موجودہ دور میں تو شاعرات کی تعداد اتنی زیادہ ہوگئی کہ ان کے ذکر کے لیے بھی ایک دفتر درکار ہے۔ ان میں داراب بانو وفا، نور جہاں ثروت، مسعودہ حیات، شاہجہان بانویاد سے لے کر فہمیدہ ریاض، کشور ناہید اور پروین شاکر جیسی اہم شاعرات شامل ہیں جن کا اپنا منفرد انداز، آہنگ اور اسلوب ہے اور اپنی مستقل شناخت ہے۔

بعد میں پاکستان چلی گئیں، ریڈیو پاکستان سے آپ کا کلام اکثر نشر ہوتا تھا ملاحظہ ہو:

ترجمان دل ہے اک اک شعر اپنا زاہدہ
کون پاسکتا ہے یہ گلہائے تر میرے بغیر
مدت ہوئی کہ چشم تصور کو ہے سکوت
اب جنبش نظر میں کوئی داستاں نہیں
قبا کو چاک گریباں کو تار تار کیا
بقدر حوصلہ اندازۂ بہار کیا
جوش جنوں میں ہم جو دلِ ویران لیے ہوئے
نکلے ہیں گھر سے ساتھ بیاباں لیے ہوئے

1982 میں انتقال ہوا

مندرجہ بالا شاعرات کے علاوہ صفیہ شمیم ملیح آبادی جو جوش ملیح آبادی کی بھانجی تھیں۔ رضیہ انور امروہوی، حفیظ جالندھری کی صاحبزادی تسنیم حفیظ، سلمیٰ تصدق حسین، زاہدہ شیروانی، ساجدہ زیدی بھی قابل ذکر ہیں۔

موجودہ دور میں تو شاعرات کی تعداد اتنی زیادہ ہوگئی کہ ان کے ذکر کے لیے بھی ایک دفتر درکار ہے۔ ان میں داراب بانو وفا، نور جہاں ثروت، مسعودہ حیات، شاہجہان بانویاد سے لے کر فہمیدہ ریاض، کشور ناہید اور پروین شاکر جیسی اہم شاعرات شامل ہیں جن کا اپنا منفرد انداز، آہنگ اور اسلوب ہے اور اپنی مستقل شناخت ہے۔ لیکن ان کے ذکر کے لیے وقت کی تنگی پیش نظر ہے صرف پروین شاکر کے اشعار پر اکتفا کروں گی:

سفر میں رات جو آئی تو ساتھ چھوڑ گئے
جنھوں نے ہاتھ بڑھایا تھا رہنمائی کا

یا

میں سچ کہوں گی مگر پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا اور لاجواب کردے گا
برق تھی یا کہ شرارِ دلِ آشفتہ تھا
کوئی پوچھے تو میرے آشیاں برباد سے بھی
میں بھنور سے تو نکل آئی اور اب سوچتی ہوں
موج ساحل نے کیا ہے مجھے غرقاب کہاں

لیکن رامپور کی مشہور شاعرہ سابق ایم ایل اے محترمہ کشور آرا شبنم ایڈوکیٹ کے تیور ملاحظہ ہوں۔

فرماتی ہیں کہ:

ساتھ چھوڑیں گے کنارے تو ڈبو کر ان کو
موج مضطر ہوں تلاطم میں ابھر آؤں گی
جس قدر چاہے ستالے شبِ فرقت شبنم
سورج اُبھرے گا تو پھر ہاتھ نہیں آؤں گی

آخر میں رامپور کی ایک محترم شاعرہ نواب رضا علی خاں صاحب والیِ رامپور کی بیگم رفعت زمانی بیگم صاحبہ عصمت کے تین شعر ملاحظہ ہوں:

کون سنتا ہے اس زمانے میں
کس سے کہیے کہ التجا کیا ہے
لب بیمار تھر تھراتے ہیں
جھک کے سینے ذرا دعا کیا ہے
حضرت خضر بھی بتا نہ سکے
زندگانی کا مدعا کیا ہے

موجودہ دور میں اردو شاعری کا کوئی تذکرہ ان خواتین کے تذکرے کے بغیر مکمل نہیں کیا جاسکتا۔

■

Sajida Shevani Farsi Cataloger, Rampur Raza Library, Rampur (UP)

فوزیہ خانم

اردو شاعری میں تانیثی ومزاحمتی رویے

فوزیہ خانم

ادب اورسماج کا رشتہ ناگزیر ہے۔ ادب کا تصور سماج ومعاشرے کے بغیر ممکن نہیں، یہ سماج سے متاثر بھی ہوتا ہے اور سماج کو متاثر بھی کرتا ہے۔تغیر وتبدیلی زمان ومکان کی ضرورت ہے۔حیات وکائنات کی تمام چیزوں کی طرح ہماری شاعری بھی موضوع،مواداور ہئیت کے اعتبار سے تبدیل ہوتی رہی ہے۔شاعری میں فکری وفنی تبدیلیوں کی وجہ سے نئے رجحانات ونظریات کو موضوع سخن بنایا جانے لگا۔ان جدید رجحانات میں ایک اہم رجحان تانیثیت ہے۔تانیثی ادب میں نسائی جذبات واحساسات کی عکاسی وترجمانی کی جاتی ہے۔خواتین کوان کے حقوق،سماجی مساوات اور قانونی تحفظ فراہم کرنے کی تحریک کا نام تانیثیت (Feminism) ہے۔اس تحریک میں حق رائے دہی، مساوات،عورتوں کی ضروریات،حق میراث،آزادیِ رائے،خود کفیلی ،آزادخیالی، خانگی جبر،اور آبروریزی سے تحفظ وغیرہ جیسے تمام حقوق ومسائل شامل ہیں۔

تانیثی نظریہ مغرب کی دین ہے،ابتدامیں یہ نظریہ خواتین کے سیاسی،سماجی حقوق کی بازیافت کے لیے مروج ہوا،لیکن رفتہ رفتہ یہ نظریہ ترقی کر کے ایک تحریک کی شکل اختیار کر گیا، اور عالمی سطح پر اس کی پزیرائی ہونے لگی۔اس تحریک کے ذریعے عورتوں سے متعلق تمام مسائل حل کیے جانے لگے۔ مشرق میں یہ تحریک انیسویں صدی کے وسط تک پہنچی۔اس تحریک کا وجود مزاحمت واحتجاج کے بغیر ممکن نہیں۔ جب احتجاج کی لے بڑھتی ہے تو تحریک جنم لیتی ہے۔حقوق کی پامالی کے ردعمل میں احتجاج ہونا فطری عمل ہے۔مزاحمت واحتجاج کے اظہار کے مختلف ذرائع ہیں،اپنی اہلیت وذہنیت کے مطابق کبھی قلم تو کبھی تلوار کا سہارالیا جاتا ہے۔

مزاحمت عربی زبان کے لفظ 'زحمہ' سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی ٹکرانے یا مدافعت کرنے کے ہیں۔ظلم وجبر کے خلاف آواز بلند کرنا ہر ذی روح کا حق ہے۔جب ظلم ہوتا ہے تب مزاحمت وبغاوت ہوتی ہے۔کبھی عوام حکومت کے خلاف، کبھی ایک ملک دوسرے ملک کے خلاف۔ اسی طرح جب عورتوں پر ظلم وجبر کی انتہا ہوئی تو مغرب کی طرف سے ایک

نمایاں پیش رفت تانیثی تحریک کی شکل میں ہوئی۔مشرق میں اس تحریک کوخاطرخواہ کامیابی بیسویں صدی میں جا کرمل سکی۔

انیسویں صدی سے پہلے عالمی سطح پرعورتوں کی کوئی قدر نہ تھی، انھیں جانوروں کی طرح فروخت کیا جاتا تھا۔عورت صرف عیش وعشرت فراہم کرنے کا آلہ سمجھی جاتی تھی۔ پدرانہ نظام عام تھا،لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں کوکمترحقوق حاصل تھے۔تعلیم نسواں کومعیوب سمجھا جاتا تھا۔مشرق میں بھی عورتوں کی حالت قابل رحم تھی۔سماج میں پھیلی بہت سی کو پرتھا رسموں کی وہ بلی چڑھائی جاتی تھی۔ دھیرے دھیرے ان رسموں کا خاتمہ ہوتا گیا،لیکن یہاں کی خواتین میں صبر، حیااور مذہبی جذبہ زیادہ مستحکم تھااسی لیے اس تحریک کی خاطر خواہ پزیرائی نہ ہو سکی۔ مشرق میں اس تحریک کی پہل مردوں کے ذریعے ہوئی۔اس کے بعداس میدان میں عورتیں بھی آئیں،لیکن اس دور کے موضوعات تعلیم نسواں کے فوائداور سماجی مسائل سے سروکار رکھتے تھے۔اگرکسی کے یہاں مزاحمت کارویہ ہے بھی تو بہت ہی سطحی،مبہم اوردھیمے لہجے کا ہے۔

مشرق میں 1960 کے بعد بعض اردو شاعرات کے یہاں نسائی شناخت وتشخص پورے طور پرنظر آتی ہے۔انھوں نے پدری نظام جبر کو اپنا موضوع بنایا، اور اپنے تجربات، مشاہدات اور تاثرات کوتانیثی لب ولہجہ اورنسائی شعور کے ساتھ پیش کیا۔اس دوراوراس کے بعدکی شاعرات نے جہاں ایک طرف پدری نظام جبر، بے جارسم ورواج کے بوجھ تلے دبی ہوئی خواتین کے مسائل کواپنے سخن کا موضوع بنایا ہے، تودوسری طرف سیاسی،سماجی مسائل کوبھی اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔نسائی احساسات وتاثرات سے متعلق مسائل پر مرد ادیبوں نے بھی تخلیقات پیش کی ہیں۔لیکن جس طرح شراب کا ذکر بہتر طریقے سے وہی کرسکتا ہے جواس لذت سے آشنا ہو،اسی طرح عورتوں کے حقیقی جذبات اورتاثرات خوداسی کی زبان وقلم سے زیادہ موثرطریقے سے پیش کیے جا سکتے ہیں۔

پدرانہ نظام کا چلن دنیامیں عام ہےلیکن ہمارے مشرق کا نظام، رسم ورواج مغربی ممالک سے بالکل مختلف ہے، عورت شرم وحیا کی دیوی سمجھی جاتی ہے۔انیسویں صدی سے پہلے عورتوں کی خواہشات،احساسات، تاثرات، پسند ناپسند کوکوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔لیکن دھیرے دھیرے سماجی بیداری آئی اورعورتوں نے صرف اپنی خواہشات ہی نہیں منوائیں بلکہ پدرانہ نظام کونظام جبر سے تعبیر بھی کیا، اوراس کے خلاف آواز بھی بلند کی، سماجی وسیاسی مسائل پربھی اپنی رائے کا برملا اظہار کیا۔تانیثیت کی علم بردار شاعرات میں ادا جعفری، کشور ناہید، فہمیدہ ریاض، پروین شاکر، زہرہ نگاہ، ترنم ریاض، شہناز نبی، عذرا عباس، شائستہ حبیب، پروین فنا سید، عرفانہ عزیز، زاہدہ زیدی، ساجدہ زیدی وغیرہ ہیں۔مثال کے لیے چندنمائندہ شاعرات کے کلام کوپیش کیا جارہا ہے۔

ادا جعفری پیدائش 1924 بدایوں

اردوشاعری میں تانیثی رویہ اورلب ولہجہ کے اظہار میں ادا جعفری سرفہرست ہیں۔ان کے یہاں خوداعتمادی اورخود شناسی پائی جاتی ہے۔ان کی نظموں اورغزلوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے احساسات اورتجربات کوالفاظ میں ڈھالنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔عورت شرم وحیا،تابع داری اورروایتی بندشوں میں بندھی ایک کٹھ پتلی تھی۔سماجی اور روایتی بندشوں کے ساتھ اس کی سوچوں پربھی مہرلگادی گئی تھی۔ایک فرماں بردار خاتون کے دل کی آواز کوادا جعفری نے اپنی نظم 'سازسخن بہانہ ہے' میں اس طرح بیان کیا ہے۔

مشرق میں 1960 کے بعدبعض اردو شاعرات کے یہاں نسائی شناخت وتشخص پورے طور پرنظر آتی ہے۔ انھوں نے پدری نظام جبر کو اپنا موضوع بنایا، اور اپنے تجربات، مشاہدات اور تاثرات کو تانیثی لب ولهجه اور نسائی شعور کے ساتھ پیش کیا۔ اس دور اور اس کے بعد کی شاعرات نے جہاں ایک طرف پدری نظام جبر، بے جا رسم ورواج کے بوجھ تلے دبی ہوئی خواتین کے مسائل کو اپنے سخن کا موضوع بنایا ہے، تودوسری طرف سیاسی، سماجی مسائل کو بھی اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ نسائی احساسات وتاثرات سے متعلق مسائل پر مرد ادیبوں نے بھی تخلیقات پیش کی ہیں۔

غبارصبح وشام میں/ تجھے تو کیا
میں اپنا عکس دیکھ لوں میں اپنا اسم سوچ لوں
نہیں میری مجال بھی
کہ لڑکھڑا کے رہ گیا مرا ہر اک سوال بھی
مرا ہر اک خیال بھی
میں بے قرار وخستہ تن/ بس اک شرار عشق میرا پیرہن
مرا نصیب ایک حرف آرزو
وہ ایک حرف آرزو/ تمام عمر سو طرح لکھوں
مرا وجود اک نگاہ بے سکوں
نگاہ جس کے پاؤں میں ہیں بیڑیاں پڑی ہوئی

اسی طرح ان کی نظم 'آشوب آگہی' بھی ہے اس نظم میں بھی انھوں نے عورتوں کی بےبسی اور بے چارگی کا تذکرہ اس طرح کیا ہے:

جیسے دریا کنارے/کوئی تشنہ لب
آج میرے خدا/ میں یہ تیرے سوا اور کس سے کہوں
میرے خوابوں کے خورشید ومہتاب سب
میری آنکھوں میں اب بھی سجے رہ گئے
میرے حصے میں کچھ حرف ایسے بھی تھے
جو فقط لوح جاں پر لکھے رہ گئے

کشور ناہید پیدائش 1940 بلند شہر

پدرانہ نظام جبر کے خلاف مزاحمت کرنے والیوں میں کشور ناہید بھی ہیں۔ازدواجی الجھن، سماجی نابرابری، تنہائی، کشمکش عورت سے متعلق تمام مسائل کو انھوں نے اپنی شاعری میں بڑے طنز وتیکھے لب ولہجے میں بیان کیا ہے۔وہ بیوی اور شوہر کے رشتے کو حاکم ومحکوم کا نہیں، بلکہ دوستی، محبت، اور برابری کا رشتہ مانتی ہیں۔ان کا ماننا ہے کہ شوہر ایک دوست ایک ساتھی کی طرح ہونہ کی حاکم،وہ لکھتی ہے:

بھرتے ہیں جو شریک سفر ہم رہی کا دم
چلتے ہیں ساتھ ساتھ عناں گیر کی طرح
مرے لیے تجھے نیندوں کے پھول لانے تھے
یہ کیسا راتوں کو بخشا ہے رتجگا تو نے

کشور ناہید کی شاعری میں عورتوں پر ہورہے ظلم وجبر، حق تلفی، عورت کی نفسیات کو بڑی بے باکی سے بیان کیا گیا ہے۔ وہ لکھتی ہیں ہر دور میں عورتوں کا استحصال ہوتا رہا ہے، پہلے وہ گھر کی چہار دیواری میں بند کر کے گھر کی زینت سمجھی گئی،اور جب آزادی ملی تو پوسٹرں کی زینت بنادی گئی، ذمے داریوں کا بوجھ بھی دوگنا ہوگیا۔عورتوں کی اس آزادی سے متعلق ان کے اشعار میں مزاحمت، طنزیہ لب ولہجے کی کڑواہٹ پورے طور پرنظر آتی ہے:

بندھے ہیں پیٹ سے بچے بھی اور پیسے بھی
زمیں کی بیٹی کی تصویر دیکھتے جانا

وہ اپنی نظم 'میں کون ہوں' میں خواتین کی نمائش وسراپا اشتہار کے متعلق لکھتی ہیں:

پہلے تم نے میری شرم وحیا کی خوب تجارت کی تھی/ میری ممتا، میری وفا کے نام پہ خوب تجارت کی تھی
اب گودوں میں اور ذہنوں میں پھولوں کے کھلنے کا موسم ہے/ پوسٹروں پر نیم برہنہ
موزے بیچتی، جوتے بیچتی عورت میرا نام نہیں

کشور ناہید کی شاعری میں مشرقی عورت کی محکومیت، ماحول کے جبر، جذباتی کشمکش وغیرہ جیسے مسائل کا ذکر بڑی خوبی سے کیا گیا ہے۔ ان کی شاعری مشرقی خواتین کے حقوق کی

بازیافت اور معاشرے میں ان کی اہمیت پر توجہ بھی دلاتی ہے۔ کشور ناہید ایک طرف بے جا پابندیوں کے خلاف ہیں تو دوسری طرف آزادیٔ نسواں کے نام پر عورتوں کے ساتھ ہو رہے استحصال پر بھی انھیں رنج ہے۔ کشور ناہید کی شاعری کے متعلق ڈاکٹر آغا ظفر حسنین کی رائے بڑی معتبر ہے وہ لکھتے ہیں:

''......مغربی شاعری سے متاثر ہونے کے باوجود کشور ایک مشرقی عورت کے ذہن سے سوچتی ہیں اور اسی خصوصیت نے ان کے لب و لہجے کو انفرادیت بخشی ہے مگر ان کی احتجاجی آواز انفرادی ہوتے ہوئے بھی عمومی صداقتوں کی علمبردار ہے۔

(مزاحمت اور پاکستانی اردو شاعری: ڈاکٹر آغا ظفر حسنین، ص: 263)

کشور ناہید کے یہاں تانیثیت کے نام پر مغربی نام نہاد حقوق نسواں، آزادیٔ نسواں جیسے پرفریب نعروں کی اندھی تقلید نظر نہیں آتی ہے بلکہ وہ مشرقی خواتین کو پدرانہ نظام جبر سے آزادی تو دلانا چاہتی ہیں مگر مشرقی اقدار، روایات کی پاسداری کے ساتھ۔

فہمیدہ ریاض 1946 میرٹھ

فہمیدہ ریاض تانیثی شاعری کی ایک ایسی علم بردار ہیں جنھوں نے پدرانہ نظام جبر کے ساتھ ساتھ سیاسی، سماجی مسائل کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ فہمیدہ ریاض نے اپنی نظموں میں ایک طرف ایک دوشیزہ کے دل میں ابھرنے والی خواہشات، جذبات، امنگوں، شکایتوں کو موضوع بنایا ہے۔ تو دوسری طرف پدرانہ نظام جبر کے خلاف سماجی رسم ورواج پر برجستہ طنز بھی کیا ہے۔ عورت کا دل حساس اور جذبات سے مغلوب ہوتا ہے، خدا نے اس کے دل میں ممتا کی چاہت بھر دی ہے اس لیے وہ ہر فیصلہ دماغ کے بجائے دل سے کرتی ہے۔ عورت مرد کی بے وفائی کو سمجھتی ہے مگر خاموش رہتی ہے اور وفا کا دم بھرتی ہے۔ اس نظم میں فہمیدہ خواتین کو نصیحت کرتی نظر آتی ہیں:

وصال ہجر کی باتیں پرانے قصے ہیں/شکست دل تو بڑی عام سی کہانی ہے

نئے زمانے میں جذباتیت سے کام نہ لو/ وہ اک ذرا سی شرارت ہی کیا محبت تھی؟

مشرقی رسم ورواج اور اقدار سے وہ اس قدر نالاں ہیں کہ ازدواجی زندگی کو طوائف کی زندگی سے تشبیہ دیتی ہیں۔ ان کی نظم 'لمبے سفر کی منزل' ملاحظہ ہو:

شام کے پھیلتے دھندلکے میں
جانے کب سے کھڑے ہوئے ہیں ہم
سارے دن کی تھکن سے پژمردہ
کاوش بے حصول پر نادم
پشت پر زندگی کا بوجھ لیے
منتظر اپنے اپنے گاہک کے

فہمیدہ ریاض خواتین کی ذہنی، جسمانی اور نفسیاتی اذیت کے اظہار میں غم وغصے کے ساتھ ساتھ جارحانہ اور طنزیہ لب ولہجہ اختیار کر لیتی ہیں۔ وہ چاہتی ہیں عورت کو صرف اس کی جسمانی ساخت سے نہ پہچانا جائے بلکہ اس کے وجود وشناخت کو بھی تسلیم کیا جائے۔ اس کو گڑیا نہ سمجھا جائے بلکہ گوشت پوست کا ایسا انسان سمجھا جائے جس میں ایک دل بھی ہے اور اس دل میں جذبات، احساسات، خواہشات بھی موجود ہیں۔ ان کی نظموں میں مشرقی عورتوں کے مسائل کے ساتھ سیاسی، سماجی معاملات اور ہندو پاک کی تقسیم کے حالات اور پاکستانی معاشرے میں عورتوں کے ساتھ ہو رہے استحصال کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔

فہمیدہ ریاض کی بعض نظموں میں تانیثی نقطہ نظر کی ترسیل وتبلیغ اتنے پرتشدد لہجے میں کی گئی ہے، کہ لہجے کی تلخی جانب داری اور جارحانہ لب ولہجے کی گواہی دینے لگتی ہے۔ جب کہ

فہمیدہ ریاض تانیثی شاعری کی ایک ایسی علم بردار ہیں جنھوں نے پدرانہ نظام جبر کے ساتھ ساتھ سیاسی، سماجی مسائل کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ فہمیدہ ریاض نے اپنی نظموں میں ایک طرف ایک دوشیزہ کے دل میں ابھرنے والی خواہشات، جذبات، امنگوں، شکایتوں کو موضوع بنایا ہے۔ تو دوسری طرف پدرانہ نظام جبر کے خلاف سماجی رسم ورواج پر برجستہ طنز بھی کیا ہے۔ عورت کا دل حساس اور جذبات سے مغلوب ہوتا ہے، خدا نے اس کے دل میں ممتا کی چاہت بھر دی ہے اس لیے وہ ہر فیصلہ دماغ کے بجائے دل سے کرتی ہے۔

جارحیت پسندی اور شدت پسندی ادبی تحریروں کے لیے سقم کا باعث سمجھی جاتی ہے۔

پروین شاکر پیدائش 1952 کراچی

پروین شاکر اردو شاعری میں منفرد لب ولہجہ، آہنگ کے لیے پہچانی جاتی ہیں۔ ان کی شاعری خواتین کے لطیف جذبات، نفسیات کی بہترین عکاس ہے۔ موضوع وہی پرانا لیکن انداز بیان بالکل جدا اور انوکھا ہے۔ ان کا پہلا مجموعہ 'خوشبو' میں کنواری اور نوعمر لڑکیوں کے عشقیہ جذبات کی بہترین عکاسی کی گئی ہے، عورت کی چھوٹی چھوٹی خواہشوں، محرومیوں، جیسے بہت سے تجربوں کو بڑے فنکارانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ پروین شاکر کو زبان وبیان پر بڑی قدرت حاصل ہے۔ اسی لیے وہ معمولی خیالات اور تجربات کو اتنی خوبصورتی سے بیان کرتی ہیں کہ شاعری کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے۔ 'خوشبو' میں بیان کیے گئے زیادہ تر اشعار میں عورت کے عشقیہ جذبات، ناپختگی، خودسپردگی، بےبسی، اور خوداعتمادی وغیرہ جیسے جذبات کی عکاسی کی گئی ہے۔ بطور مثال چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

سب ضدیں اس کی کروں پوری ہر اک بات سنوں
ایک بچے کی طرح پھر اسے ہنستا دیکھوں
دل اسے چاہے جسے عقل نہیں چاہتی ہے
خانہ جنگی ہے عجب ذہن و بدن میں اب کے
تجھ کو کھو کر بھی رہوں 'خلوت جاں میں تیری
جیت پائی ہے محبت نے عجب مات کے ساتھ
میں سچ کہوں گی، مگر پھر بھی ہار جاؤں گی
وہ جھوٹ بولے گا، اور لاجواب کر دے گا
وہ میرے پاؤں کو چھونے جھکا تھا جس لمحے
جو مانگتا اسے دیتی، امیر ایسی تھی
تجھے مناؤں کہ اپنی انا کی بات سنوں
الجھ رہا ہے مرے فیصلوں کا ریشم بھی

پروین شاکر کا پہلا مجموعہ 'خوشبو' نوعمر لڑکیوں کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے، لیکن اس کے بعد کے سارے مجموعوں میں نسائی فکر اور نفسیاتی تجربات میں پختگی آتی گئی، اور ان کی نظموں کا لب ولہجہ مزاحمتی ہو کر انکار کی منزل تک جا پہنچا۔ عورت کو درپیش مسائل ان کی نظموں کے موضوع بنتے گئے۔ پدری نظام جبر کے تحت متوسط طبقے کی پڑھی لکھی اور گھریلو عورت کے ساتھ ہو رہے استحصال کو انھوں نے اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ ان کی نظم 'بشیرے کی گھر والی' میں عورت کی کیا حقیقت ہے، اس کے وجود کو صرف ایک ایسی مشین سمجھا جاتا ہے جو جذبات وخواہشات سے عاری ہے۔ جسے ہر مرد اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرنا چاہتا ہے۔ اس نظم سے چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

ہے رے تیری کیا اوقات!
دودھ پلانے والے جانوروں میں
اے سب سے کم اوقات
پرش کی پسلی سے تو تیرا جنم ہوا
اور ہمیشہ پیروں میں تو پہنی گئی
سولھواں لگتے ہی/ ایک مرد نے اپنے من کا بوجھ
دوسرے مرد کے تن پہ اتار دیا
بس گھر اور مالک بدلا/ تیری چاکری وہی رہی/
بلکہ کچھ اور زیادہ/ اب تیرے ذمے شامل تھا

روٹی کھلانے والے کو/ رات گئے خوش بھی کرنا/
اور ہر ساون گابھن ہونا
پورے دنوں سے گھر کا کام سنبھالتی رہی/
پتی کا ساتھ/ بس بستر تک/ آگے تیرا کام
کیسی نوکری ہے/ جس میں کوئی دیہاڑی نہیں
جس میں کوئی چھٹی نہیں
کن کرموں کا پھل ہے تو/ تن بیچے تو کسبی ٹھہرے
من کا سودا کرے اور پتنی کہلائے
ایک نوالہ روٹی/ ایک کٹورے پانی کی خاطر
دیتی رہے گی کب تک تو بلیدان

پروین شاکر کی یہ نظم متوسط طبقے کی عورت کا المیہ ہے۔ ان کی نظموں میں کوئی نظریہ وفلسفہ نہیں ہے، پھر بھی ان کی شاعری میں متوسط طبقے کی خواتین کی نفسیات، جذبات اور تاثرات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ ان کی نظمیں ذاتی تجربات ومشاہدات کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں، اسی لیے حقائق اور فطرت سے قریب نظر آتی ہیں۔
پروین شاکر کی نظموں کے متعلق آغا ظفر حسنین لکھتے ہیں:

''پدری جبر کے حوالے سے پروین کی نظموں کے سلسلے میں مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان میں متوسط طبقے کی ایک تعلیم یافتہ گھریلو قسم کی عورت کی گھٹن کا اظہار ہوا ہے۔ ایک دو نظموں سے قطع نظر ان کے موضوعات کا دائرہ بہت محدود ہے۔ پاکستان کے مخصوص حالات کو بھی کسی نظم کا موضوع نہیں بنایا گیا ہے لیکن اس کے باوجود پروین کی شاعری نہایت powerful ہے اور اس کی سب سے بڑی وجہ میرے نزدیک ان کے لب ولہجے کا فطری پن ہے۔''

(مزاحمت اور پاکستانی اردو شاعری: ڈاکٹر آغا ظفر حسنین: ص: 291)

سارہ شگفتہ پیدائش 1954

سارہ شگفتہ کی شاعری میں پدری نظام جبر کے خلاف احتجاج بڑے شدومد سے کیا گیا ہے۔ ان کی نظموں میں خواتین سے متعلق مختلف مسائل کو بیان کیا گیا ہے۔ ان کی شاعری ایک بے بس، خوف زدہ اور زندگی سے بے زار عورت کا المیہ ہے۔ دراصل ان کی پوری زندگی ناامیدیوں، محرومیوں، اذیتوں میں گزری، خوشگوار زندگی ان کو میسر نہ آسکی۔ شاید اسی لیے ان کا کلام ان کی زندگی کا ترجمان معلوم ہوتا ہے۔ ان کی نظموں سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات، حادثات، تجربات، مشاہدات کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ سارہ شگفتہ کی زندگی نے اس کو اس قدر تکلیف دی کہ وہ برداشت نہ کرسکی اور اپنے ہی ہاتھوں اسے ختم کرلیا۔ ان کے دردوغم کا اندازہ ان کی نظموں سے کیا جاسکتا ہے۔ مثال کے لیے ان کی نظم 'عورت اور نمک' اور 'شیلی بیٹی کے نام' کا کچھ حصہ پیش کیا جاتا ہے:

عزت کی بہت سی قسمیں ہیں/ گھونگھٹ، تھپڑ، گندم/
عزت کے تابوت میں قید کی میخیں ٹھونکی گئی ہیں
گھر سے لے کر فٹ پاتھ تک ہمارا نہیں
عزت ہمارے گزارے کی بات ہے
عزت کے نیزے سے ہمیں داغا جاتا ہے
عزت کی کنی ہماری زبان سے شروع ہوتی ہے
کوئی رات ہمارا نمک چکھ لے
تو ایک زندگی ہمیں بے ذائقہ روٹی کہا جاتا ہے

ان کی نظموں میں عورت کی حیثیت کو بتانے کی کوشش کی گئی ہے۔ عورت صرف مردوں کے عیش وعشرت اور جنسی بھوک مٹانے کا ذریعہ سمجھی جاتی ہے۔ اگر اس کی عزت محفوظ نہ رہ سکی تو وہ ایک بے ذائقہ چیز بن جاتی ہے جس کی کوئی اہمیت نہیں۔
سارہ نے اس کرب کو کتنے پردرد الفاظ میں بیان کیا ہے:

تجھے جب بھی کوئی دکھ دے
اس دکھ کا نام بیٹی رکھنا/ جب میرے سفید بال

زاہدہ زیدی شاعرہ کے علاوہ ایک نقاد بھی تھیں۔ زاہدہ زیدی اپنی شاعری کو مروجہ تانیثی اصطلاح تانیثیت سے الگ مانتی ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ فن کی حد بندی سے اس کی عظمت کم ہوجاتی ہے۔ اور اعلیٰ شاعری تانیثیت سے بہت آگے کی چیز ہے۔ اس لیے انھوں نے کبھی کسی نظریے کو اپنی شاعری کا موضوع نہیں بنایا اس لیے ان کی شاعری میں تجربات ومشاہدات کے ساتھ ساتھ وجدانی اور داخلی شعور کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ مشرق ومغرب کا حسین امتزاج بھی ان کے کلام میں دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ سائنسی نظریات وخیالات کو بھی انھوں نے شعری لبادہ عطا کردیا ہے۔ انسانیت کی فلاح وبقا ان کی شاعری میں بنیادی کردار کے طور پر نظر آتے ہیں۔

تیرے گالوں پر آن ہنسیں، رو لینا
میرے خواب کے دکھ پہ سو لینا/ جن کھیتوں کو ابھی اگنا ہے
ان کھیتوں میں/ میں دیکھتی ہوں تیری انگیا بھی
بس پہلی بار ڈری بیٹی/ میں کتنی بار ڈری بیٹی
ابھی پیڑوں میں چھپے تیرے کمان ہیں بیٹی/
میرا جنم تو ہے بیٹی/ اور تیرا جنم تیری بیٹی
تجھے نہلانے کی خواہش میں/
میری پوریں خون تھوکتی ہیں

اس نظم میں ایک عورت کی بیچارگی اس کی بے بسی اور اپنی بیٹی کی آنے والی زندگی سے خوف زدہ ہے کہ اس کے ساتھ بھی وہی ظلم وجبر ہونے والا ہے جو اس کے ساتھ ہوا۔ اسی طرح ان کی سبھی نظموں میں مایوسی اور حرماں نصیبی کی فضا طاری ہے۔

زاہدہ زیدی پیدائش 1924

زاہدہ زیدی شاعرہ کے علاوہ ایک نقاد بھی تھیں۔ زاہدہ زیدی اپنی شاعری کو مروجہ تانیثی اصطلاح تانیثیت سے الگ مانتی ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ فن کی حد بندی سے اس کی عظمت کم ہوجاتی ہے۔ اور اعلیٰ شاعری تانیثیت سے بہت آگے کی چیز ہے۔ اس لیے انھوں نے کبھی کسی نظریے کو اپنی شاعری کا موضوع نہیں بنایا اس لیے ان کی شاعری میں تجربات ومشاہدات کے ساتھ ساتھ وجدانی اور داخلی شعور کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ مشرق ومغرب کا حسین امتزاج بھی ان کے کلام میں دیکھنے کو مل جاتا ہے۔ سائنسی نظریات وخیالات کو بھی انھوں نے شعری لبادہ عطا کردیا ہے۔ انسانیت کی فلاح وبقا ان کی شاعری میں بنیادی کردار کے طور پر نظر آتے ہیں۔ تخیل اور قوت مشاہدہ کو بہ روئے کار لاکر انھوں نے اپنے تجربات کو ڈرامائی انداز میں پیش کیا ہے۔ ظلم وجبر کی مذمت اور مظلوم کی حمایت کا رجحان بہت واضح طور پر ان کی شاعری میں نظر آتا ہے۔ زاہدہ زیدی کی نظموں میں وقت اور فطرت کو کلیدی حیثیت حاصل ہے۔ علامت واستعاروں کے نادر استعمال کے ساتھ ساتھ ان کے اشعار میں نغمگی اور شیرینی بھی موجود ہے۔ فطری مناظر کی عکاسی وہ بڑی چابکدستی سے کرتی ہیں:

تخیل کا در کھولے ہوئے شام کھڑی ہے
گویا کوئی تصویر خیالوں میں جڑی ہے
تہذیب الم کہیے کہ عرفان غم ذات
کہنے کو تو دو لفظ ہیں پر بات بڑی ہے
سایہ ہو شجر کا تو کہیں بیٹھ کے دم لیں
منزل تو بہت دور ہے اور دھوپ کڑی ہے
ہم اور خدا کا بھی یہ احسان اٹھاتے
انسان ہیں کچھ ایسی ہی بات آن پڑی ہے

مارا ہمیں اس دور کی آساں طلبی نے
کچھ اور تھے اس دور میں جینے کے طریقے
ماضی کے مزاروں کی طرف سوچ کے بڑھنا
ہو جاؤ گے مایوس نہ کھودو یہ دفینے
ہر بزم سخن جھوٹے نگینوں کی نمائش
سرتاج سخن تھے جو کہاں ہیں وہ نگینے

■

Fauzia Khanam C/o,Dr. Mohd Ali Jauhar, Dept of Urdu Muslim University Aligarh - 202002 (UP)

کور اسٹوری

اردو ادب میں تانیثیت

شیخ شبانہ بانو

خواتین فطرتاً قصہ گو ہوتی ہیں اپنے بچوں کو اصلی یا فرضی قصے کہانیاں سنانا، شعروں کو لوریوں کی مدھم دھنوں میں سمو کر دھیرے دھیرے بچوں کو گا کر سلانا یعنی لوریاں گانا۔ دُنیا کی ہر عورت کا خواہ وہ کسی بھی خطے کسی ملک سے تعلق رکھتی ہو محبوب مشغلہ ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے ہر عورت کو ایک فطری کہانی کار یا شاعرہ تسلیم کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اسی لیے غالباً عورت کو ام القصص بتایا گیا ہے۔ بارھویں صدی کے آخری دور میں مسلم حکومت کے قیام کے زمانے میں مسلمان عورت کی حالت ہندو عورت کی بہ نسبت اس لیے بہتر تھی کہ اس کا تعلق فاتح اور حکمران قوم سے تھا۔ لیکن آہستہ آہستہ مسلمان بھی ہندو معاشرے سے متاثر ہوتے گئے اور عورتوں کے ساتھ ان کا رویہ بھی اس سے مختلف نہ رہا جو اس زمانے کے ہندو سماج میں رائج تھا چنانچہ مسلمان عورت کا سماجی رتبہ بھی بتدریج کم ہوتا گیا۔ لہٰذا مغل حکمرانوں کے آخری دور میں اس کی حالت بھی اپنی ہندو بہنوں جیسی ہوگئی۔ دہلی کا سیاسی زوال مسلمانوں کی اخلاقی پستی کا باعث بنا۔ اور اسی عہد میں عیاشی کا رجحان بڑھا جس کی وجہ سے مسلم معاشرے میں خرابیاں پھیلنے لگیں۔ اس عہد کی اخلاقی پستی ہی کی بدولت عورت کو اس کے بنیادی حقوق سے محروم کردیا گیا۔ اس طرح اس کی حیثیت اور بھی پست ہو گئی۔ بقولِ شبنم آرا وہ محض 'ناموس خاندان تھی'۔

عورت کی غلامی و تابع داری کو رومانس کے قصے اور کہانیوں نے اور بھی زیادہ سنگین بنا دیا تھا گو کہ آج حالات کچھ اور ہیں مگر اس طرح عورت مزید استحصال کی شکار بنتی گئی عورت اور مرد کے رشتوں کے درمیان نرمی خلوص و محبت اور ہمدردی رفتہ رفتہ پژمردہ ہونے لگی۔ عورت کی آزادی کے حق میں مردوں کی بالادستی والے سماج کی پابندیاں اور تیزی سے بدلتے ہوئے حالات میں اسے ایک زندہ اور فعال صنف کے طور پر قبول کرنے کا سوال اٹھا اور اس بیداری کے طفیل میں اس کے حقوق کو سمجھنے کی کوششیں شروع ہوئیں۔ امریکہ اور برطانیہ کی پہلی جدوجہد رفتہ رفتہ پورے مغرب اور پھر مشرق میں بھی پھیل گئی اسی جدوجہد نے عورتوں میں بیداری پیدا کی اور اس طرح 'تانیثی تحریک' وجود میں آئی۔

خواتین کی بہ نسبت ادیبوں نے بھی عورت کے تصوّر، اس کے مقام اور اس کی حیثیت کو اپنے افسانوں، ناولوں کے مضامین میں جگہ دی ہے جن میں راجندر سنگھ بیدی، پریم چند، نظیر احمد، سرشار، شرر، رسوا، راشد الخیری وغیرہ نے عورت کے کردار کو اپنے مخصوص انداز میں تخلیق کیا ہے ان مصنفین کے کردار میں عورت کا کردار مرکزیت کی حیثیت رکھتا ہے یہ عورت بہن، بیٹی اور ماں ہے جس کے دم سے سماج کے دوسرے رشتے ناطے جڑے ہیں ان کے مضامین کو پڑھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان مصنفوں کو عورت کی نفسیات سے گہری واقفیت تھی اسی لیے عورت کی زندگی کا سارا دن ان کی خوشیوں، محرومیوں، کمزوریوں اور مظلومیت و مجبوری کو اس کی نفسیاتی ذہنی الجھنوں کو جذبۂ نفرت و محبت، اور زندگی سے لگاؤ اور اسے زندہ رہنے کی تمنّا کو اپنے مضامین میں پیش کر کے عورتوں کی تئیں عام انسان کے دل میں ہمدردی اور رحم دلی پیدا کرنے کی کامیاب کوششیں کی ہے۔ اب ہم تانیثی تحرک و ادب کا سرسری جائزہ لیں گے کہ کس طرح تانیثی تحریک نے اپنا سر ابھارا اور کہاں سے اس کی ابتدا ہوئی۔

'تانیثی تحریک' حق اور برابری کے لیے ہی آواز نہیں اٹھاتی بلکہ رشتے میں پائیداری اور استحکام بھی پیدا کرتی ہے۔ نیز پیار و محبت، دوستی، جنسیت کے بارے میں بھی یہ تحریک عصمت فروشی، دشنام طرازی، نا قابلِ تولد ہونا، خاندانی منصوبہ بندی، مانع حمل، اسقاط حمل کے مسائل کے خلاف آواز بلند کرتی ہے۔ بچّے کی پرورش کے متعلق بھی مطالبہ کرتی ہے جس کی بدولت آج کی جدید عورت اپنی شناخت کی جستجو میں اپنے آپ کو مرد سے الگ ایک مکمل شخصیت کی روپ میں دیکھنے لگی ہے۔

عورت کو معاشرہ جس آنکھ سے دیکھ رہا ہے اور وہ خود اپنی آنکھ سے معاشرے کو دیکھتی ہے اسے ایک دوسرے سے آمیز کرتی ہے ان تمام کیفیات سے ہمارا ادب اور سماج کا دامن خالی تھا اس وحدتِ احساس نے عورت کو معاشی طور پر خود کفیل بننے کا ذریعہ تلاش کرنے کی ترغیب دی اور اس نے سماج کے بنائے ہوئے فرسودہ خیالات اور قدروں کے پھندے کو باہر نکال دیا۔

ہندوستان میں گرچہ مغربی ممالک کی طرح تانیثیت کا منشور تیار نہیں تھا لیکن اُردو ادب، تہذیب اور سماج کے حوالے سے تانیثی تحریک کو سمجھنے کی کوشش آٹے میں نمک کے برابر کہی جا سکتی ہے۔ جو ہندوستانی عورتوں کے نت نئے مسائل کا حل اور اس میں بیداری پیدا کر کے اس کے تئیں ظلم و استحصال کا خاتمہ کیا جا سکے۔ تانیثیت کے مفاہیم اور تصورات کے تئیں دانشورانِ ادب میں خاصا اختلاف پایا گیا ہے اور اب تک تانیثیت Feminism کی حتمی تعریف نہیں بیان کی گئی۔

تانیثیت کیا ھے ؟(Feminism)

انسائیکلو پیڈیا آف سوشیالوجی میں 'تانیثیت' کی تعریف اس طرح بیان کی گئی ہے:

"Feminism a movement that attempts to institute social, economic and political equality between men and women in society and end distortion in the relationship between men and women"

یعنی 'تانیثیت' ایک ایسی تحریک ہے جو سماج میں عورت و مرد کے درمیان سماجی، سیاسی اور اقتصادی برابری کرنے کی کوشش کرتی ہے اور مرد و عورت کے رشتوں کے درمیان موجود امتیازات کو ختم کرنا چاہتی ہے۔ جنوبی ایشیا کے ایک اہم ادارے انسٹی ٹیوٹ آف

سوشل اسٹڈیز Institute of Social Studies میں تیسری دُنیا کی عورتوں کے ایک گروپ نے 'تانیثیت' کے مسائل پر گفتگو کرتے ہوئے اس کی تعریف ان الفاظ میں بیان کی ہے:

"To ment an awareness of women's oppression and exploitation within the family,at work and in society and conscious action by women and men to change thissituation"

'تانیثیت' کے مفہوم کو محض سماجی، سیاسی اور اقتصادی برابری تک ہی محدود نہیں رکھا گیا بلکہ خاندان کے اندر، کام کرنے کی جگہوں نیز سماج میں عورتوں پر ہو رہے ظلم و استحصال کے خلاف ایک مہم کی تبلیغ پر زور دیا گیا ہے تا کہ اس کے ذریعے عورت و مرد موجودہ حالات کے خلاف مثبت اقدام کرسکیں۔ گویا برابری کے حقوق کے ساتھ ساتھ قانونی اصلاح کو بھی اس احتجاجی مہم میں شامل کیا گیا ہے تا کہ عورتوں کے ساتھ جاری حق تلفی کو ختم کیا جا سکے دیویندر اسر نے بھی 'تانیثیت' سے متعلق کچھ اس طرح اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے!! اقتباس:

'تانیثیت' ایک ایسی اصطلاح ہے جس کے مخصوص معنی متعین کرنا ممکن نہیں مرد غالب معاشرہ اور پدری نظام سے لے کر معاشی استحصال، جنسی جبر اور دہشت تک، غیر مساوی حقوق، سماجی و ناہمواری قانونی عدم تحفظ، متضاد (منافقانہ) اخلاقی اقدار اور فرسودہ خاندانی/ ازدواجی رشتوں سے لے کر کاروبار اور سیاسی اقتدار تک اوران سب کے مرکز میں تشخص کا مسئلہ جو ایسا محور ہے جس کے گرد سارے مسائل مسلسل گردش کرتے رہے ہیں۔''

تانیثی تحریک کے علمبرداروں نے مندرجہ بالا گھسے پٹے خیالات و نظریات کا بائیکاٹ کیا بقول پروفیسر عتیق اللہ:

''تانیثی نقادوں نے پرانے بھرم توڑے اور یہ بتایا کہ دراصل عورت کے تعلق سے جو تصورات ہم تک پہنچے ہیں وہ تمام کے تمام مرداساس معاشرے کا یقینی نتیجہ ہیں۔ ان کی تشکیل کے پس پشت وہ تذکیری رویہ برسرِ کار رہا ہے جس نے ہمیشہ ایک دوسرے پر فوقیت دی ہے، خواہ اس فوقیت کی بنیاد کتنی ہی غیر منطقی، غیر عقلی، رسمیاتی اور مفروضیاتی ہی کیوں نہ ہو ان مصنّفین نے یہ بھی ثابت کیا کہ تاریخی طور پر مرد اپنے محفوظ تصورات کا اطلاق عورت پر کرتا آرہا ہے یہی نہیں بلکہ اس نے ہمیشہ کچھ نئے جواز بھی فراہم کیے ہیں، ان جوازوں میں بیش تر اخلاقی، صنفی و عضویاتی ہیں کہ طبعاً عورت ایک کم تر مخلوق ہے۔''

تانیثیت کی قسمیں اس طرح متعین کی گئی ہیں:

(1) شدت پسند تانیثیت: Radical Feminism

(2) سماجی تانیثیت Socialist Feminism

(3) ترقی پسند تانیثیت: Progressive Feminism

(4) سیاہ فام تانیثیت: Black Feminism

(5) ہم جنس تانیثیت: Lesbian Feminism

(6) تحلیل نفسی پر مبنی تانیثیت: Psychoanalytic Feminism

(7) جدید تانیثیت: Modern Feminism

جدید تانیثیت کو سائنسی ایجادات کی کامیابی کا نتیجہ مانا جاتا ہے کیوں کہ سائنس نے تعصب سے پاک نتائج اخذ کیے روشن خیال سوشلسٹ، مارکسی اور شدت پسند تمام رجحانات نے جدیدیت اور اس کی بیداری سے اتفاق کیا ہے یعنی جدیدیت سائنسی غیر جانبداری کا ایجنڈا ہے جسے جدید مغربی نظریات جھٹلا نہیں سکتے۔ لیکن برعکس اس کے مغرب میں ایک نیا تصور وجود میں آیا جس نے سائنس کو بھی جنسی تعصب پر مبنی قرار دیا ہے کیونکہ سائنس و ٹیکنالوجی کی تحقیقات اور ان کے نتائج کی تعبیر کا اختیار ہمیشہ مردوں ہی کے ہاتھ میں رہا ہے اس لیے انھوں نے عورت و مرد کو طاقتور اور کمزور، زبردست اور زیردست کے دھاگے میں باندھ دیا ہے۔ اس طرح سائنس کا مرکز ومحور دو شاخوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ جہاں ذہن بمقابلہ دلیل بمقابلہ جذبات، معروضیت بمقابلہ موزونیت، باہم متصادم ہیں۔ اس سلسلے میں کہا گیا کہ ان دونوں میں پہلے والے نے دوسرے پر فوقیت حاصل کی ہے۔

(8) ثنویت پر مبنی تانیثیت:۔ Dual System Feminism

(9) مادیت پرست تانیثیت:۔ Materialist Feminism

اُردو ادب میں تانیثیت کی روایت:

اگر ہم اُردو ادب میں تانیثیت کی روایت کا جائزہ لیں تو ہمیں یہ پتہ چلے گا کہ زمانۂ قدیم سے ہی عورت پدری سماج کے لیے ایک متنازعہ فیہ اور مسائل سے لبریز جنس رہی ہے۔ ہر مذہب میں عورتوں کی تہذیب، اس کی آزادی اور اس پر عائد پابندیوں کے بارے میں خوب خوب لکھا گیا ہے۔ ہر دور کے معاشرے نے اپنے اپنے مزاج، ذوق اور رواج کی مناسبت سے عورت کو قبول بھی کیا ہے اور اسے نظر انداز بھی کیا ہے۔ یہاں تک کہ ہر دور کے دانشوروں اور فلسفیوں نے اپنے اپنے علم و تجربات کی روشنی میں عورت کے بارے میں اپنی اپنی آرا پیش کیں۔ بعض نے اس کی حمایت کی اور بعض نے اس کی مخالفت بھی کی غرض کہ ہر دور میں عورتوں کی حمایت اور مخالفت میں آوازیں بلند ہوتی رہیں اور عورت اتحاد واختلاف کے مابین پستی میں ہوتی نکھرتی اور کبھی اپنے وجود وشناخت پر نازاں ہوتی رہی کبھی آنسو بہاتی تو کبھی مردوں کے عتاب کا شکار ہوتی۔ یہ عورت ہی تھی جس کو کبھی دیوی کا درجہ دیا گیا تو کبھی طوائف بننے پر مجبور کیا گیا، کبھی اسے جنت کی بشارت دی گئی تو کبھی اسے جنت سے نکالا بھی گیا۔ بقول شہناز نبی!!!

''ہندوستانی ادب میں عورتوں کے کچھ کردار تو جوں کے توں پیش کیے گئے ہیں یعنی سماج کے چلتے پھرتے کردار اور کچھ ایسے جیسا کہ مردادیبوں کی تمنا تھی وہ کالی داس کی شکنتلا ہو یا علی عباس حسینی کی صابرہ انتظار اس کا مقدر ہے۔ قسمت پر صابر وشاکر رہنا اس کی نمایاں صفت اور خدمت گذار اور فرماں بردار ہونا اس کی ایڈیشنل کوالیفیکشن۔ اُردو ادب ہندوستانی سماج کا پروردہ تھا لیکن ایرانی تہذیب کی خوبوُاس میں عرصے تک موجود رہی۔ اُردو کی قدیم داستانیں نسوانی کرداروں سے بھری پڑی ہیں۔ ان میں عورتیں بھی ہیں اور عورت نما مرد بھی یعنی ایک طرف شہزادیاں، پریاں، خادمائیں، کٹنیاں، جادوگرنیاں وغیرہ ہیں تو دوسری طرف خواجہ سرا ہیں جن کے ناز وانداز عورتوں والے ہیں، جب علی گڑھ تحریک چلی اور سرسیّد اور ان کے رفقا نے سماج کو بدلنے کا بیڑا اٹھایا تو سماج کی اصلاح کے لیے ادب کو ایک ذریعہ بنایا گیا۔''

بقول قمر رئیس:

''اب تک اُردو افسانے میں جو ناگفتنی تھی، گھریلو بول چال کی اس زبان کے سہارے رشید جہاں نے اسے گفتنی بنا دیا۔ ان کے فن کا کمال اس میں ہے کہ قاری کو احساس بھی نہیں ہوتا کہ افسانوں کے ذریعے پردوں کے اندر رہنے والی ایک ایسی محدود دُنیا کی وسعتوں کی سیر کر رہا ہے جس سے اُردو افسانے کا دامن تقریباً خالی ہے بعد میں اسی روایت کو عصمت چغتائی، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور، صدیقہ بیگم، رضیہ سجاد ظہیر اور دوسری افسانہ نگار خاتون نے آگے بڑھایا۔ لیکن اس میدان میں رشید جہاں بہر حال ان کی پیش رو کہی جائیں گی۔''

عصمت چغتائی نے ڈاکٹر رشید جہاں سے دو قدم آگے بڑھ کر حقیقت نگاری کے ایک نئے باب کا آغاز کیا۔ ان کے فکر وفن کی عظمت کا راز ان کی بے ریا اور بے باک حقیقت نگاری ہے جس کے ذریعے عورت پہلی مرتبہ اپنے احساسات و جذبات، فطرت ونفسیات اور حقیقی

رنگ وروپ میں اس طرح ڈھل کر منظرِ عام پر آتی ہے کہ صرف مرد ہی کو نہیں بلکہ عورت کو بھی تعجب ہوتا ہے کہ اس کا حقیقی روپ کیا ہے۔ جس کی تفہیم سے وہ اب تک محروم رہی تھی۔ قرۃ العین حیدر، جمیلہ ہاشمی، رضیہ فصیح احمد، خدیجہ مستور، جیلانی بانو، بانو قدسیہ، صغرا مہدی اور دیگر خواتین نے بھی اپنی تخلیقات کے ذریعے ہم عصر معاشرہ، پدرانہ سماج کو محکوم و کمزور بنادیا ہے۔ ان ادیبوں نے عورت کی مجبوریوں، لاچاریوں اور سماجی، سیاسی اور معاشی حیثیت کو بے باکی کے ساتھ اجاگر کیا اور ظلم و ناانصافی کے خلاف احتجاج کی آواز بلند کی۔ ان ادیبوں کے نسوانی کردار سماج، مذہب اور مردوں کے استحصال کو خاموشی سے برداشت نہیں کرتے۔ وہ تیکھا سماجی شعور رکھتے ہیں۔ اور اپنے انسانی حقوق سے باخبر ہیں۔ وہ اپنے ناولوں اور افسانوں کے نسوانی کرداروں کو بھی ان پرفریب حربوں سے روشناس کراتی ہیں جن کے تحت مرد اسے اپنی لونڈی بنا کر رکھنا چاہتے ہیں یا اسے حسن فروشی پر مجبور کرتے ہیں۔ ان فنکاروں نے عورتوں کی آزادی و خود مختاری کو نہ صرف خانہ داری تک محدود رکھا بلکہ ان میں سے اکثر اپنی دُنیا آپ پیدا کرتے ہیں۔ وہ اپنے عمل کے خود ذمے دار ہیں اور اپنی ذات کا اپنے طور پر اثبات کرتے ہیں۔ اس کی بہترین عکاسی ہمیں ان کی تخلیقات میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ منٹو نے عورتوں کے ان مسائل کو اپنے افسانے کا موضوع بنایا جسے سماج میں دھتکارا جاتا ہے۔ بقول جیلانی بانو!!!

''منٹو اپنے افسانوں میں اپنے جسم کا سودا کرنے والی ایسی عورتیں بھی دکھاتے ہیں جو اپنے خریدار کو بن مانگے اپنی ممتا دینے کو بھی تیار ہیں۔ میرا نام رادھا، کالی شلوار، موذیل، بابو گوپی ناتھ، سوگندھی اور منٹو کی بہت سی کہانیوں میں عورت مرد کی زندگی اور خودغرضی کے آگے اپنی بے لوث محبت کے ساتھ شکست کھاتی ہے۔''

رضیہ فصیح احمد نے بھی مردانہ بالادستی اور پدرانہ اقدار و معیار پر بڑے ہی تیکھے وار کیے جو عورتوں کو ایک کنویں کا مینڈک بنا دیتے ہیں۔ ان کا ایک اہم کارنامہ 'جب پھوپھی کھوئی گئی تھی' ہے۔ اس کہانی میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ زمانہ قدیم سے عورت کو خصوصاً بوڑھی یا ادھیڑ جاہل پردہ نشین عورتوں کو دراصل مال و اسباب کی طرح بے جان اور مجہول شے سمجھا جاتا رہا ہے جمیلہ ہاشمی نے اپنے افسانوں میں اس عورت کو پیش کیا ہے جو زندگی میں سب کچھ ہارنے کے بعد تلخ ماضی کے سہارے زندہ رہنے پر مجبور ہے۔

ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، ممتاز شیریں کے افسانوں میں ایسی عورت آئی جو گھر کی چہار دیواری سے نکل کر فرسودہ رسم و رواج سے اپنے آپ کو آزاد کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ واجدہ تبسم نے حیدرآباد کے جاگیردارانہ نظام میں حویلیوں اور کوٹھیوں میں زندگی بسر کرنے والی ماماؤں اور خادماؤں کے جنسی استحصال کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا جوان کے مالکان کے ہاتھوں ہوتا رہا ہے۔ ان میں سے اکثر کہانیاں موثر ہیں جیسے 'اُترن' وغیرہ۔ قرۃ العین حیدر کے ناولوں اور اکثر افسانوں کا موضوع عورت ہے۔ کچھ اس کی دائمی مجبوریاں ہیں اور کچھ مردانہ سماج کے ہاتھوں اس کا جبر واستحصال بقول مصنفہ!!!

''عورتیں اتنی پرستار اتنی پجارنیں کیوں ہوتی ہیں؟ اس لیے کہ وہ کمزور ہیں اور سہارے کی حاجت مند ہیں۔ اس لیے کہ وہ اس مختصر زندگی میں بہت سے لوگوں سے زیادہ محبت کرتی ہیں۔ باپ بھائی، شوہر اولاد پوتے نواسے ان سب کے تحفظ اور ان کی سلامتی کے لیے فکرمند رہتی ہیں۔ شوہر یا محبوب کے پیار اور محبت کی ضمانت کسی اَن دیکھی طاقت سے چاہتی ہیں؟ اپنے بچوں کے مستقبل کے لیے ہراساں رہتی ہیں؟ آخر عورتیں خدا کی اس قدر ضرورت مند کیوں ہیں؟ عورتیں کمزور ہیں؟''

ان ادیبوں نے عورت کی مجبوریوں، لاچاریوں اور سماجی، سیاسی اور معاشی حیثیت کو بے باکی کے ساتھ اجاگر کیا اور ظلم و نا انصافی کے خلاف احتجاج کی آواز بلند کی۔ ان ادیبوں کے نسوانی کردار سماج، مذہب اور مردوں کے استحصال کو خاموشی سے برداشت نہیں کرتے۔ وہ تیکھا سماجی شعور رکھتے ہیں۔ اور اپنے انسانی حقوق سے باخبر ہیں۔ وہ اپنے ناولوں اور افسانوں کے نسوانی کرداروں کو بھی ان پرفریب حربوں سے روشناس کراتی ہیں جن کے تحت مرد اسے اپنی لونڈی بناکر رکھنا چاہتے ہیں یا اسے حسن فروشی پر مجبور کرتے ہیں۔

لیکن قرۃ العین حیدر نے اپنی تخلیقات میں عورت کا ایک دوسرا روپ بھی پیش کیا ہے جیلانی بانو کے تجزیے کے مطابق!!!

''قرۃ العین حیدر کے افسانوں اور ناولوں میں وہ عورت شامل ہوئی جو جذباتی اور ذہنی طور پر طاقت ور ہے۔ جو مرد اور مرد کی دُنیا، دونوں کے ساتھ بلاجھجک قدم بڑھا رہی ہے۔ قرۃ العین حیدر نے افسانے کو عورت کے ایسے کردار دیے جو دُنیا کی تہذیب کو اور ان کی تبدیلیوں کو سمجھتی ہے۔ وہ باشعور صاحب رائے اور عالمی ادب اور تاریخ پر نظر رکھتی ہے۔ ایسی عورت جو ایک طرف زندگی کی تیز رفتاری میں شریک ہے اور دوسری طرف اپنی ذات کے دُکھ اور خاندان اور معاشرے کے دباؤ کو بھی سہتی ہے، ان کے افسانوں، خصوصاً، ہاؤسنگ سوسائٹی 'سیتاں ہرن'، اگلے جنم موہے بٹیا نہ کیجیو، میں ہمیں زندگی کے اثرات کھوجتی ہوئی ہندوستانی عورت کے ایسے مختلف کردار ملتے ہیں جن کی صورت گری قراۃ العین حیدر کے اسلوب کا انتظار کر رہی تھی۔''

القصہ مختصر خواتین میں جو شاعرات خصوصی شہرت کی حامل رہی ہیں ان میں ادا جعفری، شفیق فاطمہ شعریٰ، فہمیدہ ریاض، پروین شاکر، کشور ناہید، ساجدہ زیدی، زاہدہ زیدی، زہرہ نگاہ، نور جہاں ثروت، پروین فنا سید، رفیعہ شبنم عابدی، بلقیس ظفیر الحسن، شاہدہ حسن، عذرا پروین شائستہ حبیب، عذرا عباس، شہناز نبی، سارا شگفتہ، حمیرا ریاض، شبنم عشائی، رشیدہ عیاں، ترنم ریاض، عشرت آفریں، وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں ان شاعرات نے اپنی شاعری کے ذریعے مرد اساس معاشرے سے بغاوت کا اعلان کردیا ہے۔ اب وہ 'وفا کی دیوی' اور 'حیا کی مورت' کی جگہ ایک نئے پیکر میں ابھر کر سامنے آرہی ہیں جہاں اپنے تشخص اور اپنے وجدان کا احساس ان پر غالب ہے۔

کتابیات

(1) تانیثی ادب کی شناخت اور تعین قدر: ابوالکلام قاسمی
(2) اُردو ادب اطفال میں خواتین کا حصہ: ڈاکٹر خوشحال زیدی
(3) اُردو ناول میں عورت کا تصور (نذیر احمد سے پریم چند تک) فہمیدہ کبیر
(4) بیسویں صدی میں خواتین کا اُردو ادب: ترنم ریاض
(5) تانیثیت کے مباحث اور اُردو ناول: شبنم آرا
(6) دس نامور پاکستانی شاعرات: فاروق ارگلی
(7) خاتونِ اسلام: مولانا وحیدالدین خاں
(8) ہندوستان کی قبائلی عورتیں: ڈاکٹر شیام سنگھ ششی مترجم محبوب الرحمن فاروقی

رسائل:

(1) ایوانِ اُردو دہلی، شمارہ جنوری 2010، (ہاجرہ مسرور اور ان کے افسانے)
(2) فکر و تحقیق، سہ ماہی 2008 دہلی
(3) نئی دُنیا، دہلی
(4) نیو اُسیس، سہ ماہی اپریل 2012 اورنگ آباد
(5) فنون، دو ماہی فروری مارچ 2010
(6) فکر و تحقیق سہ ماہی جنوری فروری مارچ 2006

■

Shaikh Shabana Bano, Mohella Bad-Ke-Ali
Maimn Road Khuldabad Distt.: Aurangabad

غضنفر علی

دانش مندی بمعنی کتاب دانی: رسالۂ دانش مندی کی روشنی میں

بڑا آدمی خواہ کسی بھی میدان کا ہو، محض اپنے دائرے تک محدود نہیں رہتا۔ اس کا ذہن ایسا جویائے رازِ حیات و کائنات اور متلاشیِ مضمرات ہوتا ہے کہ اپنے گھیرے سے نکل کر دوسرے دائروں میں بھی پہنچ جاتا ہے اور ان دائروں کے نشیب فراز کو بھی اپنی فکر کا محور و مرکز بنالیتا ہے۔ یہ اسی ذہنِ جوئندہ کا کمال ہے کہ پیغمبر اسلام حضرت محمدؐ کی احادیث میں مشیتِ ایزدی اور احکاماتِ خداوندی کی تشریحات و تعبیرات کے ساتھ ساتھ انسانی نفسیات اور معاشرتی معاملات کی تصریحات و توضیحات بھی موجود ہیں۔ شری کرشن کی بھگوت گیتا میں دھرم ادھیائے کے علاوہ کرم کانڈ بھی شامل ہے۔ افلاطون اور ارسطو کے مکالموں میں فلسفیانہ موشگافیوں کے پہلو بہ پہلو ادب وفن کی باریکیاں بھی زیرِ بحث لائی گئی ہیں۔ سرسید اور راجا رام موہن رائے کی تحریروں اور تقریروں میں اصلاح معاشرہ کے علاوہ دیگر افکار و خیالات بھی نظر آتے ہیں۔ گاندھی، نہرو اور آزاد کے یہاں سیاست کے سوا بھی بہت کچھ دکھائی دیتا ہے۔ اسی طرح حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی کی تصانیف میں الٰہیات اور روحانیات کے مباحث کے ہمراہ مادی موضوعات بھی بحث کے دائرے میں لائے گئے ہیں۔

شاہ صاحب کی عظمت صرف اس میں نہیں ہے کہ انھوں نے حُجّۃُ اللہ البالغہ لکھ کر دنیائے علمِ دین میں دھوم مچادی اور فقہی مسئلوں پر دو معرکتہ الارا کتابیں ''عَقد الجَیّدِفی اَحکامِ الا جتہاد و التّقلید'' اور ''الانصافُ فی بیان سببِ الاِ ختلاف'' تحریر فرما کر اجتہاد اور تقلید کی گتھیاں سلجھائیں، عالمانہ ذہنوں میں پڑی اڑیل گانٹھیں کھولیں، راہِ افہام و تفہیم سے سرکش اور ہٹھیلی گرہیں سرکائیں، انا پرست دماغوں کی اینٹھنیں دور کیں، تشدّد اور منہ زور رویوں کو متوازن کیا، انتہا پسندانہ چال چلنے اور ٹیڑھی ڈگر اپنانے والوں کو اپنے معقول اور معروضی دلائل سے قائل کر کے میانہ روی کی طرف مائل کیا اور ملّی معاشرے اور نام نہاد ملاّئی ماحول کو انتشار، خلفشار اور شیطانی یلغار سے نجات دلائی بلکہ ان کی بڑائی اس بات میں بھی ہے کہ انھوں نے تمام علوم مثلاً علوم عربیہ، علوم شرعیہ، علومِ حِکمیہ اور علومِ محاضرہ اور ان کی ایک ایک شاخ کی ماہیئت، مقصدیت، افادیت، اصطلاحات اور فنونِ مختلفہ کے امتیازات کی وضاحت وصراحت کر کے ان علوم تک پہنچنے والے دشوار راستوں کو ایک عالم کے لیے آسان کیا۔ ان کی عظمت ان کے اُس رسالے سے بھی ظاہر ہے جس میں انھوں نے دانشمندی کے معنی و مفہوم متعین اور اصول و ضوابط مرتب کر کے متون و معانی کے درمیان حائل طرح طرح کی رکاوٹوں کو دور کیا اور موضوع و مواد کی معنویت تک پہنچنے والی فہم و فراست کی راہوں کو سہل، سہج اور پر لطف بنادیا۔

جیسا کہ مذکورہ بالا سطور سے ظاہر ہے کہ شاہ صاحب نے قرآن، تفسیر حدیث اور فقہ کے علاوہ بہت سے دنیاوی مسئلوں کو بھی چھیڑا اور ان کی ماہئیت، محرکات و عوامل اور مضمرات سے بحث کی مگر میرے مطالعے کا دائرہ صرف ان کے ایک مضمون 'رسالہ دنشمندی' تک محدود رہے گا کہ یہ وقت کا تقاضا بھی ہے اور میری کم علمی کی مجبوری بھی۔

'رسالہ دانشمندی' کے عنوان سے لکھا گیا یہ مضمون مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی کی مرتب کردہ کتاب 'مجموعہ، رسائل امام شاہ ولی اللہ' جلد دوم میں شامل ہے، یہ ایک مختصر رسالہ ہے جو کل سات صفحات (صفحہ 515 تا 521) پر مشتمل ہے۔ ان سات صفحات میں حوالے اور حواشی بھی شامل ہیں۔ مضمون کا پہلا صفحہ حمد و ثنا اور اس شجرہ نسب پر صرف ہو گیا ہے جس کے وسیلے سے موضوعِ مذکور کا علم صاحب رسالہ تک پہنچا ہے۔ آخر کا صفحہ یعنی ساتواں صفحہ بھی پورا نہیں ہے بلکہ آدھا ہے۔ اس طرح یہ مضمون ساڑھے چھ صفحے کا رہ جاتا ہے اور اگر حواشی و تعلیقات کا حصہ بھی حذف کر دیا جائے تو ایک اور پورا صفحہ بھی نکل جاتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ مضمون یا رسالہ اصلاً ساڑھے پانچ صفحے تک محدود ہے مگر اس محدود صفحات

والے رسالے میں ایسی وسعت سمٹ آئی ہے کہ اس سے کئی کئی رسائل برآمد ہو سکتے ہیں۔ اس میں بیان کی گئی ایک ایک بات پر ایک مکمل مضمون تحریر کیا جاسکتا ہے۔ اس کے ایک ایک نکتے پر پوری پوری کتاب لکھی جاسکتی ہے۔

رسالے کے عنوان پر میری نظر پڑی تو موبائل پر گوگل کھل گیا اور Wiki pedia پر یہ تحریر ابھر آئی

"A basic definition of wisdom is the judic ius application of knowled ge. The opposite of wisdom is folly. Synonyms include prudence.Sagacity, discanment or insight." (وزڈم، گوگل، وکی پیڈیا)

(یعنی علم کے مدبّرانہ استعمال کا نام دانشمندی ہے۔ یہ لفظ حماقت یا بے وقوفی کی ضد ہے۔ ہوش مندی، زیرکی یا فراست، نکتہ رسی اور بصیرت اس کے مترادفات ہیں۔)

رسالہ پڑھنا شروع کیا تو شاہ صاحب کی اس تعریف پر نگاہیں ٹھہر گئیں:

''اگر تم یہ پوچھو گے کہ دانشمندی سے میں کیا مراد لیتا ہوں تو دانشمندی سے میری مراد کتاب دانی ہے اور اس کے تین درجے ہیں۔ اس کا ایک درجہ تو یہ ہے کہ کتاب کا مطالعہ ہو اور اس کی حقیقت بدرجہ تحقیق حاصل کی جائے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ استاد کتاب کو پڑھائے اور اس کی حقیقت شاگردوں کو سمجھائے اور اس کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ وہ اس کتاب پر شرح یا حاشیہ لکھے اور اس کی حقیقت کے انکشاف میں مبالغہ نہ کرے۔''

(رسالہ دانشمندی، مجموعۂ رسائل امام شاہ ولی اللہؒ، جلد دوم، مرتبہ مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی، شاہ ولی اللہ انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، 2013، صفحہ نمبر 516)

اس گاڑھے اور فلسفیانہ موضوع کی اتنی آسان اور سیدھی سادی تعبیر وہ بھی شاہ ولی اللہ کے قلم سے جن کی دانشمندانہ اپروچ سے کتابیں بھری پڑی ہیں، ذہن میں یہ سوال ابھرنا فطری اور لازمی تھا کہ آخر اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟

ذہن اس سوال کے جواب کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹکتا ہوا قرآن حکیم کے سورۂ علق کی ان آیت تک پہنچ گیا:

''اِقرا باِسمِ رَبّکَ الّذی خَلَق O خَلَقَ الاِنسانَ مِنْ عَلَق O اَقرا وربُّک الاَکرمُ الذّی علّمَ باِ لقلم O علّمَ الاِنسان مالَمْ یَعلَمْ O

''پڑھ اپنے رب کے نام سے جو سب کا بنانے والا ہے۔ بنایا آدمی کو جمے ہوئے لہو سے پڑھ اور تیرا رب بڑا کریم ہے جس نے علم سکھایا قلم سے۔ سکھلایا آدمی کو جو وہ نہ جانتا تھا۔''

(سورۃ علق: (القران الکریم، ترجمہ شیخ الہند) مطبع)

خالقِ کائنات اور دانائے راز اپنی کتابِ حکمت قرآنِ حکیم کا آغاز کسی اور لفظ کے بجائے 'اقرا' سے ہی کیوں کر رہا ہے؟ اس کیوں پر جب میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ اسی اقرا یعنی پڑھنے سے پتا چلتا ہے کہ انسان کیا تھا اور خالقِ کائنات نے اسے کیا سے کیا بنا دیا، اسی سے وہ سب کچھ جان پاتا ہے جو وہ نہیں جانتا تھا۔

اقرا یعنی پڑھنا ہی وہ عمل ہے جس سے کتاب بولتی ہے۔ تحریر کھلتی ہے۔ حروف آواز میں بدلتے ہیں۔

خالقِ کائنات اور دانائے راز اپنی کتابِ حکمت قرآنِ حکیم کا آغاز کسی اور لفظ کے بجائے 'اقرا' سے ہی کیوں کررہا ہے؟ اس کیوں پر جب میں نے غور کیا تو معلوم ہو ا کہ اسی اقرا یعنی پڑھنے سے پتا چلتا ہے کہ انسان کیا تھا اور خالقِ کائنات نے اسے کیا سے کیا بنادیا، اسی سے وہ سب کچھ جان پاتا ہے جو وہ نہیں جانتا تھا۔ اقرا یعنی پڑھنا ہی وہ عمل ہے جس سے کتاب بولتی ہے۔ تحریر کھلتی ہے۔ حروف آواز میں بدلتے ہیں۔ کائنات کے سُر تال سنائی دیتے ہیں۔ حیات کے رنگ و آہنگ سامنے آتے ہیں۔ یہ وہ عمل ہے کہ جس سے محسوسات بو ل پڑتے ہیں۔ تجربات و مشاہدات محاکات بن جاتے ہیں۔ مضمرات سنائی دینے لگتے ہیں۔ اسرار کھلنے لگتے ہیں۔

کائنات کے سُر تال سنائی دیتے ہیں۔ حیات کے رنگ و آہنگ سامنے آتے ہیں۔ یہ وہ عمل ہے کہ جس سے محسوسات بول پڑتے ہیں۔ تجربات و مشاہدات محاکات بن جاتے ہیں۔ مضمرات سنائی دینے لگتے ہیں۔ اسرار کھلنے لگتے ہیں۔

پس شاہ صاحب کی دانش مندی کی اس نئی تعریف کی حکمت مجھ پر منکشف ہوگئی اور کتاب دانی کو دانشمندی ٹھہرانے کا عندیہ بھی کہ یہی وہ فن ہے جس سے علومِ برہانیہ (یعنی وہ علوم جن میں دلیل و برہان ہو جیسے کہ منطق) اور علومِ خطابیہ (جن میں ظنی مقدمات پیش کر کے اپنی بات کہی جاتی ہے) دونوں روشن ہوتے ہیں۔ اسی سے دو عبارتوں کے درمیان کے اختلاف کو سامنے لایا جاتا ہے۔ اسی سے دو مشابہ باتوں کے بیچ پائے جانے والے امتیاز کو نمایاں کیا جاتا ہے۔ اسی سے کسی موضوع کی تعریف کے حشو و زوائد کو کاٹ کر اسے جامع و مانع بنایا جاتا ہے۔ اسی کتاب دانی سے نکتہ رسی ہاتھ لگتی ہے۔ اسی سے بصارت میں بصیرت پیدا ہوتی ہے۔ اسی سے فراست بیدار ہوتی ہے۔ اسی سے زیرکی پروان چڑھتی ہے۔ اسی سے ہوش مندی ہوش کے ناخن لیتی ہے۔ اسی سے مشکلات کی عقدہ کشائی ہوتی ہے۔ اسی سے لاینحل مسئلے حل کیے جاتے ہیں۔ اسی سے حقائقِ زیرِ زمیں اوپر آتے ہیں۔ اسی سے سماوی صداقتیں نیچے اترتی ہیں اور اسی سے حقیقتِ منتظر لباسِ مجاز میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ اسی سے گلشنِ ناآفریدہ کا پتا ملتا ہے اور اسی سے گرمیِ نشاطِ تصور حاصل ہوتی ہے۔ آگے بڑھا تو عبارت سے وہ اصول بھی ابھر آئے جن کے اطلاق سے کتاب کا مطالعہ ممکن ہو پاتا ہے اور کتاب میں موجود حقیقت ہاتھ لگتی ہے۔ نیز اس حقیقت کا وہ پہلو بھی روشن ہوا کہ کتاب محض معلومات کا ذخیرہ، خیالات کا مجموعۂ حالات کا تبصرہ، حکایات کا تذکرہ یا اسبابِ مشغلۂ جاں، لوازماتِ تفنّنِ طبع اور سامانِ تفریح نہیں بلکہ پُر پیچ زندگی کی تشریح، مرضِ حیات و کائنات کی طبیب اور مریضِ دل و دماغ کی مسیح بھی ہے۔ کتاب لطیف احساسات و جذبات کا منبع، اعلیٰ افکار و خیالات کا ماوا و ملجا، روشن تجربات و مشاہدات کا مرکز، ارفع اصول و نظریات کا مستقر، فلسفہ و منطق کا مسکن، تدبّر و حکمت اور آگہی و بصیرت کا مخزن، علم و دانش کا ماحصل، صدائے سحر ساز کا مخرج، نوائے دل نواز کا مآخذ، بیداریِ شعور ادراک کا میدانِ عمل، بلند پروازیِ تخیل کا مکتب، بیداریِ روح کی درس گاہ، تزکیہ نفس کی خانقاہ، توازن و تناسب کی آماجگاہ اور حصولِ منزلِ مقصود کی شاہرہ بھی ہے۔ کتاب کلامِ الٰہی بھی ہے اور ارشادِ رسول بھی، کتاب گیتا اور رامائن بھی ہے اور شاہ نامۂ اسلام اور مہابھارت بھی۔ کتاب گنج ہائے گراں مایہ و گنجینۂ معانی بھی ہے اور مصباحِ طلسماتِ کامرانی بھی اور یہ مصباحِ طلسماتِ کامرانی اور گنجینۂ معانی بنا کتاب دانی کے نہیں گھومتی۔ اسی لیے شاہ صاحب نے کتاب دانی کی بات کی

اور یہ فرمایا:

''کتاب کی حقیقت بدرجۂ تحقیق حاصل کی جائے اور استاد اس حقیقت کے انکشاف میں مبالغہ نہ کرے''

(ایضاً، ص 516)

ان کے خیال میں کتاب دانی یعنی دانشمندی جن باتوں سے آتی ہے وہ پندرہ ہیں اور وہ پندرہ باتیں یہ ہیں:

1. پیشِ نظر عبارت میں جو مشکل الفاظ ہیں ان کی نشان دہی اور حرکات وسکنات کے اشتباہ کا ازالہ۔
2. عبارت میں جو غریب ونامانوس لفظ آئے اس کی شرح
3. عبارت میں جو مغلق جگہ ہو اس کی وضاحت
4. مسئلہ زیر بحث کو مثالوں کے ذریعے اس کی مختلف صورتیں پیش کر کے اس کی تفہیم اور ذہن نشینی
5. تقریب الدلائل (دلیلوں کو ذہن کے قریب لانا) لانے کی سعی
6. تعریفات کی تحقیق کرتے وقت ان کی جو قیود ہوں، ان کے فوائد کا بیان
7. قواعد کلیہ کی ایسی وضاحت کہ اس کے ذیل میں تعریف کو قیود کے فوائد، تقسیمات وغیرہ مع مثال جامع ومانع انداز میں شرح وبسط سے بیان ہوجائیں۔
8. تقسیمات کو حصر کرنے کی وجہ کی وضاحت دلیلوں کے ساتھ
9. دو اقتباس رکھنے والی چیزوں میں تفریق کی وضاحت
10. دو مختلف چیزوں میں پائی جانے والی تطبیق اور اختلاف کا حل
11. ظاہر الورود شبہات کی طرف توجہ اور انھیں دور کرنے کی سعی
12. حوالہ اور وفیہ نظر سے مصنف کی مراد اور اس کی وضاحت
13. کتاب کی عبارت کو شاگردوں کی زبان میں ترجمہ اگر شاگرد کتاب کی زبان سے واقف نہ ہو۔
14. مختلف توجیہات کی تنقیح اور صحیح تر ترجیہات کا تعین
15. سہل تر زبان اور ایجاز واختصار والا بیان

ان باتوں کو پڑھتے وقت میرے ذہن میں ایک لفظ: ماوادا ابھر آیا:

یہ لفظ اس وقت گڑھا گیا جب میں نئی تحقیقات اور نئے زمانے کے تقاضے کے پیش نظر جدید طریقۂ تعلیم پر غور کر رہا تھا۔ یہ لفظ بظاہر بے معنی ہے مگر جدید طریقۂ تعلیم کے بہت سارے اصولوں کو اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے۔ ماوادا میں م ا و ا د پانچ حروف ہیں۔ ان میں سے ہر ایک حرف ایک بنیادی تعلیمی اصول کی جانب اشارہ کرتا ہے مثلاً

م سے مرحلہ وار
ا سے آسان
و سے وضاحتی
ا سے استدلالی
اور
د سے دلچسپ

مرحلہ وار سے مراد یہ ہے کہ متن کے تمام پہلو منطقی ترتیب کے ساتھ بتائے جائیں اور تمام مرحلوں میں ایک ربط برقرار رکھا جائے۔ یعنی اس بات کا خیال رکھا جائے کہ کس پہلو کو پہلے آنا چاہیے اور کس کو بعد میں تاکہ تسلسل اور آسانی کے ساتھ ایک ایک بات اور ایک ایک نکتہ سمجھ میں آجائے۔

شاہ صاحب کی ان باتوں کی تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہت پہلے انہوں نے اس نکتے کو سمجھ لیا تھا کہ اعراب و علامات کے نہ لگانے یا ا ن کے ادھر اُدھر ہوجانے یا اپنی جگہ سے ہٹ جانے اور نقطوں کے ہیر پھیر سے لفظ اشتباہ کا شکار ہوجاتا ہے، معنی متاثر اور مفہوم مبہم ہوجاتا ہے اور مصنف کا مدعا اپنی معنویت کھودیتا ہے۔ وہ جان گئے تھے کہ درست املا سے لکھی گئی عبارت کو صحیح طریقے سے پڑھنے سے انشا کا حسن نکھر آتا ہے۔ بیان، بدیع اور معانی کے کمالات واضح، پرکشش، پر لطف او ر معنی خیز ہوتے جاتے ہیں۔ بلاغت کی باریکیاں آنکھوں میں ابھرنے اور دل و دماغ میں اترنے لگتی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ متن منّور، منزہ، مرصع اور معنی خیز ہوجاتا ہے۔

پڑھانے اور سمجھانے کا طریقہ آسان ہونا چاہیے۔ یعنی جملے چھوٹے، سادہ اور سہج ہوں۔ ان میں الجھاؤ نہ ہو۔ الفاظ مشکل نہ ہوں۔ انھیں لفظوں میں بات کی جائے جن سے طلبہ واقف ہوں اور ان کے معنی جانتے ہوں۔ بنیادی بات سے ادھر ادھر نہ ہٹا جائے۔ طویل اور پیچیدہ جملے استعمال نہ کیے جائیں۔ اگر کوئی مشکل نکتہ ہے تو اُسے مثالوں سے سمجھایا جائے۔ پیچیدہ اور مشکل بات کو سہل اور آسان بنا کر پیش کیا جائے۔

وضاحت سے مراد یہ ہے کہ بات کو کھول کھول کر بیان کیا جائے۔ اشاروں کو واضح کیا جائے۔ بات کی تہہ تک طلبہ کے ذہن کو پہنچایا جائے۔ کسی بھی بات کو مبہم نہ رہنے دیا جائے۔ بعض نکتوں کو مختلف انداز سے بار بار سمجھانے کی کوشش کی جائے۔

استدلالی طریقۂ کار کا مطلب یہ ہے کہ جو بات بھی کہی جائے دلیل کے ساتھ کہی جائے۔ اپنے دعوے کے لیے ثبوت پیش کیے جائیں۔ بات اس طرح کہی جائے کہ طلبہ کا ذہن اس کو قبول کر لے یا طلبہ اس بات کو ماننے میں کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہ محسوس کریں۔

دلچسپ ہونے سے مراد یہ ہے کہ استاد کا انداز دلچسپی سے خالی نہ ہو۔ یعنی ایسا طریقہ اپنایا جائے کہ سننے والوں کو مزا آئے۔ انھیں اکتاہٹ نہ محسوس ہو۔ ان کے اندر آگے کی بات سننے کے لیے خواہش پیدا ہو۔ اور آخر تک ان کے دل و دماغ سبق کی طرف مائل رہیں۔ یعنی ان کی توجہ آخر تک بنی رہے۔

آج کے ذہن کے سوچے گئے یہ سارے اصول جن کو استعمال کرتے وقت کلاس میں طلبہ سے خوب داد ملتی ہے اور میں اس وقت پھولے نہیں سماتا، حیرت ہے کہ برسوں پہلے شاہ صاحب کی نظر میں آچکے تھے۔ مزید حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ وہ نکات جو جدید ذہن میں نہ آسکے وہ بھی بہت پہلے ایک قدیم انسان کی سوچ میں موجود ہیں۔

شاہ صاحب کی ان باتوں کی تفصیلات سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہت پہلے انھوں نے اس نکتے کو سمجھ لیا تھا کہ اعراب وعلامات کے نہ لگانے یا ان کے ادھر اُدھر ہوجانے یا اپنی جگہ سے ہٹ جانے اور نقطوں کے ہیر پھیر سے لفظ اشتباہ کا شکار ہوجاتا ہے، معنی متاثر اور مفہوم مبہم ہوجاتا ہے اور مصنف کا مدعا اپنی معنویت کھودیتا ہے۔ وہ جان گئے تھے کہ درست املا سے لکھی گئی عبارت کو صحیح طریقے سے پڑھنے سے انشا کا حسن نکھر آتا ہے۔ بیان، بدیع اور معانی کے کمالات واضح، پرکشش، پر لطف اور معنی خیز ہوتے جاتے ہیں۔ بلاغت کی باریکیاں آنکھوں میں ابھرنے اور دل و دماغ میں اترنے لگتی ہیں۔ خلاصہ یہ کہ متن منوّر، منزہ، مرصع اور معنی خیز ہوجاتا ہے۔ اسی لیے وہ اپنی پہلی بات بیان کرتے ہوئے یہ تفصیل درج کرتے ہیں:

''عبارت میں جو اسما و افعال ہیں اگر ان کی حرکات وسکنات محلِ اشتباہ ہیں تو انھیں بیان کردے۔ اسی طرح حروف پر جہاں نقطے ہیں اور جہاں کوئی نقطہ نہیں، وہ بھی بیان کردے تا کہ تصحیفِ خطی اور تصحیفِ لفظی (مثلاً ج کی ح، ع کی غ، ت کی ث وغیرہ سے تمیز ہوجائے) ہر دو سے محفوظ ہوجائے۔'' (ایضاً، ص 516)

شاہ صاحب اس حقیقت سے بھی واقف تھے کہ مصنف اور قاری یعنی لکھنے والے اور پڑھنے والے کی Vocabulary یکساں نہیں ہوتی۔ مصنف اپنی تحریروں میں بعض ایسے الفاظ بھی استعمال کرتا ہے جو قاری کے لیے غریب اور نامانوس ہوتے ہیں یعنی جو پڑھنے والے کے ذخیرۂ الفاظ میں موجود نہیں ہوتے۔ جس کی وجہ سے متن کا مفہوم قاری کے ذہن میں واضح نہیں ہو پاتا۔ اس لیے ضروری ہے کہ ایسے لفظوں کے معنی بتائے جائیں اور جہاں ضرورت ہو تشریح بھی کی جائے۔ اسی لیے شاہ صاحب اس بات پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''عبارت میں جو غریب و نامانوس لفظ آئے اس کی شرح کرے یعنی اگر کوئی لفظ قلیل الاستعمال ہے اور شاگردوں کے لیے اس کے استعمال کا مفہوم واضح نہیں تو عالم اس کی لغت اور اصطلاح دونوں کی رو سے تشریح کرے۔'' (رسالہ دانشمندی، 2013، ص 517)

شاہ صاحب کی گرفت میں یہ نکتہ بھی تھا کہ متن میں ترکیبوں اور فقروں یا جملوں کی ایسی ساخت بھی آجاتی ہے جو پیچیدہ اور مشکل ہوتی ہے اس لیے وہ فرماتے ہیں:

''عبارت میں جو مغلق جگہ ہو، استاد اس کی وضاحت کرے یعنی عبارت میں کوئی مشکل ترکیب یا مشکل نحوی وصرفی صیغہ آیا ہے اور شاگردوں کے لیے اسے سمجھنا مشکل ہے تو عالم اس کو نحو اور صرف کے مطابق حل کردے۔'' (ایضاً، ص 517)

شاہ صاحب اس حقیقت سے بھی آشنا تھے کہ متن و مواد کو سمجھنے میں اس وقت بھی خاصی دشواری پیش آتی ہے جب زیرِ بحث مسئلہ الجھا ہوا ہو یا ادق یا پیچیدہ ہو اسی لیے وہ لکھتے ہیں کہ جب ایسی صورت آجائے تو:

''مسئلہ زیرِ بحث کو مثالیں دے کر یا اس کی مختلف صورت پیش کرکے سمجھائے، مثلاً کتاب میں ایک قاعدہ کا ذکر ہے اور شاگرد اسے نہیں سمجھ پاتے تو عالم اسے واضح طور پر بیان کرے اور اس کی مثالیں دے تا کہ شاگردوں کے ذہن میں اصل مقصد آجائے۔'' (ایضاً، ص 18-517)

حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ وہ نکتے جو آج کے ذہن میں نہ آسکے ان تک بھی شاہ صاحب کی رسائی ہوگئی تھی۔ مثلاً شاہ صاحب وضاحت کے ساتھ ساتھ ایجاز و اختصار کو بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہ موضوع کی وضاحت کے دوران اس بات کا امکان رہتا ہے کہ وقت زیادہ صرف ہوجائے اور مقررہ وقت میں موضوع کے تمام پہلوؤں کا احاطہ نہ ہوسکے۔ ساتھ ہی اس بات کا بھی اندیشہ ہے کہ وضاحت اکتاہٹ کا سبب نہ بن جائے۔ اسی لیے وہ ایجاز و اختصار کی بات کرتے ہیں تا کہ سمندر کوزے میں بند ہوجائے اور زبان و بیان کا لطف بھی برقرار رہے۔

شاہ صاحب اس بات پر بھی زور دیتے ہیں کہ استاد متن کو شاگرد کی زبان میں بھی سمجھائے۔ یہ بالکل نیا اپروچ ہے کہ استاد کو کثیر اللسان یا کم سے کم ذولسان ضرور ہونا چاہیے۔ وہ اس بات کو اس طرح پیش کرتے ہیں:

''اگر شاگردوں کی زبان وہ نہیں جو کتاب کی ہے تو کتاب کی عبارت کا شاگردوں کی زبان میں ترجمہ کیا جائے۔ (ایضاً، ص 520)

شاہ صاحب نے مرحلہ وار ترتیب کے نظام کو اپنی باتوں میں بھی برقرار رکھا ہے۔ مثلاً وہ املا سے شروع کرتے ہیں اور انشا تک پہنچتے ہیں۔

یہ پندرہ باتیں ایسے منتر ہیں کہ جن کی پھونک سے دریائے نگارشات میں مختلف موڑ پر موجود املا، اعراب و علامات، تراکیب، اصطلاحات، غرابت، حشو و زوائد، اشکالات، ابہام وغیرہ کی بند سیپیوں کے منہ کھل جاتے ہیں اور ان کے اندر سے معنی و مفہوم کے موتی باہر نکل آتے ہیں۔ جن کی چمک چہرے کو چمکا اور دل و دماغ کو دمکا دیتی ہے اور اس چمک دمک کا وہ اثر ہوتا ہے کہ انسانی اخلاق و کردار سنورتے اور نکھرتے چلے جاتے ہیں۔

ان باتوں کو پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ شاہ صاحب چاہتے ہیں کہ استاد ان باتوں پر عمل کرے تا کہ وہ درس و تدریس اور کتاب کی شرح و تفسیر میں کامل ہوجائے۔ شاہ صاحب یہ بھی چاہتے ہیں کہ یہ منتر صرف استاد تک ہی محدود نہ رہیں بلکہ طلبہ بھی انھیں عمل میں لائیں۔ اسی لیے وہ یہ بھی لکھتے ہیں:

''شفیق استاد کو چاہیے کہ اولاً وہ اپنے شاگردوں کو ان امور سے اجمالی طور سے مطلع کرے، ثانیاً جب وہ شرح و بیان کے دوران ان امور سے گزریں، تو وہ انھیں بتائے کہ یہاں شارح کا مطلب یہ ہے اور وہاں اُس کا مطلب یہ تھا، ثالثاً استاد شاگردوں کو بتائے کہ وہ کتاب کے مطالعے میں ان ان امور کو پیشِ نظر رکھے اور ان ان میدانوں میں اپنی فکر کو جولاں کریں، رابعاً شاگرد کے مطالعے کا اپنے مطالعے سے مقابلہ کرے اور شاگرد سے غلطی ہو تو اسے اس طرح اس پر متنبہ کرے کہ غلطی اس کے ذہن پر واضح ہوجائے اور وہ آئندہ ایسی غلطی کرنے میں احتیاط برتے۔ خامساً استاد شاگرد کو کسی کتاب کی شرح یا اس پر حاشیہ لکھنے کو کہے اور اس طرح اس کی قابلیت کا امتحان لے تا کہ تربیت کا جو حق ہے، اس کی تکمیل ہوسکے۔'' (ایضاً، ص 21-520)

''شفیق استاد کو چاهیے که اولاً وه اپنے شاگردوں کو ان امور سے اجمالی طور سے مطلع کرے، ثانیاً جب وه شر ح و بیان کے دوران ان امور سے گزریں، تو وه انهیں بتائے که یهاں شارح کا مطلب یه هے اور وهاں اُس کا مطلب یه تها، ثالثاً استاد شاگردوں کو بتائے که وه کتاب کے مطالعے میں ان ان امور کو پیشِ نظر رکهے اور ان ان میدانوں میں اپنی فکر کو جو لاں کریں، رابعاً شاگرد کے مطالعے کا اپنے مطالعے سے مقابله کرے اور شاگرد سے غلطی هو تو اسے اس طرح اس پر متنبه کرے که غلطی اس کے ذهن پر واضح هوجائے اور وه آئنده ایسی غلطی کرنے میں احتیاط برتے۔ خامساً استاد شاگرد کو کسی کتاب کی شرح یا اس پر حاشیه لکهنے کو کهے اور اس طرح اس کی قابلیت کا امتحان لے تاکه تربیت کا جو حق هے ،اس کی تکمیل هوسکے۔''

جی چاہتا ہے کہ میں مولانا مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی سے درخواست کروں کہ وہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے اس رسالۂ دانشمندی کو مشکل الفاظ و اصطلاحات کی تشریح کے ساتھ الگ سے کتابچے کی شکل میں شائع کرکے زبان و ادب اور دیگر علوم کے تمام اداروں تک پہنچادیں تا کہ استاد اور طلبہ دونوں کتابوں کی اہمیت اور ان کے معنی اور حسن سے مستفیض و محظوظ ہوسکیں۔

■

Gazanfar Ali, Acadmy Baraye Faroghe Istedade- Urdu Medium Asataza, Jamia Millia Islamia, New Delhi - 110025

محمد عبدالعزیز سہیل

انٹرنیٹ: اردو تحقیق میں مواد کی فراہمی کا جدید ذریعہ

تحقیق یا ریسرچ سے متعلق کہا گیا کہ یہ زندگی کی ہر سطح پر ایک زندہ معاشرے کی بنیادی ضرورت ہے اگر کسی معاشرے میں تحقیق کا عمل ناکارہ ہوجائے تو اس معاشرے میں بہت سارے جھوٹ سچائیاں بن کر معاشرے کو گھن کی طرح کھانے لگتے ہیں اور بے تحقیق معاشرہ ہر سطح پر ناکارہ و بے جان ہوجاتا ہے۔ لفظ 'تحقیق' حق سے مشتق ہے جس کے مفہوم میں سچائی کی تلاش اور حقیقت کی کھوج کے معنی آتے ہیں۔ قاضی عبدالودود کے الفاظ میں ''تحقیق کسی چیز کو اس کی اصلی شکل میں دیکھنے کی کوشش ہے۔'' مولے جارج کے مطابق ''تحقیق ایک ایسے عمل کا نام ہے جس میں مسائل کے بارے میں باضابطہ منصوبے کے تحت معطیات (مواد Data) جمع کرکے ان کا تجزیہ اور تشریح کی جاتی ہے تاکہ ان مسائل کا باعتبار حل معلوم کیا جاسکے۔'' (تعلیمی تحقیق، جدران پبلی کیشنز لاہور، ص 25)

تحقیق کے مختلف مراحل میں موضوع کا انتخاب، مجوزہ خاکہ تیار کرنا، مواد کی فراہمی، (نوٹ حاصل کرنا) تصحیح متن اور مقالے کی تسوید ہوتے ہیں۔ دور حاضر میں اردو تحقیق کے مسائل سے آگہی اور واقفیت حاصل کرنا محقق کا اہم فریضہ ہے۔

سائنس اور دیگر علوم کی تحقیق میں ایک سطری نو دریافت شدہ بات پر بھی ڈاکٹریٹ کی ڈگری مل سکتی ہے لیکن سماجی علوم خاص طور سے ادب کے کسی گوشے پر تحقیقی مقالہ لکھنے کے لیے اچھے خاصے مواد کی ضرورت ہوتی ہے اور چھان بین کے بعد کھوج پرکھ اور پہچان کے ذریعے طے شدہ موضوع کے مفروضات کی حقیقت تک پہونچا جاتا ہے۔ اس کے لیے ایک ضخیم مقالہ لکھا جاتا ہے۔ اس طرح اگر ہم اپنی بات کو اردو تحقیق تک محدود رکھیں تو اس قسم کی تحقیق میں مواد کی فراہمی اہم پہلو ہے۔ اردو تحقیق کے فن پر مواد کی فراہمی کے بنیادی ذرائع جیسے کسی تخلیق کار کی تخلیقات، اس کی تخلیقات سے متعلق تبصرے اور اس سے متعلق کتابیں ہوتی ہیں۔ اسی طرح نثر یا نظم کی کسی صنف، کسی تحریک، کسی دور یا کوئی اور متعلقہ موضوع پر تحقیقی کام ہو تو اس موضوع سے متعلق کتابیں، اخبارات اور رسائل، قلمی نسخے وغیرہ مواد کا اہم ذریعہ ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ موضوع سے متعلق شخصیات سے انٹرویو اور دیگر ثانوی ذرائع سے مواد حاصل کیا جاتا ہے۔ سماجی علوم کی تحقیق میں مواد کافی اہمیت رکھتا ہے۔ تحقیقی مواد کو اصطلاح میں متن بھی کہتے ہیں۔ محقق کو اگر اپنے کام سے دیوانگی کی حد تک دلچسپی ہو تو وہ اپنے نگراں اور کام کے دوران ملنے والے اہم اشاروں کی مدد سے مواد کے حصول کے لیے دنیا کے کسی بھی حصے تک سفر کرنے کا ارادہ اور کوشش کرسکتا ہے یا خط و کتابت کے ذریعے اپنا درکار مواد حاصل کرسکتا ہے۔ لیکن آج کے اس ٹیکنالوجی کے دور میں مواد کی شکل اور اس کی دستیابی کے ذرائع تبدیل ہوگئے ہیں اور محقق کے لیے اگر وہ کمپیوٹر کے استعمال سے واقف ہو تو اپنی تحقیق کے لیے درکار قیمتی مواد کے حصول میں بہت حد تک آسانی بھی پیدا ہوگئی ہے۔

آج اکیسویں صدی انفارمیشن اور ٹیکنالوجی کے فروغ کی

صدی ہے اور اس صدی میں انٹرنیٹ اور کمپیوٹر نے انسانی زندگی کے مختلف شعبوں کے ساتھ ساتھ تحقیق اور ریسرچ کے شعبوں میں بھی جست لگانے والی تبدیلی پیدا کی ہے۔ ٹکنالوجی کی ترقی نے ساری دنیا کو ایک گلوبل ولیج میں تبدیل کردیا ہے۔ انٹرنیٹ نے فاصلوں کو کم کردیا ہے اور دوسری طرف معلومات کا انبار لگادیا ہے جس کے ذریعے منٹوں میں کوئی بھی معلومات آسانی سے گھر پر بیٹھ کر اطمینان کے ساتھ حاصل کی جاسکتی ہیں۔ ایسی معلومات بھی انٹرنیٹ پر دستیاب ہیں جن کو حاصل کرنے کے لیے کئی گھنٹوں کا سفر اور دیگر ملکوں کو جانے کی ضرورت درپیش تھیں۔ لیکن آج انٹرنیٹ نے وہ تمام وسائل کو ہمارے قریب لا کھڑا کیا ہے، ہم کمپیوٹر کی مدد سے اپنے ضرورت کی معلومات آسانی سے حاصل کرسکتے ہیں۔ آج کے دور میں کتاب کا مفہوم بدل گیا ہے اور فاصلے سمٹ کر اپنے گھر کے ڈیسک ٹاپ تک پہنچ گئے ہیں۔ اگر ہم انفارمیشن ٹیکنالوجی کی اسی تیز رفتاری کا ساتھ دیتے رہیں گے تو وہ دن دور نہیں کہ کاغذی کتابوں او رالماریوں کی قطاروں سے بھرے کتب خانے صرف ماضی کا خواب ہوجائیں گے اور کتاب کا مطلب ای کتاب ہوگا۔ کتب خانے ای لائبریری کہلائیں گے اور قدیم وجدید تمام کتابیں اب گوگل سرچ میں مختلف ویب سائٹس، بلاگ اور دیگر سہولتوں پر با آسانی دستیاب ہوجائیں گی۔

اردو تحقیق میں مواد کی فراہمی میں انٹرنیٹ کے استعمال کی اب کیا صورتِ حال ہے۔ اردو تحقیق میں درکار قیمتی مواد کے حصول کے لیے کس قدر انٹرنیٹ اور اس پر دستیاب اردو ویب سائٹس کارآمد ہیں اور آج کی نئی صدی کے ریسرچ اسکالرس کس طرح ساری دنیا میں اردو انٹرنیٹ کے ذریعے تحقیقی مواد کی فراہمی کو ایک اہم ذریعہ بناسکتے ہیں۔ اس ضمن میں آیئے نظر ڈالتے ہیں۔ جیسا کہ کہا گیا کہ ہمارے تحقیقی کام کے لیے مواد کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ تحریری شکل میں ہوتا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انٹرنیٹ پر اردو کی کون سی تحریری شکل قابل قبول ہے۔ آج اردو کتابت میں ان پیج کا بول بالا ہے۔ لیکن تحقیق کے لیے انٹرنیٹ کے حوالے سے کہا جارہا ہے کہ اردو کو جتنا نقصان ان پیج سے ہوا شاید کسی اور سے نہیں کیوں کہ ان پیج ایک تصویری کتابت ہے اور اس کی امیج فائل بن سکتی ہے لیکن ان پیج میں تحریر کردہ مواد کو انٹرنیٹ کے سرچ انجن سے تلاش نہیں کیا جاسکتا۔ اس طرح ساری دنیا میں ان پیج میں موجود مواد انٹرنیٹ کی پہنچ سے دور ہے۔ اس کے برخلاف آج انٹرنیٹ پر مختلف ویب سائٹس پر اردو کی جو بھی صورتِ حال ہے وہ یونیکوڈ سافٹ ویر کی بدولت ہے۔ جس کی مدد سے سرچ انجن میں اردو میں اپنی پسند کے مواد تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ یونیکوڈ کی خاصیت یہ ہے کہ یہ ایم ایس ورڈ میں بھی کام کرسکتا ہے اور اس کی بدولت انٹرنیٹ پر آسانی سے اردو کو محفوظ کیا جاسکتا ہے۔ بلال ایم ڈاٹ کام پر یہ چھوٹا سا سافٹ ویئر دستیاب ہے۔ جب یہ سافٹ ویئر لوڈ کیا جاتا ہے تو کمپیوٹر میں نستعلیق فانٹ شامل ہوجاتا ہے اور یونیکوڈ کی کیلی گرافی نما تحریر کو ایم ایس ورڈ میں شامل ہوجانے والے نستعلیق فانٹ کی مدد سے خوبصورت بناسکتے ہیں۔ ان پیج کے فونیٹک کی بورڈ طرز پر اس سے ٹائپنگ کی جاسکتی ہے۔ اسی یونیکوڈ سافٹ ویئر کی مدد سے پڑوسی ملک میں اردو کا بہت کام ہوا ہے اور اردو کی کئی ویب سائیٹس اور فیس بک گروپس میں اردو کی اہم اور نایاب کتابوں کے ای بک ذخائر جمع ہیں۔ انٹرنیٹ پر اردو مواد تک آسانی سے رسائی کے لیے گوگل کے اردو پیج کو اپنے ڈیسک ٹاپ پر رکھیں۔ اس سے زیادہ صفحات تک رسائی ممکن ہے۔ اردو گوگل کا صفحہ انگریزی گوگل سرچ سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

سید مکرم نیاز گوگل، اردو وکی پیڈیا اور اردو یونیکوڈ کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے کیا خوب کہا ہے ملاحظہ ہوں:

"آج سے دس سال پہلے تک بھی مجھے غالب یا اقبال کے کسی دوسرے مصرعہ کی تلاش ہوتی تھی تو سمندر پار سے کال کرکے والد صاحب سے دریافت کرنا پڑتا تھا آج صورتِ حال یہ ہے 'انکل گوگل (unclegoogle)' نہ صرف والد محترم کی جگہ پر آگئے ہیں بلکہ کبھی کبھی تو یوں بھی ہوا کہ گفتگو کے دوران ادھر والد صاحب نے پوچھا کہ ن م راشد کے تیسرے مجموعہ کا نام ذہن سے محو ہوگیا ہے تو جواباً اردو وکی پیڈیا urdu (wikipedia) کی بدولت فوراً سے پیشتر میں نے انھیں 'لا=انسان' کی یاد دلادی۔ درحقیقت انٹرنیٹ پر 'اردو یونیکوڈ' کی ترویج کی بدولت یہ سب ممکن ہوا ہے۔ اتنا وقت تو میسر نہیں کہ 'یونیکوڈ' کا تعارف اور اس کی تفصیلات سے آگاہی دی جائے۔ مختصراً اتنا سمجھیے کہ 'یونیکوڈ' کمپیوٹر کا ایک جدید عالمی نظام ہے جس کے ذریعے دنیا کی کوئی بھی زبان تحریر کی صورت لکھی اور پڑھی جاسکتی ہے۔"

(متن رسم اجرائی، اردو کیمپس، حیدرآباد)

انٹر نیٹ پر اردو کی کون سی تحریری شکل قابل قبول ہے۔ آج اردو کتابت میں ان پیج کا بول بالا ہے۔ لیکن تحقیق کے لیے انٹر نیٹ کے حوالے سے کہا جارہا ہے کہ اردو کو جتنا نقصان ان پیج سے ہوا شاید کسی اور سے نہیں کیوں کہ ان پیج ایک تصویری کتابت ہے اور اس کی امیج فائل بن سکتی ہے لیکن ان پیج میں تحریر کردہ مواد کو انٹر نیٹ کے سرچ انجن سے تلاش نہیں کیا جاسکتا۔

انٹرنیٹ پر مختلف اردو کی ادبی انجمنیں اور تحقیقی اداروں کی ویب سائٹس موجود ہیں۔ برقیاتی کتابیں بھی کئی ویب سائٹس پر دستیاب ہیں۔ اردو کے اہم رسائل اور اخبارات Online دستیاب ہیں۔ ساتھ ہی قدیم کتابوں او ررسائل کو چند ادبی انجمنیں اور کتب خانوں کی کتابوں کو ڈیجیٹل کیا جارہا ہے۔ اردو ادب کے اس عظیم ذخیرے کو انٹرنیٹ پر محفوظ کیا جارہا ہے۔ اردو کے شعرا ادیبوں کی سوانح حیات بھی انٹرنیٹ پر دستیاب ہے۔ اردو وکی پیڈیا جسے اردو دائرۃ المعارف کہا جاتا ہے، کے ذریعے بھی کافی اہم معلومات انٹرنیٹ پر موجود ہے جس کو استعمال کرتے ہوئے ہم اپنے موضوع کے لیے مواد کو آسانی سے تلاش کرسکتے ہیں۔ جس کے لیے نہ ہی ہمیں سفر کرنے کی ضرورت ہے نہ ہی ہزاروں روپیہ صرف کرکے کتابیں خریدنی ہیں۔ برقیاتی کتابیں، کچھ ایسی اردو بلاگز اور ویب سائٹس انٹرنیٹ پر موجود ہیں جن کے

ذریعے ہم مطلوبہ کتابیں حاصل کر سکتے ہیں۔ اردو گوگل صفحہ پر آپ اردو یونیکوڈ میں کسی بھی شاعر یا ادیب کا نام ٹائپ کریں اس سے متعلقہ دستیاب تمام اردو مواد تک رسائی ممکن ہے۔ وکی پیڈیا میں اردو کے نامور شعرا اور ادیبوں کے حالات زندگی موجود ہیں۔ اگر آپ غبار خاطر ٹائپ کریں گے تو وہاب اعجاز خان کا بلاگ ملے گا جس میں ایم اے اردو کے نصاب سے متعلق تمام موضوعات کو نوٹس کی شکل میں جمع کیا گیا ہے۔ قومی کونسل کی ویب سائٹ پر یونی کوڈ میں تبدیل شدہ سیکڑوں کتابیں دستیاب ہیں۔

http://www.urducouncil.n
ic.in/E_Library/urduBooks.html

اس لنک پر ادب سائینس سماجی علوم اور دیگر علوم پر بے شمار کتابیں مفت ڈاؤن لوڈ کے لیے دستیاب ہیں۔ فیس بک کے اردو گروپس بھی اردو کی ترقی میں اہم رول ادا کر رہے ہیں۔ اسی طرح کا ایک گروپ اردو ہے جس کا نام۔ جس کا لنک یہ ہے۔

/urdu.book.poetry.

http://www.facebook.com. prose

اس پیج پر بھی اردو نثر و نظم کی بے شمار کتابیں موجود ہیں۔ یہ کتابیں آج کے دور کے اردو محقق کے لیے کام آسکتی ہیں۔ ایک اور گروپ کا نام ہے۔ عالمی تخلیقی فورم کا کتب خانہ برقیاتی کتابیں ''اس گروپ پر احباب کی جانب سے پوچھی گئی کتابیں پی ڈی ایف میں پیش کی جاتی ہیں اور بہت سی کتابیں جمع ہیں۔ فیس بک کے سرچ آپشن میں اردو یونیکوڈ میں آپ اپنی پسند کے الفاظ ٹائپ کر کے بھی اردو شعر و ادب کے سیکڑوں گروپوں میں شامل ہوسکتے ہیں۔ اردو کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ ریختہ ویب سائٹ پر http://rekhta.org/ebooks موجود ہے۔ جس میں شاعری۔ نثر۔ تحقیق و تنقید کی بے شمار نئی پرانی کتابیں، پرانے اہم رسائل کی فائلیں اور بھی بہت کچھ مواد ہے۔ مجلہ خیابان کی ویب سائٹ پر اہم تحقیقی مقالے اور مضامین موجود ہیں۔ محقق کو چاہیے کہ وہ انٹرنیٹ کی اس سہولت سے استفادہ کرے۔ کتاب ڈاؤن لوڈ کرے۔ اگر دوران تحقیق اسے اسکرین پر پڑھنے اور مواد لینے میں دشواری ہو رہی ہو تو ضروری صفحات کا پرنٹ حاصل کرے اور اپنی تحقیق کو معیاری بنائے۔ فیس بک پر ادبی مسائل پر گفتگو کے لیے ڈاکٹر فضل اللہ مکرم کا گروپ ادبی محاذ دستیاب ہے۔ جہاں اردو کے کئی ریسرچ اسکالرز اور اساتذہ اردو کے مسائل پر ایک پلیٹ فارم پر گفتگو کرتے ہیں۔ ریسرچ اسکالرز بھی اپنا ایک گروپ قائم کرتے ہوئے ہم خیال طلبا کے ساتھ ادبی مباحث میں حصہ لے سکتے ہیں اور ٹیکنالوجی کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔

ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین آن لائن میڈیا کے تصور اور اردو کے عنوان پر انٹرنیٹ اردو اور اردو صحافت سے متعلق لکھتے ہیں:

''انٹرنیٹ پر اردو میں ڈیجیٹل لائبریری اور کئی اہم ادبی، تہذیبی، ثقافتی اور تعلیمی سائٹس موجود ہیں۔ اس کے علاوہ آج کی اردو صحافت کو انٹرنیٹ کے استعمال نے کافی بلندیوں تک پہنچایا ہے اردو کی بیشتر اخبارات انٹرنیٹ پر موجود ہیں۔ کئی اخبارات تو ابھی بھی امیج فائل کی شکل میں انٹرنیٹ پر شائع ہو رہے ہیں۔ مگر زیادہ تر اخبارات یونی کوڈ میں شائع ہو رہے ہیں۔

(اردو میڈیا، ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی ص352)

اردو زبان کی ترقی و ترویج کے لیے انٹرنیٹ کے استعمال کے لیے کئی وسائل دستیاب ہیں۔ ان وسائل کو اردو ادب کے فروغ کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

اردو کی برقیاتی کتابیں تحقیق کاروں کے لیے کافی اہمیت کی حامل ہیں جو کہ مختلف ویب سائٹس پر مفت دستیاب ہیں۔ دور حاضر میں اردو ڈیجیٹل لائبریری کی اہمیت سے متعلق راغب اختر اپنے مضمون اردو ڈیجیٹل لائبریری اور آن لائن اردو کورس میں رقمطراز ہیں:

''ڈیجیٹل لائبریری اس دور میں اس لیے خاص اہمیت کی حامل ہوتی جا رہی ہے کیونکہ اس کے ذریعے نہ صرف یہ کہ کتابوں کو بہ آسانی دور دراز کے علاقوں تک پہنچایا جا سکتا ہے بلکہ اس کے پیچھے ایک اور فلسفہ پنہاں ہے اور وہ یہ ہے کہ جتنے زیادہ لوگوں کے پاس یہ کتابیں ہوں گی اتنی ہی زیادہ طویل اس کتاب کی زندگی بھی ہوگی۔ ملین بک پروجیکٹ سے جڑے لوگوں کا کم از کم یہی ماننا ہے۔ ڈیجیٹل لائبریری دراصل کتابوں کو ایک مجازی فارمیٹ یا قالب میں ڈھالنے اور ان کا ایک مجازی ذخیرہ کرنے کے عمل کا نام ہے۔ دنیا کی تمام بڑی یونیورسٹیز اب اپنی ویب سائٹس کے ساتھ ڈیجیٹل لائبریری کو منسلک کر رہی ہیں تا کہ ان کے طلبا اپنے علم کے بے پایاں ذخیرہ سے استفادہ کر سکیں اور اس ضمن میں انھیں وسائل کے محدود ہونے کا احساس بھی نہ ہو۔ '' اردو میڈیا، ترتیب ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی ص(355

انٹرنیٹ پر اردو میں ڈیجیٹل لائبریری اور کئی اہم ادبی، تہذیبی، ثقافتی اور تعلیمی سائٹس موجود ھیں۔ اس کے علاوہ آج کی اردو صحافت کو انٹرنیٹ کے استعمال نے کافی بلندیوں تک پہنچایا ھے اردو کی بیشتر اخبارات انٹرنیٹ پر موجود ھیں۔ کئی اخبارات تو ابھی بھی امیج فائل کی شکل میں انٹرنیٹ پر شائع ھورھے ھیں۔ مگر زیادہ تر اخبارات یونی کوڈ میں شائع ھورھے ھیں۔

مرکزی وزیر قانون کپل سبل نے 4 اپریل کو ایک تقریب میں خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ اردو کو گوگل سرچ کا حصہ بنانے کے لیے حکومت کوشش کرے گی۔ انھوں نے نوکیا فون کمپنی سے بھی گزارش کی کہ اس جانب کچھ کیا جائے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی اردو زبان و ادب کی ترقی کے لیے اردو کو ٹکنالوجی سے جوڑنے کا ایک اہم فریضہ انجام دے رہی ہے۔ انٹرنیشنل ڈیجیٹل لائبریری اور INFLIBNET کی سہولت سے انگریزی کی دنیا بھر کی کتابوں کو انٹرنیٹ پر پیش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے لیکن اردو کتابیں ابھی ان مقامات پر دستیاب نہیں ہیں۔ اردو کا ریسرچ اسکالر آج قابل لحاظ ماہانہ اسکالرشپ سے جڑا ہوا ہے۔ وہ لیپ ٹاپ اور انٹرنیٹ کنکشن کا متحمل ہوسکتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ نئے زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو۔ اور روایتی تحقیق کے بجائے ایسا کام کرے کہ اس کا کام ریفرنس کا حصہ بن جائے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ:

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
جو عالم ایجاد میں ہے صاحب ایجاد
ہر دور میں کرتا ہے طواف اس کا زمانہ

اردو کے چند اہم ویب سائٹس جن پر اردو ادب کا ایک بڑا ضخیم برقیاتی کتابوں کا ذخیرہ موجود ہے ملاحظہ ہو:

علامہ اقبال سائبر لائبریری ڈاٹ نیٹ (علامہ اقبال پر لکھی گئی منتخب کتابوں کے علاوہ چند کلاسیکی ادب کی کتابوں کو آن لائن پڑھا جا سکتا ہے (اردو ڈیجیٹل لائبریری، اردو برقی کتابیں، اردو محفل لائبریری، دیدہ ور، صراط مستقیم، اردو بک لنک، کتاب گھر، اردو ویب، ڈیجیٹل لائبریری، اس کے علاوہ نیٹ اردو پر برقیاتی کتابیں، اردو مجلس، شعر و سخن، اردو سخن، اردو دوست ڈاٹ کام، اردو پوائنٹ، ہماری ویب، تعمیر نیوز پر بھی اردو ادب کا بہت اہم مواد موجود ہیں۔ ان ویب سائٹوں پر منتخب موضوعات پر موجود کتابوں کو نہ صرف یہ کہ قارئین پڑھ سکتے ہیں بلکہ بوقت ضرورت ڈاؤن لوڈ بھی کر سکتے ہیں۔

■

A.Azeez sohail, H.No. 4.2.75 Lateef Bazar,
Nizamabad ap 503001

شریف احمد قریشی

جدید اردو شاعری اور شاد عارفی

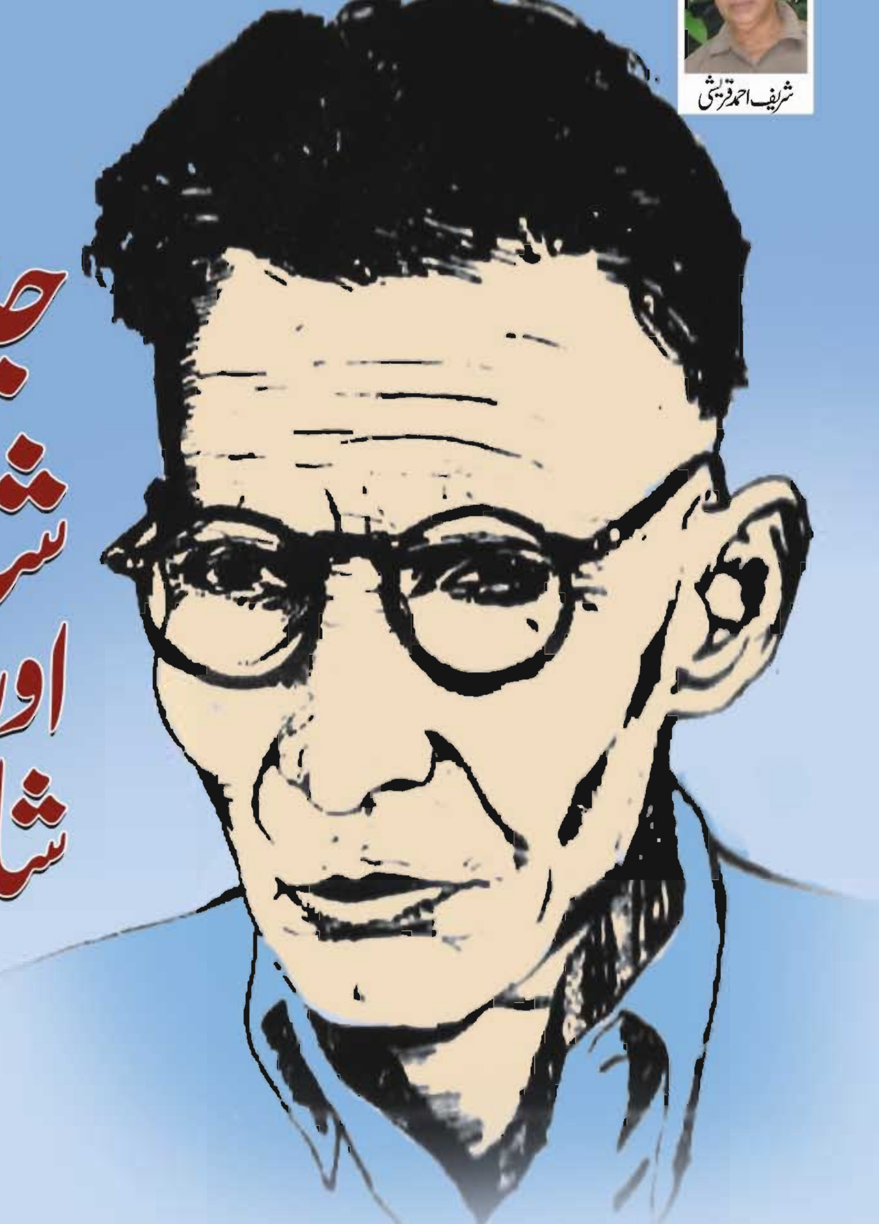

ہو چکا ہے خیر سے ہُشیار تو
اپنے دُشمن پر اُٹھا تلوار تو

شاد عارفی کا یہ پہلا شعر ہے جو انھوں نے تقریباً آٹھ سال کی عمر میں کہا تھا اس کے بعد وہ آٹھ نَو سال تک قافیہ پیمائی کرتے کرتے سنجیدگی کے ساتھ شعر کہنے لگے لیکن اُن کے پہلے شعر جیسے تیور اُن کے کلیات میں جا بجا نظر آتے ہیں جس سے اُن کی افتادِ طبع اور اُن کے مزاج کو بہ آسانی سمجھا جا سکتا ہے۔

شاد عارفی حالات و ماحول سے بہت جلد متاثر ہونے والے فنکار ہیں۔ وہ شعوری طور پر تغیراتِ زمانہ پر نظر رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حالات و ماحول کی تبدیلی کے ساتھ اُن کا رنگ و آہنگ بھی تبدیل ہوتا رہا ہے۔ اُن کے یہاں رنگیں نوائی بھی ہے اور شعلہ بیانی بھی۔ وہ خود کہتے ہیں :

وہ رنگیں نوائی، یہ شعلہ بیانی
کئی موڑ آئے مری شاعری میں

اُن کے یہاں پائی جانے والی شعلہ بیانی کی سب سے بڑی وجہ بے باکی، جرأت مندی، حق گوئی، سخت جذباتیت ہے۔ اُن کے کلام کا ایک بڑا حصّہ فوری ردِ عمل، جھنجھلاہٹ، طیش، طنز، خودداری، آن بان اور انا سے عبارت ہے۔ دراصل وہ اپنے دَور کے ایک نہایت بے باک، نڈر، جرأت مند اور جو دل میں آئے کہہ گزرنے والے شاعر ہیں۔

شاد عارفی کے عہد جوانی اور جوانی ڈھلنے کے بعد کے کلام میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ اُن کا بیشتر ابتدائی کلام روایتی، عاشقانہ، لکھنوی اور رام پوری رنگ و آہنگ سے مملو ہے۔ اُن کی غزلوں میں غزل کی روایت کے اثرات تو ضرور ہیں مگر اُن کے یہاں قدیم شعرا کے روایتی محبوب کے بجائے ذاتی تجربات اور ذاتی عشق کے نقوش زیادہ واضح ہیں۔ وہ جنسیت اور مادیت کے باوجود ہوس نا کی کے قائل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے بیشتر اشعار جذبۂ عشق کی پاکیزگی اور بلند کرداری کے آئینہ دار ہیں۔ اُن کے نزدیک:

عشق باہیں مروڑنے میں نہیں
شاعری پھول توڑنے میں نہیں
ساتھ کھیلے کی محبت بڑھ کے بن جاتی ہے عشق
اس سے زیادہ عشق کا اے شاد میں قائل نہیں

عمر کے ساتھ تجربات کی آنچ میں تپنے کے بعد جب وہ اپنے گرد و پیش کے ماحول، سماجی مسائل اور سیاسی حالات کو اشعار کے قالب میں ڈھال کر پیش کرتے ہیں تو اُن کے کلام میں انفرادیت اور تبدیلی رونما ہونے لگتی ہے جو بہت جلد اُن کی پہچان بھی بن جاتی ہے اور وہ جدید اُردو شعراء کی صف میں نمایاں طور پر نظر آنے لگتے ہیں۔ اُن کی اس دَور کی غزلیں ہوں یا نظمیں اُن میں کسی نہ کسی زاویے سے جدّت ضرور نظر

آئے گی۔ وہ نئی زندگی اور نئے مسائل کے مزاج داں بن کر اُبھرتے ہیں۔ وہ نہ صرف نئے احساسات کے ترجمان ہیں بلکہ نئے حالات کے نبض شناس بھی ہیں۔

دورِ جدید کے انسان کو نئی زندگی کی بے شمار اُلجھنوں اور نئے حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے جس کے سبب زندگی کے عام انداز میں تبدیلیوں کا رونما ہونا بھی ناگزیر ہے۔ شاد عارفی نے ان تبدیلیوں کو نہ صرف شعوری طور پر محسوس کیا بلکہ انھوں نے اپنے دَور کے سیاسی، سماجی اور دیگر ہنگامی مسائل کو فلسفیانہ شاعری کے بجائے اپنے مخصوص انداز میں بڑی خوبی سے نظم کیا ہے۔ پیش ہیں چند اشعار:

ہم خدا کے ہیں وطن سرکار کا
حکم چلتا ہے مگر زردار کا
خشک لب کھیتوں کو پانی چاہیے
کیا کریں گے ابرِ گوہر بار کا
ہمارے ہاں کی سیاست کا حال مت پوچھو
گھری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں
جس کی لاٹھی اُس کی بھینس ہے آج
کیا اسی کو کہیں گے جنتا راج
کان میں کہنے کی باتوں کا زمانہ لد گیا
نظمِ محفل جس کو سونپا ہے، وہ اس قابل بھی ہے
ہے تو احمق چوں کہ عالی شان کاشانے میں ہے
اس لیے جھک مارنا بھی اُس کا فرمانے میں ہے

شاد افغانی الاصل ہونے کے باوجود ذاتی تفریق اور قومی برتری و کمتری کو مستحسن نہیں سمجھتے۔ وہ اونچ نیچ اور بھید بھاؤ کے قائل نہیں۔ ہندوؤں کی ورن ویوستھا پر طنز کرتے ہوئے اس طرح اُپدیش دیتے ہیں:

ورنوں کا وشواس ہے 'مورکھ من کی' بھول
پھلواری کا رُوپ ہے رنگ رنگ کے پھول
شودر، ویش اور چھتری رکھتے ہیں کیوں بیر
بن میں تو لڑتے نہیں پیپل، سرس، ببول

شاد عارفی کے یہاں غمِ جاناں بھی ہے اور غمِ دوراں بھی۔ وہ حسن کی جلوہ سامانیوں، رنگینیوں، رعنائیوں اور عشق کی سرمستیوں سے پوری طرح واقف ہیں۔ اُن کی غزلیں جدید شعرا کی غزلوں کی طرح روایتی تغزل کے بجائے رومانیت اور حقیقت و واقعیت سے ہم آہنگ ہیں۔ اُن کا عشق خلائی یا تقلیدی نہیں بلکہ مجازی اور زمینی ہے۔ اُن کی عشقیہ شاعری محض جذباتی نہیں بلکہ انسانی زندگی کے بنیادی حقائق کی ترجمان ہے۔ انھوں نے اپنے کلام میں حسن و عشق کے جن معاملات، واردات اور کیفیات کو پیش کیا ہے اُن میں زندگی کے بنیادی حقائق نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ اُن کا عشق

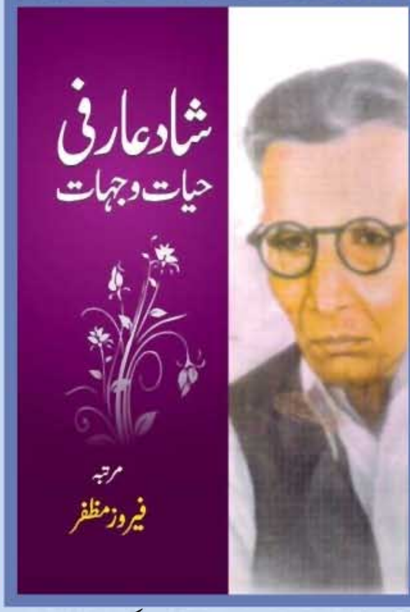

ایک عام انسان کے جذبات اور حرکات وسکنات کا آئینہ دار ہے جس کی نمود خارجی حالات کے بغیر ممکن نہیں۔ سماجی حالات اور واقعات کا بھی ان پر اثر انداز ہونا ناگزیر ہے۔ اُن کے یہاں نازِ حسن اور نیازِ عشق کی کارفرمائیاں تو ہیں مگر انھیں پیش کرنے کا انداز عمومی اور عام فہم ہے۔ ملاحظہ فرمائیں چند اشعار :

آتے ہی اپنے بستر پر
میں ہوتا ہوں اُس کے گھر پر
شبِ مہتاب وہ پھولوں کا زیور، منتشر زلفیں
بقولِ رازداں کیا خوش نما منظر رہا ہوگا
گدگدائے نہ بنے، ہاتھ دبائے نہ بنے
بن کے لیٹی ہو جوانی تو جگائے نہ بنے
کیا لکھ رہے ہیں آپ مجھے دیکھ دیکھ کر
مَیں نے دیا جواب غزل کہہ رہا ہوں مَیں
جوانی میں تکلف ہی سزا وارِ تبسم ہے
ہوا کرتی ہیں کلیاں بے حجاب آہستہ آہستہ
ہلکا سا تبسم ترے لب ہائے حسیں پر
مجبور نہ کر مجھ کو محبت کے یقیں پر

شاد عارفی کی بیشتر نظمیں جدید شاعری، طنز نگاری اور روزمرہ کے حالات و واقعات کا بہترین نمونہ ہیں۔ وہ اپنے عہد کے ابتر ماحول، سماج اور نظامِ حکومت سے سخت بیزار نظر آتے ہیں۔ وہ بطورِ طنز نگار اپنے مخالفین، ناپسندیدہ افراد اور خرابیِ نظام کی نکتہ چینی اور مذمت ہی نہیں کرتے بلکہ اُن کے عیوب سے پردہ اُٹھا کر اور انھیں برہنہ کرکے ہی دم لیتے ہیں۔ اُن کی پہلی نظم کا نام 'آپ کی تعریف' ہے جس میں انھوں نے معاشرے میں پھیلی ہوئی ایک عام برائی کی کھل کر عکاسی کی ہے۔ رنگیلے راجہ کی مَوت، ساس اور جبر وقدر جیسی نظمیں بھی طنز وحقائق کی بہترین مثالیں ہیں۔ انھوں نے رنگیلے راجہ کی مَوت میں انانیت، جبر وتشدّد، سرمایہ دارانہ نظام اور جابر حکمراں کے عبرت ناک انجام کی عکاسی کرتے ہوئے انقلاب وبغاوت کے آثار کی بھی اُمید کی ہے۔ سماج، شطرنج، رت جگا، دیہاتی لاری، ہلالِ عید، بھکارن اور بیوہ نہ صرف منفرد رنگ وآہنگ کی بہترین نظمیں ہیں بلکہ اپنے گرد وپیش کے ماحول کی ترجمان بھی ہیں۔ نظم 'گنگا اشنان' منظر نگاری، پیکر تراشی اور روانی کی بہترین مثال ہے۔ پیش ہیں چند اشعار:

وہ پھاٹ میں موجوں کے کوئی کھیل رہی ہے
وہ گھاٹ پہ بیٹھی ہے کوئی پاؤں پسارے
پانی میں اُترتی ہے کوئی پاؤں جما کر
ساحل پہ اُبھرتی ہے کوئی ہاتھ پسارے
پگھلے ہوئے بلّور کی لہروں میں جوانی
ٹھہرے ہوئے سیماب کے پہلو میں شرارے
وہ سوریا پوجا وہ ہری اوم کی جاپیں
زاہد بھی جو سُن لے تو ہری اوم پکارے

غزل ہو یا نظم شاد کسی کے مقلد نہیں۔ انھوں نے اپنے لیے خود اپنی راہ نکالی ہے۔ اپنی نظم گوئی کے متعلّق وہ خود کہتے ہیں :

''میری کوئی نظم ہوائی نہیں ہے۔ ہر نظم کا ماڈل میرے سامنے رہا ہے، شاعرانہ بناوٹ ضرور ہے مگر یہ کہ نظم بے سروپا ہو یہ قطعاً غلط تصور ہوگا۔''

کلامِ شاد کے مطالعے سے واضح ہے کہ وہ رجعت پسند نہیں بلکہ اپنے گرد وپیش کے ماحول کے شاعر ہیں اور اُن کا یہ کہنا حق بجانب ہے کہ :

مجھے اے شاد ان رجعت پسندوں سے تو کیا لینا
کرے گی یاد مستقبل کی تہذیبِ جواں مجھ کو

(ڈاکٹر شریف احمد قریشی)

Dr. Shareef Ahmad Quraishi, Rampur Phoota Mahal, Masjid Imli Wali Jain Mandir Road, Rampur - 244901 (UP)

مشتاق احمد وانی

اردو میں افسانچہ نگاری

ایک مختصر جائزہ

داستان، ناول، افسانہ، مختصر افسانہ اور افسانچہ یہ سب قصہ نگاری کی ارتقائی ترقی یافتہ صورتیں ہیں۔ جب انسان کے پاس آج کی طرح سائنسی و تکنیکی ذرائعِ تفریح نہیں تھے تو وہ خوابوں، خیالوں اور محیر العقول طویل قصے کہانیوں سے اپنے ذہن و دل کو سکون پہنچانے کی سعی کرتا تھا پھر جب صنعتی انقلاب آیا تو وہ خوابوں اور خیالوں کی دنیا سے باہر آ کر عملی میدان میں اترا، اب اس کے سامنے نئے مسائل اور حیات وکائنات کے حقائق نے سر ابھارا تو ناول وجود میں آیا کہ جس نے سماج و معاشرے میں رونما ہونے والے حالات و واقعات (جو اچھے یا برے جس نوعیت کے بھی تھے) کو فنی جامہ پہنا کر عوام کے سامنے پیش کیا۔ تیز رفتار تغیر پذیر حالات نے جب نئے انسان کی عقل وشعور میں مزید وسعت پیدا کی اور ساتھ ہی ساتھ گوناگوں سال میں گرفتار کیا تو اس کے پاس سیکڑوں صفحات پہ مشتمل ناولوں کو پڑھنے کے لیے وقت نہیں رہا۔ چنانچہ وقت کی کمی کے پیشِ نظر مختصر افسانہ وجود میں آیا۔ اب عصرِ حاضر کے انسان کے پاس اتنا وقت بھی نہیں رہا ہے کہ وہ دو یا تین صفحات پہ مشتمل کوئی کہانی پڑھ سکے۔ لہٰذا وہ چاہتا ہے کہ چلتے پھرتے، بس، ریل، ہوائی جہاز میں سفر کے دوران یا اپنا کوئی اہم کام کرنے کے ساتھ ساتھ ادب سے بھی لطف اندوز ہو یعنی وہ مختصر سے وقت میں بالکل مختصر سی کوئی ایسی کہانی پڑھنا چاہتا ہے جو چند سطروں پہ مشتمل ہو اور جو اسے زندگی کی تلخیوں سے تھوڑی دیر کے لیے باہر نکال سکے اسے شعورِ بصیرت فراہم کرنے کے ساتھ ہی ساتھ وہ انسانی نفسیات اور معاشرے کی موثر عکاسی بھی کرتی ہو۔ گویا اردو افسانچہ انسان کی متذکرہ بالا ذہنی، نفسیاتی اور وقت کی تنگ دامنی کے زیر اثر وجود میں آیا ہے۔ افسانچے کو افسانے کی ترقی یافتہ شکل قرار دیا جاسکتا ہے۔ میں افسانچہ کی تعریف میں یہ کہنا مناسب سمجھتا ہوں کہ کسی واقعے، جذبے، خیال، فکر اور کیفیت کو ایسے الفاظ میں بیان کر دینا کہ جو پر تجسس اور حیرت زا ہونے کے ساتھ قاری کی پوری توجہ اپنی جانب مبذول کرے اور مکالماتی انداز میں اس کا اختتام چونکا دینے والا ہو۔ یعنی چند سطور پہ مشتمل ایک حیران کن بیانیہ ہو۔ میرے اس بیان کی توثیق اردو کے ایک کہنہ مشق افسانچہ نگار جناب محمد بشیر مالیرکوٹلوی کے اس بیان سے ہوجاتی ہے۔ وہ افسانچہ کی تعریف ایک جگہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''افسانچہ ایسا ادب پارہ ہو جو طویل افسانے کا مزہ دے جس کو پڑھ کر قاری کی تشنگی بدستور قائم نہ رہے۔ بات مختصر ہو بلکہ مختصر ترین ہو لیکن مکمل ہو۔ اگر افسانچہ ان تین شرائط کو پورا کرتا ہے تو سمجھیے یہ واقعی افسانچہ ہے ورنہ ہلکا پھلکا واقعہ ہے۔ ایک کامیاب افسانچہ میں اسے ہی مانتا ہوں جسے پڑھ کر محسوس ہو کہ اس افسانچہ کو بنیاد بنا کر ایک طویل افسانہ بھی تخلیق کیا جاسکتا تھا۔ دو جملوں کا افسانچہ میرے نزدیک طویل افسانے کا نعم البدل نہیں ہوسکتا۔ افسانچہ کا موضوع بھرپور ہوجانا چاہیے جو آپ کہنا چاہتے ہیں چند لائنوں میں کہہ دیجیے، تشنگی رہ گئی تو یہ اپنا وزن کھودے گا۔ یہ بہت باریک اور مشکل کام ہے۔ تخلیق کے عمل کے دوران بہت احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔''

(محمد بشیر مالیرکوٹلوی 'جگنو شہر' (افسانچے)، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2011، ص 13 تا 15)

افسانچہ اور پھر عمدہ افسانچہ لکھنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ معمولی سی چوک چاہے وہ کسی بھی نوعیت کی ہو قاری کے ادبی ذوق اور اس کے ذہنی حظ کو بدمزگی میں بدل دیتی ہے۔ اس لیے افسانچہ نگار کے پاس ایسا عمدہ تخلیقی شعور ہونا چاہیے کہ وہ اپنے قاری کو افسانچہ کی ابتدائی سطور میں ہی اپنی گرفت میں لے لے اور آخری سطور میں اسے دور اور دیر تک بہت کچھ سوچنے کے لیے چھوڑ دے۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ اردو افسانچہ کی ابتدا اردو کے بیباک، منفرد اور سماج کی بدترین صورت حال کے عکاس و نباض افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کے ہاتھوں ہوئی۔ بلاشبہ منٹو کے 'سیاہ حاشیے' کو اردو افسانچہ نگاری کا نقشِ اوّلین قرار دیا گیا ہے۔ منٹو کے زمانے سے لے کر اب تک تقریباً ستر سال کا عرصہ اردو افسانچہ نگاری سے تعلق رکھتا ہے۔ منٹو کے بعد جن افسانچہ نگاروں نے اردو افسانچہ نگاری کی روایت کو مستحکم کیا ان میں مشہور و معروف شاعر و ناقد پروفیسر مظفر حنفی، ممتاز فکشن نگار جوگندر پال، رتن سنگھ اور ان کے ہمعصروں میں رام لعل، شین مظفر پوری، بشیشر پردیپ، ہرچرن چاولہ، واجدہ تبسم، عطیہ پروین، جیلانی بانو شامل ہیں۔

بیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں نیم ادبی رسائل و جرائد نے اردو افسانچہ نگاری کے لیے راہ ہموار کی۔ ان میں

ماہنامہ 'شمع'، 'روبی'، 'فلمی ستارے'، 'گلفام' اور 'کہکشاں' وغیرہ شامل ہیں۔ یہ بات یہاں قابل ذکر ہے کہ 1975 میں جوگندر پال نے اورنگ آباد میں اپنے قیام کے دوران جب اپنے افسانچوں کا مجموعہ 'سلوٹیں' کے نام سے شائع کروایا تو اردو کے ادبی حلقوں میں نہ صرف مجموعے کی خوب پذیرائی ہوئی بلکہ نئے لکھنے والوں کو افسانچہ لکھنے کی تحریک ملی اور پھر دیکھتے دیکھتے یکے بعد دیگرے کئی افسانچوں کے مجموعے منظر عام پر آئے مثلاً رونق جمال کا 'قتل کا موسم'، ڈاکٹر ایم آئی ساجد کا 'یادوں کے سائباں'، عظیم راہی کا 'پھول کے آنسو'، عارف خورشید کا 'آتشیں لمحوں میں' اشفاق احمد کا 'یہ دھواں کہاں سے اٹھتا ہے' شکیل سعید کا 'ایک ادھوری نظم' محمد قیوم میو کا 'رشتوں کا کرب' اور بلند پایہ افسانہ نگار قاضی مشتاق احمد کا 'قطرہ قطرہ' مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

بیسویں صدی کی آخری اور اکیسویں صدی کی پہلی دہائی کے دورانیے میں افسانچوں کے کئی مجموعے منظرعام پر آ چکے ہیں۔ نئی نسل کے افسانچہ نگاروں نے حتی المقدور اپنی تخلیقی صلاحیت کو افسانچہ نگاری کے لیے مختص کر دیا ہے۔ افسانچہ نگاری کے اس کارواں میں نئے اور پرانے دونوں طرح کے قلمکار شامل ہیں۔ اس سلسلے میں ساحر کلیم کا مجموعہ 'موم کی گڑیا' عظیم راہی کا 'درد کے درمیاں' ممتاز افسانہ نگار عبدالعزیز خان کا 'فساد کرفیو اور کرفیو کے بعد'، فیروز خان کا 'تیر نیم کش' اور ناگپور سے اشفاق احمد کا 'ایک زخم اور سہی' اور نذیر فتح پوری کا 'ریزہ ریزہ دل' ممبئی کے اکبر عابد کا 'چپ چاپ' محمد اظہر فاضل کا مجموعہ 'آنسوؤں کی چیخ' اور رفیع الدین مجاہد کا چنگاریاں جیسے افسانچوں کے مجموعے اس کا ثبوت فراہم کرتے ہیں کہ اردو افسانچہ نگاری بتدریج ارتقائی منزلیں طے کر رہی ہے۔ یہاں یہ واضح رہے کہ متذکرہ افسانچہ نگاروں کا تعلق مہاراشٹر سے ہے۔

مہاراشٹر کے علاوہ دوسری ریاستوں میں بھی اردو افسانچہ نگاری کی ایک شاندار کارکردگی دیکھنے میں آتی ہے۔ نئے اور پرانے افسانچہ نگاروں کی ایک طویل فہرست مرتب کی جاسکتی ہے۔ آندھرا پردیش میں حیدرآباد کے رحیم انور نے اپنے سات افسانچوں کے مجموعے شائع کر کے قصہ نگاری کی اس جدید ترین صنف کو مقبولِ عام بنانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ ان کے علاوہ طٰہٰ آنندی، مجید سلیم، جلیس بھارتی، رفیق جعفر، ضامن علی حسرت، مجتبیٰ فہیم، محمد انیس فاروقی اور قدیر دانش نے عمدہ افسانچے لکھے ہیں۔ بہار میں کئی افسانہ نگار ہیں جنھوں نے اچھے افسانچے تخلیق کیے ہیں۔ مثلاً اقبال حسین آزاد کے مجموعہ 'قطرہ قطرہ احساس'، 'مردم گزیدہ'، اختر آزاد کے 'بابل کا مینار'، نسیم محمد جان کے 'گھڑی کی سوئیاں' اور ایم اے حق کے 'نئی صبح' میں اچھے افسانچے شامل ہیں۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، ہمہ جہت ادبی شخصیت ہیں، انھوں نے بھی افسانچے کی طرف خصوصی توجہ دی ہے۔ جھارکھنڈ کی طرف نظر اٹھا کر دیکھیں تو اسلم جمشید پوری، احمد صغیر، قاسم خورشید، فاروق راہب، نوشاد آزاد عالم، اختر رومانی، محمد اشرف، مجیر احمد آزاد، حسن رہبر، صغیر رحمانی اور فخر الدین عارفی جیسے معتبر نام اردو افسانچے سے جڑے ملتے ہیں۔ مدھیہ پردیش اور چھتیس گڑھ کے رتن سنگھ نہ صرف اردو افسانہ بلکہ اردو افسانچہ نگاری میں بھی ملک گیر اہمیت رکھتے ہیں جنھوں نے اپنے افسانچوں کا مجموعہ 1990 میں 'مانک موتی' کے نام سے شائع کروایا۔ ان کے علاوہ علی عباس امید، کوثر صدیقی، نثار راہی، سکندر حمید عرفان اور خالد عبادی نے بھی اردو افسانچے کو اپنا ادبی مشغلہ بنایا۔

1975 میں جوگندر پال نے اورنگ آباد میں اپنے قیام کے دوران جب اپنے افسانچوں کا مجموعہ 'سلوٹیں' کے نام سے شائع کروایا تو اردو کے ادبی حلقوں میں نہ صرف مجموعے کی خوب پذیرائی ہوئی بلکہ نئے لکھنے والوں کو افسانچہ لکھنے کی تحریک ملی اور پھر دیکھتے دیکھتے یکے بعد دیگرے کئی افسانچوں کے مجموعے منظر عام پر آئے مثلاً رونق جمال کا 'قتل کا موسم'، ڈاکٹر ایم آئی ساجد کا 'یادوں کے سائباں'، عظیم راہی کا 'پھول کے آنسو'، عارف خورشید کا 'آتشیں لمحوں میں' اشفاق احمد کا 'یہ دھواں کہاں سے اٹھتا ہے' شکیل سعید کا 'ایک ادھوری نظم' محمد قیوم میئو کا 'رشتوں کا کرب' اور بلند پایہ افسانہ نگار قاضی مشتاق احمد کا 'قطرہ قطرہ' مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

رونق جمال کا تعلق بھی چھتیس گڑھ ہی سے ہے۔ ان کے افسانچوں کے پانچ مجموعے 'قتل کا موسم'، 'قوس قزح'، 'زہریلے انسان'، 'پھول کھلنے دو' اور 'پنجرے کا آدمی' شائع ہو چکے ہیں۔ کرناٹک میں جن افسانہ نگاروں نے افسانچے کی طرف خصوصی توجہ دی ان میں حمید سہروردی اور نئی نسل میں وحید انجم، شکیب انصاری، ناظم خلیلی، ضیا جعفر، سمیرا حیدر، محمد رحیم، یوسف بدری، آصف درویش، منظور وقار، اکرام نقاش، مشتاق سعید، کوثر پروین، خرم عماد سہروردی، اور محمد ہارون سلیم سیٹھ وغیرہ کے نام شامل ہیں۔ ریاست جموں و کشمیر میں بھی اردو افسانچہ نگاروں کی تعداد میں دن بہ دن اضافہ ہو رہا ہے۔ یہاں جن ادیبوں نے عمدہ افسانچے لکھے ہیں ان میں نور شاہ، حسن ساہو، آنند لہر، اشوک پٹواری، دیپک بدکی، ویریندر پٹواری، شیخ بشیر احمد، وحشی سعید، زاہد مختار، راجہ یوسف اور عبدالغنی شیخ لداخی کے علاوہ کچھ اور بھی نئے نام اردو افسانچہ نگاری میں طبع آزمائی کرنے میں کامیاب دکھائی دے رہے ہیں۔

پنجاب اور ہریانہ کی سرزمین ہر لحاظ سے زرخیز رہی ہے۔ اردو افسانچہ نگاری کو یہاں جن ادیبوں نے بام عروج پر پہنچایا ان میں کرشن پرویز، کیدار ناتھ شرما، ہری چند کوشک، آر ڈی شرما تاثیر، راجیش بھاٹیہ، انوار انجم، انوار احمد انصاری، راجندر ورما، محمد بشیر مالیرکوٹلوی، سالک جمیل براڑ، ڈاکٹر رینو بہل، نوجوان افسانچہ نگاروں میں ناصر آزاد، ارشد منیم وغیرہ افسانچہ نگاری میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ محمد بشیر مالیرکوٹلوی کا خالص افسانچوں کا مجموعہ 'جگنو شہر' نہایت دلچسپ اور معاشرے کی موثر عکاسی سے تعلق رکھتا ہے۔ تامل ناڈو اور کیرلا میں علیم صبا نویدی نے اردو افسانچہ کی طرف خاص توجہ دی ہے۔ منیر ارمان نسیمی کا تعلق اڑیسہ سے ہے۔ ان کے طنزیہ مزاحیہ مضامین اور افسانچوں کا مجموعہ 'آ بیل مجھے مار' ادبی حلقوں میں کافی مقبول ہوا۔ گجرات اور راجستھان میں مشکور احمد قریشی اور حسن جمال نے چند اچھے افسانچے لکھے ہیں۔ مغربی بنگال میں جن افسانہ نگاروں نے اس صنف کو بطورِ خاص اپنایا ان میں عشرت بیتاب، بشیر احمد، عشرت جلیل، سلیم خان ہمراز، نذیر احمد یوسفی، مشتاق اعظمی، ساجدہ عندلیب، فیروز ساجد، رفیع حیدر اور فرس اعجاز کے نام قابل ذکر ہیں۔ دہلی اور اتر پردیش میں افسانہ نگاروں کی خاصی تعداد رہی ہے لیکن اردو افسانچہ نگاری کی طرف ذرا کم توجہ دی گئی ہے۔ میرٹھ سے تعلق رکھنے والے ممتاز شاعر و ادیب طالب زیدی نے 'پہلا پتھر' نام سے افسانچوں کا مجموعہ شائع کروایا ہے۔ ڈاکٹر حفیظ خان کے افسانچوں کا مجموعہ 'پیوند' اقبال انصاری کا مجموعہ 'ابھی' ادبی حلقوں میں مقبول ہوا۔ ان کے علاوہ مستحسن عزم، صغیر اشرف، فضل امام ملک، اشفاق برادر، سعید ریاض، احسان ثاقب، سہیل جامی، ڈاکٹر شبیر صدیقی، وقار انور، ایس ایم فضیلت، شکیل جاوید، نسیم بن عاصی، سعید فریدی اور نیل آکاش ایسے نام ہیں جنھوں نے افسانے اور افسانچے لکھ کر اس صنف کو فروغ بخشا ہے۔

بیرون ہند کے بہت سے ادیبوں نے بھی افسانچہ نگاری کو اپنا ادبی مشغلہ بنایا ہے۔ بنگلہ دیش، پاکستان، کناڈا اور کچھ دوسرے ملکوں میں جہاں اردو تہذیب و مزاج کے لوگ رہتے ہیں افسانچے میں اپنا ایک مقام بنایا ہے۔

■

Dr. Mushtaq Ahmad Wani, Lane No3, House No 7, Firdousabad Sunjwan, Jammu Tawi - 180011

شاہین سلطانہ

بہار کے افسانہ نگاروں کا اسلوب

اردو افسانہ کی تاریخ تقریباً ایک صدی سے زیادہ عرصے پر محیط ہے اور اردو افسانہ اپنے آغاز کے ساتھ مسلسل ارتقائی عمل سے گزرتا نظر آتا ہے۔ افسانہ کی تاریخ دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ افسانہ کے ارتقا میں صوبہ بہار کا بہت بڑا حصہ رہا ہے۔ بہار کے افسانوی ادب اور اردو افسانوں کے اسلوب کے بارے میں پروفیسر وہاب اشرفی اپنی کتاب 'بہار میں اردو افسانہ نگاری' میں لکھتے ہیں:

''بہار میں افسانہ نگاری کی ایک مربوط ارتقا پزیر تاریخ ہے۔ فن افسانہ کے عمومی ارتقا کی طرح بہار میں داستانیں اور منظوم قصے لکھے گئے۔ پھر ناول کا عہد آیا اس کے بعد ایسے مختصر غیر مربوط نثری قصے لکھے گئے جنھیں افسانے کی ارتقائی صورت تو کہہ سکتے ہیں لیکن باضابطہ افسانہ کہنا غلط ہے۔ ہفتہ وار اپنچ کی اشاعت 1885 سے شروع ہوئی اس وقت تک بہار میں کئی قابل لحاظ ناول لکھے جا چکے تھے لیکن 'اپنچ' لکھنے والوں میں مزاح نگاری کی طرف خصوصی لپک تھی۔ مثلاً ادیب عظیم آبادی، اکبر داناپوری، ظریف در بھنگوی، دہقانی راجگیری، حکیم دسنوی بہاری، ظریف پاشا، زندہ دل عظیم آبادی، عرش گیاوی وغیرہ۔ (بہار میں اردو افسانہ نگاری: وہاب اشرفی، ص 9)

وہاب اشرفی کے اقتباس میں جن افسانہ نگاروں کا تذکرہ ہوا ہے ان میں سب کے سب بہار کی سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں اور آزادی سے قبل کے افسانہ نگار ہیں۔ بہار میں آزادی سے پہلے جب ہم افسانوی اسلوب کی بات کرتے ہیں تو چونکہ وہ اردو افسانہ کا ابتدائی دور تھا اس لیے بہار میں اردو افسانہ کے ابتدائی جائزے سے اسلوب کا صحیح اندازہ لگ سکتا ہے۔ چونکہ ابتدائی دور بتدریج ترقی پزیری کا دور تھا اس لیے افسانے کا اسلوب بھی اپنے ہیئت کے ساتھ ترقی پزیری کے مراحل سے گزرا۔ 1930 میں اردو افسانوں کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ اس دور کے اہم افسانہ نگاروں میں ڈاکٹر اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، شکیلہ اختر، سید محمد محسن عظیم آبادی، جمیل کندھائی پوری، الیاس اسلام پوری وغیرہ کے نام خصوصی طور پر قابل ذکر ہیں۔ مسلم عظیم آبادی، ساقی عظیم آبادی اور جمیل مظہری یہ تین ایسے افسانہ نگار ہیں جن کا تعلق اس عہد سے قبل رہا ہے۔ اس دور کا آغاز پروفیسر اختر اورینوی سے ہوتا ہے جن کی حیثیت اردو ادب میں ایک ایسے بلند مینار کی ہے جس کی روشنی دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ وہ ایک اچھے انشا پرداز ہیں اور ان کے افسانوں میں ہندی لفظوں کا استعمال زیادہ تر دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کے بیشتر افسانوں کو پڑھنے سے پریم چند اور کرشن چندر کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔

اختر اورینوی نے 1927 میں افسانہ نگاری کی ابتدا کی۔ ان کی رفیقۂ حیات (جو ایک مشہور افسانہ نگار بھی ہیں) شکیلہ اختر نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے:

''ان کا پہلا افسانہ 'رتنا' ہے جو شائع نہیں ہوا اس کے بعد انھوں نے 'بدگمانی' کے عنوان سے ایک افسانہ لکھا جو بہارستان پٹنہ میں مئی 1931 میں شائع ہوا۔''

ان کے کئی افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں منظر و پس منظر، سیمنٹ اور ڈائنامائٹ، کلیاں اور کانٹے، انارکلی اور بھول بھلیاں اور سپنوں کے دیس میں، کینچلیاں اور بال جبریل شامل ہیں۔ اختر اورینوی کے افسانے عموماً خالص فکری ہوتے ہیں۔

سہیل عظیم آبادی

دراصل سہیل عظیم آبادی بہار کے بہت ہی ممتاز افسانہ نگار ہیں۔ سہیل نے اپنے افسانوں میں فطری اسلوب اختیار کیا ہے۔

سہیل عظیم آبادی نے افسانہ نگاری کی ابتدا 1930 سے کی تھی۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'الاؤ' جس کی اشاعت 1942 میں ہوئی تھی اس میں شامل افسانے 'الاؤ' اندھیرے اور اجالے میں، دوسرا دور، کھویا ہوا لال، جوار بھاٹا، چوکیدار، ٹوٹا ہوا تارا، شرابی، وہ رات، بیچارہ، جوانی، پیٹ کی آگ اور بھوک ہے جس میں ایک سادہ اسلوب کسان اور مزدوروں کی سماجی زندگی کے حالات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ سہیل عظیم آبادی کے افسانوں میں دیہات کا ماحول اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ موجود ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں امرا اور زمین داروں کے عیش و عشرت و رعونت کبر اور انا اور تہذیب کے کھوکھلے پن کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں کسانوں اور مزدوروں کے رنگ و روپ کو بہت ہی اچھے اسلوب کے ساتھ اجاگر کیا ہے کہ سماج کی اندرونی حقیقت ہماری نگاہوں سامنے آجاتی ہیں۔ مثلاً افسانہ 'دو مزدور' کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''ضمیر کو ذرا غصہ آگیا۔ وہ بولا۔

''پھول یونین یونین بکتا ہے گریب کو وہاں بھی کوئی نہیں پوچھتا۔ اب ہم کھد یونین کے مارے بھئے ہیں۔ دیکھ ہم سب کو ساٹھ روپیہ مہینہ ملتا تھا ہڑتال ہوا یونین والے بھاگ گئے سب سالے تو نوکر ہو گئے۔ ہم کو دیکھ اب بیس روپیہ مہینہ پر سر مار رہے ہیں مصیبت میں کوئی کسی کا نہیں ہوتا ہے۔ اب اب کوئی یونین والا پوچھنے بھی نہیں آتا۔ مہینہ بھوک مر مر کے کاٹا ہے۔''

بلاتی نے بہادرانہ شان سے جواب دیا:

''بس اتنے میں ہی ٹھنڈے ہو گئے، کاہے کو گئے تھے یونین میں تب۔''

اس اقتباس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ سہیل عظیم آبادی نے مزدوروں کی حالت کو بیان کرتے ہوئے بالکل سادہ صاف اور فطری اسلوب اختیار کیا ہے۔

شکیلہ اختر

بہار کی افسانوی زلف کو سنوارنے میں جہاں ایک طرف مرد فنکاروں نے بیش بہا خدمات انجام دی ہیں وہیں اردو افسانوں میں خواتین کی خدمات بھی کسی طرح کم نہیں ہیں۔ بہار کی پہلی افسانہ نگار خاتون شکیلہ اختر ہیں۔ وہ پروفیسر اختر اورینوی کی شریک حیات تھی۔ شکیلہ اختر کا شمار ہندوستان کے تین عظیم ترین خواتین افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے یعنی عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر اور شکیلہ اختر۔

شکیلہ اختر کا پہلا افسانہ 'رحمت' ہے جو اسلوب کے لحاظ سے اردو افسانے کا ابتدائی سانچہ ہے اس افسانے کی اشاعت رسالہ 'ادب لطیف' میں 1936 میں ہوئی۔ درپن، آنکھ مچولی، ڈائن، آگ اور پتھر، لہو کے پھول جیسے ان کے پانچ افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ شکیلہ اختر کے افسانوں میں دراصل روزمرہ کی زندگی کا نشیب و فراز دیکھنے کو ملتا ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش کے حالات و کوائف کی رازداں ہیں اور وہ انھیں بڑے سلیقے، فنکاری اور سادہ اسلوب میں اپنے افسانوں میں برتنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے افسانوں میں بہار کے متوسط مسلم گھرانوں کی ایسی تصویریں ملتی ہیں جن کے چہروں پر مسرت کے مٹے مٹے آثار نظر آتے ہیں۔ شکیلہ اختر نے گھر میں بند رہ کر افسانے نہیں لکھے بلکہ وہ معاشرے کی گلیوں میں گھوم کر 'ڈائن' جیسے افسانے بھی لکھ چکی ہیں۔ ان کے افسانہ 'ڈائن' کے اقتباس سے ان کے اسلوب کو سمجھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔

''بڑھیا نے اپنی لال لال آنکھوں سے گھور کر اپنی دیورانی کی حریص نظروں کو دیکھا جو ایک ٹک سے پلنگ پر دھرے ہوئے پیسوں کو تک رہی تھی۔ اس سوا روپیہ سے دن نا کٹ جائی۔''

اس نے اپنی دیورانی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ گھر کے لوگوں نے ہزار جتن کیے کہ وہ کسی طرح سے پیسے لے لے۔ مگر بڑھیا کسی طرح سے بھی پیسے چھونے کی روادار نہ ہوئی اور جس طرح سے وہ ڈگمگاتی ہوئی خالی ہاتھ آئی تھی اسی طرح سے بائیں پہلو پر جھکی لاٹھی کے سہارے چلتی ہوئی وہ گھر سے باہر نکل گئی۔ گھر کے سارے لوگ اس کو حیرت سے دیکھتے رہے۔

''وہ پگلی ہے پگلی سالی'' فیضو نے قہقہہ لگایا مگر جوہیا اس کے جاتے ہی کھل کر ذرا زور سے بولی۔ ڈائن تھی جی اللہ قسم! پکی ڈائن۔ اور روش نے اپنے گود کی بچی کو چمکارتے ہوئے سوچا کہا وہ سچ مچ ڈائن تھی، ڈائن۔؟''

(افسانہ 'ڈائن' شکیلہ اختر)

شکیلہ اختر کا پہلا افسانہ 'رحمت' ہے جو اسلوب کے لحاظ سے اردو افسانے کا ابتدائی سانچہ ہے اس افسانے کی اشاعت رسالہ 'ادب لطیف' میں 1936 میں ہوئی۔ درپن، آنکھ مچولی، ڈائن، آگ اور پتھر، لہو کے پھول جیسے ان کے پانچ افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ شکیلہ اختر کے افسانوں میں دراصل روزمرہ کی زندگی کا نشیب و فراز دیکھنے کو ملتا ہے۔ وہ اپنے گرد و پیش کے حالات و کوائف کی رازداں ہیں اور وہ انہیں بڑے سلیقے، فنکاری اور سادہ اسلوب میں اپنے افسانوں میں برتنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے افسانوں میں بہار کے متوسط مسلم گھرانوں کی ایسی تصویریں ملتی ہیں جن کے چہروں پر مسرت کے مٹے مٹے آثار نظر آتے ہیں۔

افسانہ 'ڈائن' کے مذکورہ اقتباس سے شکیلہ اختر کے افسانوی اسلوب کی وضاحت ہوتی ہے کہ کس طرح رواں، سادہ اور فطری زبان میں روزمرہ کے حقائق کو اپنے افسانوں میں پیش کرتی ہیں۔

پیاسی آنکھیں، ننگی آنکھیں، آگ اور پتھر، بھٹکی ہوئی منزل اور کئی دیگر افسانے ہیں جن میں شکیلہ اختر کی سادہ اسلوب نگاری اور امتیازی خصوصیت نظر آتی ہے۔

سید محمد محسن عظیم آبادی

محسن عظیم آبادی کی اصل شہرت یہ ہے کہ وہ نفسیات کے ماہر پروفیسر کی حیثیت سے ملک بھر میں تسلیم کیے جاتے ہیں۔ محسن عظیم آبادی کے مشہور افسانوں میں 'انوکھی مسکراہٹ' سرفہرست ہے اس افسانہ میں محسن صاحب نے جمنی کے کردار کا جو نفسیاتی تجزیہ کیا ہے وہ قابل قدر ہے۔ افسانہ انوکھی مسکراہٹ سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''محلہ میں کوئی موت ہوئی تو جمنی وہاں ضرور پہنچتی اور دور کھڑی ہو کر مسکراتی رہتی اس کی اس انوکھی مسرت کا ہر جگہ چرچا ہونے لگا اور محلہ والے اسے مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ حنیف کو بھی اس کی بھنک ملتی رہی وہ جمنی سے اس بابت سوال کرتا تو جمنی مخبوط سراسیمہ سی ہو جاتی۔ ایسا معلوم ہوتا کہ ایک بے گناہ پر جرم کا الزام لگایا جا رہا ہے۔ حنیف نے جمنی کو تاکید کر دی کہ وہ آئندہ کسی کی موت کی خبر سن کر وہاں نہ جایا کرے۔ جمنی نے اس کا وعدہ بھی کر لیا لیکن جب کبھی اسے موت کی خبر ملتی اس کے قدموں میں بجلی کی سی پھرتی آ جاتی اور وہ غیر ارادانہ گھر سے نکل جاتی۔ حنیف کو جمنی سے کچھ خوف ہونے لگا تھا۔ (انوکھی مسکراہٹ: محسن عظیم آبادی)

اس اقتباس سے 'انوکھی مسکراہٹ' کے مرکزی کردار جمنی کی مسکراہٹ کا نفسیاتی اندازہ ہوتا ہے اور افسانہ نگار نے اپنے فطری اسلوب سے جمنی کے کردار کا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے۔

جمیل احمد کندھائی پوری

جمیل احمد کندھائی پوری کا افسانوی سفر 1934 سے شروع ہوتا ہے۔ ان کا پہلا افسانہ 'فروزہ' 1934 میں رسالہ 'عالمگیر' میں شائع ہوا۔ ان کے تین افسانوی مجموعے بھی شائع ہوئے ہیں۔ پہلا مجموعہ 'آغاز و انجام' 1941 میں شائع ہوا۔ اس کے بعد 'طلوعِ غروب' اور 'ربابِ شکنہ' دو مجموعے ایسے ہیں جو تشنہ طباعت ہیں۔

جمیل احمد کندھائی پوری کے افسانوں میں آزادی سے قبل کا روایتی اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ چنانچہ ان کا ایک مشہور افسانہ 'مزدور کا بیٹا' میں طبقاتی کشمکش کی جیتی جاگتی تصویر قابل مثال ہے۔ اس افسانے میں مزدوروں کے تقریباً تمام معاشی و سماجی مسائل کو دیے گئے۔ ان کا ایک اور افسانہ 'نجات' ایسا افسانہ ہے جس میں غربت و افلاس کی ایک ہیبت ناک صورت سامنے آتی ہے۔ اس طرح افسانہ 'ملازمت' میں بیروزگاری کا مسئلہ پیش کیا گیا ہے۔

مختصر یہ کہ جمیل احمد کندھائی پوری اپنے عہد کے سلگتے مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بناتے ہیں اور اس ضمن میں ناداروں اور مزدوروں کے احوال پر خصوصی نظر رکھتے ہیں۔

اختر قادری

بہار میں ابتدائی افسانہ نگاری کے دور میں ایک نام اختر قادری کا بھی ہے۔ اختر قادری کا افسانوی سفر 1933 سے

شروع ہوتا ہے اور 1945 تک مسلسل اس صنف سے وابستہ رہے۔ ان کے چند افسانے طویل بھی ہیں لیکن زیادہ تر افسانے مختصر ہیں۔ ان کے مختصر افسانوں میں شاعرانہ اسلوب ہے۔ یہ اسلوب دراصل 'ادب لطیف' سے متاثر ہوکر لکھے گئے۔ موت، راز محبت، فرض، نقاب، اہنسا اور پٹھان کا خواب وغیرہ اختر قادری کے وہ افسانے ہیں جو اسلوب کے لحاظ سے افسانے کے زمرے میں آتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں 'اہنسا' نہایت اہم ہے کیونکہ قومی یک جہتی کے نقطہ نظر سے یہ افسانہ آج بھی مثالی ہے۔ اس سلسلے میں افسانے کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''صبح سویرے تھانہ پر انگریز ایس پی تحقیقات کے لیے آئے سادھو جی سے انھوں نے تنہائی میں کچھ باتیں کیں اور ان کا نام بلوائیوں کی فہرست سے کاٹ کر انھیں چھوڑ دیا باقی ملزموں پر متعدد دفعات کے تحت فوجداری کی سنگین کارروائی شروع ہوگئی۔

لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی کہ آخر یہ سادھو جی کیوں چھوڑ دیے گئے لیکن ایک وطن دوست نے انکشاف کیا کہ یہ حضرت بدیسی حکومت کے ایک ایجنٹ تھے۔ انھوں نے محض آپس کے تعلقات کو بگاڑنے کے لیے سادھو کا سوانگ بھرا تھا۔''

لالہ جی اس واقعہ کے دوسرے ہی دن کاشی جی سے واپس آئے اس سانحہ کی خبر سے انھیں بہت دکھ ہوا۔ بالآخر ان ہی کی کوشش سے ہمارے مقدمات اٹھا لیے گئے اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں تصفیہ ہوگیا۔ اس واقعہ کے بعد لالہ جی کچھ زیادہ دن نہ بچے۔ لیکن جب تک زندہ رہے جب کبھی اتم ذات اور اچھوت یا ہندو و مسلم کشیدگی کی خبر سنتے تو بے چین ہوجاتے اور حسرت سے کہتے کہ:

نئے جھگڑے نرالی کاوشیں ایجاد کرتے ہیں
وطن کی آبرو اہل وطن برباد کرتے ہیں

(افسانہ: اختر قادری مشمولہ بہار میں اردو افسانہ نگاری، ص 225)

مذکورہ اقتباس میں اختر قادری نے قومی یکجہتی کے جذبہ کو سادہ اسلوب میں فروغ دینے کی کوشش کی ہے۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ اختر قادری کے فن پر مقصدیت کی گہری چھاپ ہے اور کم وبیش ان کے تمام افسانے اسی نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتے ہیں۔

شین مظفر پوری

آزادی سے قبل بہار کے افسانہ نگاروں میں شین مظفر پوری کا نام بھی بہت اہم ہے۔ شین مظفر پوری نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ترجمہ سے کیا پھر افسانہ نگاری کی طرف بھی مائل ہوئے۔ ان کے ابتدائی افسانوں کو اگر پیش نظر رکھا جائے تو شین کا رشتہ پہلے دور کے افسانہ نگاروں سے قائم ہوجاتا ہے کیونکہ 1940 سے ہی ان کے طبع زاد افسانے شائع ہونے لگے تھے۔ چنانچہ دل کی کروٹ، باغی ادیب کا خط اور بھیک اسی دور کے افسانے ہیں جو 'سہیل' گیا میں شائع ہوئے۔

شین مظفر پوری کے دو افسانوی مجموعے 'کڑوے گھونٹ' اور 'آوارہ گرد کے خطوط' شائع ہوچکے ہیں۔ اگر مجموعہ 'کڑوا گھونٹ' کے افسانے کو ہی پیش نظر رکھیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس مجموعہ میں 'دستک' ایک ایسا افسانہ ہے جو اردو کے معیاری افسانوں کی فہرست میں سرفہرست رکھے جانے کے لائق ہے۔ اس مجموعہ کے دوسرے افسانے مثلاً غسار، بے زبان اور جراثیم وغیرہ بھی خاصے اہم اور معیاری افسانے ہیں۔

بہار میں آزادی سے قبل کے افسانہ نگاروں میں الیاس اسلام پوری بھی ہیں جن کا رشتہ آزادی کے بعد دور کے بعد سے بھی ہے۔ ان کا پہلا افسانہ 'ظلم و استبداد کے خلاف ایک جنگ' کے عنوان سے رسالہ 'نگار' میں 1935 میں شائع ہوا۔ اس کے بعد وہ مسلسل لکھتے رہے۔ ان کے افسانے 'ساقی' اور 'شمیم' جیسے رسالوں میں بھی شائع ہوئے۔ اس کے بعد وہ مسلسل لکھتے رہے۔ ان کے افسانوں میں الہام آزادی، تجدید محبت، ڈھائی سیر چنا، دیوانہ، پریم چند کی بھول بھلیا، نور و ظلمت، چمار، ماڈل و لیچ، اور ہیروئن وغیرہ۔ اس کے علاوہ 1940 تک کئی رسالوں میں وہ لگاتار چھپتے رہے۔

ان کہانیوں کو جنسی افسانہ نہیں کہہ سکتے کیونکہ ان افسانوں میں ہمیں سماجی و معاشرتی زندگی کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

جنسی مسائل سے متعلق شین مظفر پوری کا ایک افسانہ 'انمول' مطالعہ کے لائق ہے جس کا موضوع بظاہر تو قحط اور غربت ہے لیکن انھوں نے بڑی چابکدستی کے ساتھ اسے جنسی مسائل سے جوڑ دیا ہے۔ مثال کے طور پر افسانہ 'انمول' کا ایک اقتباس ملاحظہ کیجیے:

''انوکھی اس کا منہ تکنے لگی اسی لمحہ وہ واقعی خود کو ذلیل اور حقیر محسوس کررہی تھی۔ ایک ایسی سنسنی اور بیکار چیز جو ایک مٹھی اناج کے عوض میں مہنگی ہو۔ ذرا دیر چپ رہ کر سکندر نے پھر کہا ''میں تیری خوشبو کا عاشق تھا۔'' تیری لاش کا خریدار نہیں ہوں آج ایک مٹھی اناج کے بدلے تجھے کوئی بھی ہاتھ لگا سکتا ہے۔''

کسی اور بات کا انتظار کیے بغیر سکندر وہاں سے چل دیا اور انوکھی ہکا بکا رہ گئی۔ وہاں ایک لاش ہی تو تھی۔''

(انمول شین مظفر پوری)

اس اقتباس میں افسانہ نگار نے جنس کے ایک ایسے پہلو کو پیش کیا ہے جس میں ایک طرف لڑکی بھوک کی وجہ سے عصمت جیسی انمول چیز کو فروخت کرنا چاہتی ہے لیکن بنیا انوکھی کی پیش کش کو نہایت حقارت سے ٹھکرا دیتا ہے اور گیہوں و چاول کی بوریاں دے کر چلا جاتا ہے گویا اس نے انسانیت کا بہترین مظاہرہ کیا ہے۔ یہ شین مظفر پوری کے افسانوں کا انفرادی پہلو ہے۔

الیاس اسلام پوری

بہار میں آزادی سے قبل کے افسانہ نگاروں میں الیاس اسلام پوری بھی ہیں جن کا رشتہ آزادی کے بعد دور کے بعد سے بھی ہے۔ ان کا پہلا افسانہ 'ظلم و استبداد کے خلاف ایک جنگ' کے عنوان سے رسالہ 'نگار' میں 1935 میں شائع ہوا۔ اس کے بعد وہ مسلسل لکھتے رہے۔ ان کے افسانے 'ساقی' اور 'شمیم' جیسے رسالوں میں بھی شائع ہوئے۔ اس کے بعد وہ مسلسل لکھتے رہے۔ ان کے افسانوں میں الہام آزادی، تجدید محبت، ڈھائی سیر چنا، دیوانہ، پریم چند کی بھول بھلیا، نور و ظلمت، چمار، ماڈل و لیچ، اور ہیروئن وغیرہ۔ اس کے علاوہ 1940 تک کئی رسالوں میں وہ لگاتار چھپتے رہے۔

انھوں نے اپنے افسانوں میں کسی ایک زمین کو اپنے موضوعات کے لیے مخصوص نہیں کیا۔ ان کے افسانوں کی فضا جہاں ایک طرف یاس انگیز ہے وہیں دوسری طرف رومان انگیز بھی ہے۔ 'الہام آزادی' میں سیاست کی بازگشت ہے پھر آگے چل کر وہ حقیقت پسندی کی طرف بھی مائل نظر آتے ہیں۔ 'چمہا' اور 'قرض' ان کا ایسا افسانہ ہے جن میں ترقی پسندی یا حقیقت پسندی کے رجحانات نہیں ملتے۔ ان کے افسانوی اسلوب میں ایک اچھے افسانہ نگار کا تیور موجود ہے۔ الیاس اسلام پوری کے افسانے تاریخی و ادبی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔

اس دور کے افسانہ نگاروں میں شبلی ابراہیمی، ڈاکٹر نسیمہ سوز، رضیہ رعنا، انجم مانپوری، ح م اسلم، حسنین عظیم آبادی، شین مظفر پوری، اختر قادری، بدیع مشہدی، شاہد انور وغیرہ بھی شامل ہیں۔ ان افسانہ نگاروں نے بعض اچھے افسانے لکھے اور اردو کے افسانوی ادب میں اپنا نام سنہرے حروف میں لکھوایا۔ اس ضمن میں خصوصی طور پر ح م اسلم، اختر قادری، انجم مانپوری کے نام مشہور ہیں۔

■

Dr. Shaheen Sultana, D/o, Mukhtar Ansari, Purana Cohwk Bazar, Bhabua, W. No-22, Kaimur (Bihar)

حیات افتخار

شہرۂ آفاق ناول نگار گیبریل گارسیا مارکیز

گیبریل گارسیا مارکیز (Gabriel Garcia Marquez) کا شمار عالمی ادب کے ممتاز ادیبوں میں ہوتا ہے۔ انھیں دنیا کے سب سے بڑے ادبی اعزاز نوبل انعام برائے ادب سے 1982 میں نوازا گیا۔ ان کا آبائی وطن کولمبیا تھا اور انھوں نے اپنی مادری زبان ہسپانوی کو تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنایا۔ کولمبیا، لاطینی امریکہ کا ایک خطہ ہے اور لاطینی ادب عظیم روایات کا حامل ہے۔ گارسیا کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے لاطینی امریکی ادیبوں کی روایات ہی کو فروغ دیا ہے اور انھیں نوبل انعام جو دیا گیا وہ دراصل لاطینی امریکی ادب کی عظمت کا اعتراف ہے۔

گارسیا نے بیک وقت ناول نگار، افسانہ نگار، فلمی منظر نامہ نگار اور صحافی کی حیثیت سے اپنی شناخت بنائی۔ لیکن انھیں عالمی شہرت ان کے افسانوی ادب کی وجہ سے حاصل ہوئی۔ خاص طور پر ان کے معرکۃ الآرا ناول 'تنہائی کی ایک صدی' (One hundred years of solitude) نے نہ صرف عالمی ادب میں انھیں اعلیٰ مقام دلایا بلکہ نوبل انعام کے حصول کا ذریعہ بھی بنا اور تجارتی اعتبار سے اس ناول نے تمام عالمی ریکارڈ توڑ دیے۔ اس کی تیس ملین (تین کروڑ) کاپیاں فروخت ہوئیں اور ایک اندازے کے مطابق دنیا کی چالیس سے زائد زبانوں میں اس کا ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔

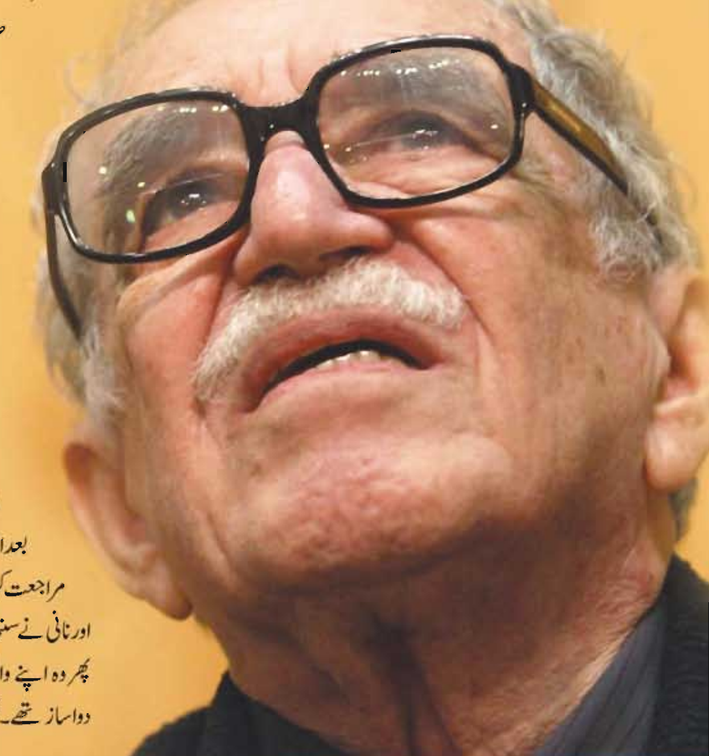

ابتدائی زندگی

گارسیا مارکیز کی پیدائش کولمبیا کے ایک گاؤں اریکاٹکا (Aracataca) میں 6 مارچ 1927 کو ہوئی۔ ان کی پیدائش کے فوری بعد ان کے والدین روزگار کے سلسلے میں دوسرے شہر مراجعت کر گئے اور ان کی پرورش کی ذمے داری ان کے نانا اور نانی نے سنبھالی۔ دس سال بعد ان کے نانا کا انتقال ہو گیا تو پھر وہ اپنے والدین کے پاس چلے گئے۔ ان کے والد ایک دوا ساز تھے۔ بچپن میں دس سال تک اپنے والدین سے دور رہنے کی وجہ سے وہ ان کے لیے اجنبی ہی رہے اس لیے ان کی ابتدائی زندگی پر ان کے نانا اور نانی کا ہی اثر دکھائی دیتا ہے۔

گارسیا کے نانا ایک فوجی تھے اور فوج میں ملازمت کے دوران ان کی بہادری کے واقعات ان کے گاؤں کے لوگ فخر سے بیان کرتے تھے۔ کسی بھی ناانصافی اور ظلم کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا جذبہ گارسیا کو اپنے نانا ہی سے ورثے میں ملا۔ اس کے علاوہ ان کے نانا ایک عمدہ کہانی گو تھے۔ بہادر اور عدل وانصاف پر مبنی کہانیوں کی سماعت نے گارسیا کے ذہن پر بے حد اثر کیا۔ ان کے نانا نے اپنے کم سن پوتے سے جو بات کہی وہ انھیں زندگی بھر یاد رہی۔ وہ یہ تھی کہ کسی بھی آدمی کو قتل کرنے کے بعد جو ذہنی بوجھ ہوتا ہے دنیا میں اس سے بڑا کوئی بوجھ نہیں ہے۔ گارسیا نے دراصل اپنے ناولوں کے تانے بانے میں اس حقیقت کو مختلف طریقے سے سمونے کی کوشش کی ہے۔

اپنی نانی سے بھی انھوں نے بہت کچھ سیکھا۔ حقیقتوں کو طلسمات، توہمات اور مافوق الفطری عناصر کی آمیزش کے ساتھ دیکھنا انھوں نے اپنی نانی سے سیکھا۔ کہانی کو انوکھے طریقے سے بیان کرنے کا سلیقہ بھی ان کی نانی کے فیض تربیت کا نتیجہ تھا۔ کتنی ہی غیر حقیقی کہانیاں ہوں وہ اس طرح بیان کرتی تھیں کہ ناقابل تردید حقیقت محسوس ہوتی تھی۔

گارسیا بطور صحافی

نیشنل یونیورسٹی آف کولمبیا میں جب وہ قانون کی تعلیم حاصل کر رہے تھے اسی زمانے سے صحافی کی حیثیت سے اخبارات کے لیے لکھنا شروع کر دیا۔ انھوں نے 1948 اور 1949 کے دوران 'ایل یونیورسل' نامی اخبار میں بطور صحافی خدمات انجام دیں۔ 1950 سے 1952 تک 'ایل ہیرالڈ' نامی مقامی اخبار میں مزاحیہ اور ظریفانہ کالم سیپٹی مس کے فرضی نام سے لکھا۔ ادیبوں اور صحافیوں کی انجمن 'بیرن کا ئیلوگروپ' کے بھی وہ فعال رکن رہے جس کی وجہ سے اس زمانے کی ادبی شخصیتوں اور ان کے ادبی کارناموں سے شناسائی کا موقع ملا۔ انھوں نے فلمی صحافی کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دی۔

انھوں نے مختلف اخبارات میں ایک نڈر صحافی ہونے کا ثبوت دیتے ہوئے کولمبیا کے سلگتے ہوئے مسائل پر اظہار خیال کیا تو انھیں سرکاری عتاب کا بھی شکار ہونا پڑا۔ ایسے حالات میں انھوں نے میکسیکو میں پناہ حاصل کی۔ فرانسیسی حکومت نے انھیں اعزازات سے نوازا۔ انھوں نے نوجوان صحافیوں کو صحافت کے فن کی تربیت دینے کے لیے 1995 میں ایک فاؤنڈیشن قائم کی جسے یونیسکو UNESCO جیسے عالمی ادارے کی مالی امداد حاصل رہی۔ ان کی شادی مارچ 1958 میں مرسڈیز برکا نامی خاتون سے ہوئی جوان کی کالج کے دنوں کی ساتھی تھی۔ کالج کے دنوں ہی سے وہ ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے جن سے ان کے دو لڑکے ہوئے۔

1999 میں گارسیا کو کینسر کا عارضہ لاحق ہوا۔ ان کے لکھنے کی رفتار دھیمی پڑگئی جب ان کی صحت تھوڑی بہتر ہوئی انھوں نے زندگی کی یادداشتوں کو خودنوشت کی صورت میں ''کہانی سنانے کے لیے زندہ ہوں'' (Living to tell the tale) کے نام سے لکھی جس کی پہلی جلد 2002 میں شائع اور کافی مقبول ہوئی۔ اس طرح اس کی تین جلدیں منظر عام پر آئیں۔

جوں جوں ان کا مرض بڑھتا گیا وہ موت کی منزل کے قریب آتے گئے۔ پھیپھڑوں میں جراثیم کے اثر سے اپریل 2014 کی شروعات میں انھیں نمونیا ہوگیا۔ آخرکار میکسیکو میں 87 سال کی عمر میں وہ 17 اپریل 2014 کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ اس طرح عالمی ادب کا یہ ممتاز ادیب جو دنیائے ادب کو 'تنہائی کی ایک صدی' جیسا شاہکار ناول عطا کر گیا۔ تنہائی کی اتھاہ وادیوں میں کھو گیا۔

طلسمی حقیقت نگاری:

گارسیا کو طلسمی حقیقت نگاری (Magic Realism) کے اسلوب کا ماہر سمجھا جاتا ہے۔ انھوں نے حقیقت نگاری میں مافوق الفطری عناصر کو اس طرح شامل کیا کہ وہ قاری کے لیے دلچسپی کا باعث بن گئے اور انسانی زندگی کے روزمرہ واقعات میں حقیقت پسندی کے ساتھ توہمات کا جو عنصر شامل ہوتا ہے انھوں نے اسے بخوبی نمایاں کیا۔ ان کی کہانیوں کی بنیاد تو حقیقت پر ہوتی ہے اور ان کے تمام ناولوں اور افسانوں کا موضوع حقیقی زندگی سے مستعار ہوتا ہے۔ انسانی فطرت اور نفسیات میں جو عجیب سا بھونڈا پن، کجی اور ٹیڑھا پن شامل ہے اس کی پیش کش کو انھوں نے طلسمی حقیقت نگاری سے تعبیر کیا۔ انسان عقلیت پسند ہونے کے ساتھ کس طرح غیر شعوری طور پر توہم پرست اور مافوق الفطری عناصر کا قائل ہے اس کی تصویر کشی ان کی تخلیقات میں فنکارانہ در و بست کے ساتھ ملتی ہے۔ مثلاً گارسیا کے مشہور ناول 'تنہائی کی ایک صدی' کا مرکزی کردار جوز آرکیڈیو بیونڈیا ایک جزیرہ نما گاؤں بساتا ہے جس کا نام میکنڈو ہے وہاں ایک خانہ بدوش سال میں ایک مرتبہ آتا ہے اور کوئی نہ کوئی نئی چیز فروخت کر جاتا ہے ایک مرتبہ مقناطیس لاتا ہے اور مقناطیسی کشش سے گاؤں کے عوام متاثر ہوتے ہیں

ایک مرتبہ اور یہی خانہ بدوش

مرکزی

کردار بیونڈیا کو ایک کیمیائی نسخہ بتاتا ہے جس سے اس کے پاس موجود سونا دو گنا ہوسکتا ہے لیکن جب بیونڈیا اس کو آزماتا ہے تو، اس کے پاس پہلے سے موجود سونا بھی وہ کھو بیٹھتا ہے۔ بیونڈیا کی فطرت میں جو تجسس کا عنصر ہے وہ اس کے اندیشے اور خوف پر غالب آجاتا ہے۔

ان کی طلسمی حقیقت نگاری کے اس پہلو کو اجاگر کرتے ہوئے گارسیا کے رفیق پلینیو اپولیو مینڈوزا نے مزاحیہ انداز میں تبصرہ کیا ہے کہ ''تم نے اپنی تصنیفات میں حقائق کو پیش کرنے کے لیے جو طرز اختیار کیا ہے اسے طلسمی حقیقت نگاری کا نام دیا گیا ہے۔ مجھے اس بات کا احساس ہے کہ تمھارے یوروپی قاری تمھاری کہانیوں کے طلسم سے عام طور پر واقف ہیں لیکن اس کے پس پردہ کارفرما حقیقت کو سمجھنے میں ناکام ہیں غالباً ایسا اس لیے ہے کہ ان کی عقلیت پسندی یہ بات سمجھنے سے قاصر ہے کہ حقیقت کا تعلق صرف ٹماٹر اور انڈوں کی قیمتوں سے نہیں ہے۔''

گارسیا نے کل چھ ناول اور چار ناولٹ لکھے۔ ان کے علاوہ ان کے پانچ افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں غیر افسانوی ادب میں ان کی سات تصنیفات منظر عام پر آچکی ہیں۔

گارسیا کا شہرۂ آفاق ناول

گارسیا کی تمام تصنیفات میں جسے شاہکار کی حیثیت حاصل ہے اور جو تصنیف ان کی لازوال شہرت کا باعث بنی اور جس کی وجہ سے انھیں دنیا کے سب سے بڑے ادبی انعام، نوبل انعام برائے ادب کا مستحق سمجھا گیا وہ دراصل ان کا شہرۂ آفاق ناول 'تنہائی کی ایک صدی' ہے۔ انھوں نے معاش کی فکر سے بے نیاز ہوکر مسلسل اٹھارہ مہینے شب و روز اس ناول کی تخلیق میں صرف کردیے۔ تب کہیں جا کر یہ شاہکار وجود میں آیا۔ یہ ناول پہلے پہل ہسپانوی زبان میں 1967 کے دوران شائع ہوا اس کے تین سال بعد 1970 میں اس کا انگریزی میں ترجمہ منظر عام پر آیا اس کے انگریزی مترجم گریگوری رباسا (Gregory Rabassa) تھے۔

اس ناول میں بیونڈیا خاندان کی سات نسلوں کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ ناقدین کا کہنا ہے کہ یہ دراصل کولمبیا کی تاریخ کا استعارہ ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار جوز آرکیڈیو بیونڈیا (Jose Arcadio Beundia) ہے جو اپنی اہلیہ ارسلا اکیورن (Ursula Lguraian) اور بچوں کے ساتھ بہتر زندگی کی تلاش اور اپنی بود و باش کے لیے نئی سرزمین کی جستجو میں نکل پڑا ہے۔ سفر کے دوران کسی مقام پر رات کے قیام کے دوران وہ ماکنڈو (Macondo) بسانے کا خواب دیکھتا ہے۔ جو آئینوں کا شہر ہے جس میں ساری دنیا کا عکس دکھائی دیتا ہے جس ندی کے کنارے وہ قیام پذیر ہوتا ہے وہیں پر وہ اپنے اس خواب کی تکمیل میں اس کو عملی شکل دینے میں لگ جاتا ہے۔ جب یہ جزیرہ بسنے لگتا ہے تو وہاں غیر معمولی واقعات کا ظہور ہونے لگتا ہے جس سے بیونڈیا خاندان کی نسل در نسل متاثر ہوتی ہے وہ مختلف آفات و مصائب کا شکار ہوتے ہیں ان سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ناول دراصل اسی جہد بقا کی داستان ہے آخرکار ایک زبردست طوفانی بارش آئینوں کے اس شہر کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیتی ہے۔ ناول کے اختتام پر اس خاندان کے ایک رکن کو خفیہ زبان پر مشتمل ایک دستاویز حاصل ہوتی ہے جسے گزشتہ کئی نسلیں حل کرنے میں ناکام رہی ہیں۔ آخرکار وہ اسے حل کرنے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ دراصل اس میں بیونڈیا خاندان کو پیش آنے والی ہر آفت اور مصیبت کا ذکر ہوتا ہے لیکن جس سے وہ بے خبر ہوتے ہیں۔

ہسپانوی زبان سے پہلے پہل اس ناول کا انگریزی میں ترجمہ 1970 کے دوران شائع ہوا جس کی اشاعت نے انھیں شہرت کی بلندیوں تک پہنچا دیا۔ دنیا کی دیگر اہم زبانوں میں اس کے تراجم کا سلسلہ شروع ہوا اور اس کی اصل ہسپانوی زبان میں اشاعت ((1967 کے پندرہ سال بعد 1982 میں انھیں اس ناول کے خصوصی حوالے سے ان کی ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے نوبل انعام برائے ادب سے نوازا گیا۔

گارسیا کے دیگر ناولوں میں آمر کا زوال (Autumn of Patriarch) (1975) اور ہیضے کے دوران عشق Love in the Time of cholera (اشاعت 1985) کو کافی شہرت حاصل ہوئی ان کے افسانوی مجموعوں میں معصوم ایرنڈرا (Innocent Erendira) اور فوجی کرنل جسے کوئی خط نہیں لکھتا (No one writes to the colonel) قابل ذکر ہیں۔

گارسیا مارکیز کی شخصیت عالمی افسانوی ادب میں کلاسیکی اہمیت کی حامل ہے اور ان کے ناولوں کے اسلوب اور موضوعات عالمی ادب میں اپنے اعلیٰ معیار کے لیے سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اردو میں ایسے عالم گیر شہرت کے حامل ادیبوں کی تخلیقات کو ترجمہ کرنے اور ہماری زبان کے قارئین کو عالمی ادب کے معیار سے روشناس کرانے کی ضرورت کا احساس دلانا ہی اس مضمون کا منشا ہے۔

ماخذ: وکی پیڈیا (Wikipedia) میں پیش کردہ تفصیلات سے استفادہ کیا گیا۔

■

Dr. Hayath Iftekhar, Head of the Dept. of Urdu (Rted.) Quaid-e-Millath College for Men Medawakkam, Chennai - 600100 (TN)
Res.: New No 80, Old No. 213/1, Choolaimedu High Road, Choolaimedu, Chennai - 600094 (TN)

آخرکار

مصنف: گیبریل گارسیا مارکیز
ترجمہ: فاروق حسن

سوموار کی گرم صبح بغیر بارش کے طلوع ہوئی۔ علی الصباح بیدار ہونے کے عادی، بغیر ڈگری کے دندان ساز، اور یلیوا ایسکو بار نے چھ بجے اپنا دفتر کھولا۔ پلاسٹر کے سانچے میں نصب چند نقلی دانت اس نے شیشے کی الماری میں سے نکالے اور مٹھی بھر اوزاروں کو ان کی قامت کے مطابق ترتیب دے کر میز پر رکھا، یوں جیسے ان کی نمائش کی جانے والی ہو اور یلیو ایسکو بار نے بے کالر کی قمیص پہن رکھی تھی جس کا گلا سونے کی کیل سے بند تھا اور اس کی پتلون کو گارٹرز نے اپنی جگہ پر سنبھالا ہوا تھا۔ جسمانی لحاظ سے وہ سوکھا ہوا آدمی تھا جو ہر وقت عموماً سیدھا کھڑا رہتا تھا اور اس کے چہرے پر ایسا تاثر رہتا تھا جیسا عموماً بہرے لوگوں کے چہروں پر ہوتا ہے، حالانکہ اس تاثر کی اصل صورت حال سے مطابقت کم ہی تھی۔

اوزار میز پر ترتیب دینے کے بعد دانتوں کی صفائی کی مشین کو اپنی طرف کھینچ کر، وہ کرسی پر بیٹھ گیا اور نقلی دانتوں کو چمکانے کے کام میں مصروف ہوگیا۔ اس کا ذہن اپنی اس مصروفیت کے بارے میں ہر طرح کی سوچ سے عاری لگتا تھا۔ لیکن وہ انہماک اور باقاعدگی سے، ضرورت بے ضرورت، مشین کو پاؤں کے پیڈل سے ہلاتا اور دانتوں کو چمکاتا رہا۔

آٹھ بجے کے بعد وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا۔ کھڑکی سے باہر جھانک کر اس نے آسمان کا جائزہ لیا، اور پڑوس کے گھر کی چھت پر نصب آڑی چوب پر دو مغموم گدھوں کو بیٹھے سورج کی گرمی میں اپنے پروں کو سکھاتے دیکھا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ دوپہر کے کھانے کے وقت سے قبل بارش ہونے کا امکان ہے، پھر وہ دوبارہ اپنے کام میں مشغول ہوگیا۔ اس کے گیارہ

سالہ بیٹے کی چیختی ہوئی آواز نے اس کے انہماک کا تسلسل توڑا:

"پاپا۔"

"ہاں؟"

"باہر قصبے کا میئر آیا ہے، وہ پوچھتا ہے آپ اس کا ایک دانت نکال دو گے؟"

"اس سے کہہ دو میں موجود نہیں ہوں۔"

وہ سونے کے ایک دانت کو چمکا رہا تھا۔ ہاتھ بھر کے فاصلے پر رکھ کر اور آنکھیں آدھی بند کر کے اس نے دانت کو غور سے دیکھا۔ اس کے بیٹے نے انتظار کے کمرے سے دوبارہ آواز لگائی:

"پاپا وہ کہتا ہے آپ موجود ہو، کیونکہ وہ آپ کی آواز سن سکتا ہے۔"

دندان ساز دانت کے معائنے میں مصروف رہا۔ کچھ دیر بعد اس نے دانت کو دوسرے پالش کیے ہوئے دانتوں کے قریب میز پر رکھا اور بیٹے کو جواب دیا:

"تب تو اور بھی بہتر ہے۔"

اس نے دوبارہ مشین کو چلانا شروع کیا۔ گتے کے ایک ڈبے میں سے، جس میں سب طرح کی نامکمل چیزیں پڑی رہتی تھیں، اس نے دانتوں کے پل کا ایک حصہ نکالا اور اس کے سونے کو چمکانے لگا۔

"پاپا۔"

"ہاں؟" اس کے چہرے کے تاثر میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

"میئر کہتا ہے اگر آپ اس کا دانت نہیں نکالو گے تو وہ آپ کو گولی مار دے گا۔"

کسی قسم کی عجلت دکھائے بغیر اس نے اطمینان سے مشین کے پیڈل کو ہلانا بند کیا اور اسے پرے دھکیلا۔ تب اس نے میز کی ایک دراز کو پورا باہر نکالا، وہاں ایک ریوالور پڑا تھا۔ "ٹھیک ہے" اس نے کہا "اس سے کہو آ کر گولی مار دے مجھے۔"

کرسی کو دھکیل کر اس نے دروازے کے سامنے کر دیا اور اپنا ہاتھ میز کی دراز پر ہی رکھا۔ میئر دروازے میں نمودار ہوا۔ اس کے چہرے کا بایاں حصہ شیو کیا ہوا تھا، لیکن اس کے سوجے ہوئے اور درد کرتے ہوئے دائیں گال پر پانچ دن کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ دندان ساز نے میئر کی بے حس آنکھوں میں یاس اور بے بسی کی متعدد راتوں کو جھانکتے ہوئے پایا۔ اس نے اپنی انگلیوں کے پوروں سے دراز کو بند کر دیا اور نرمی سے بولا:

"بیٹھ جاؤ۔"

گیبریل گارسیا مارکیز: مختصر تعارف

پیدائش: 6 مارچ 1927، بمقام اریکاٹاکا، کولمبیا
وفات: 17 اپریل 2014 (عمر 87 سال) بمقام میکسیکو شہر
قومیت: کولمبین
تعلیمی درسگاہ: یونیورسٹی آف کارٹے جینا، نیشنل یونیورسٹی آف کولمبیا
ادبی اصناف: ناول، افسانے، صحافت
ادبی تحریکات: لاطینی امریکی ادبی تحریک، طلسمی حقیقت نگاری
اہم تصنیفات: (1) تنہائی کی ایک صدی One hundred years of Solitude (2) ایک آمر کا زوال (3) The Autumn of the Patriarch ہیضے کے دوران عشق (Love in the Time of Cholera
اعزازات: نوبیل عالمی انعام برائے ادب 1972
شریکِ حیات: مرسڈیز برکاپارڈو
اولاد: روڈریگو، گونزیلو (فرزندان)

"صبح بخیر" دندان ساز نے کہا۔

دانت نکالنے کے اوزار پانی میں ابل رہے تھے۔ میئر نے اپنا سر کرسی کی پشت کے ساتھ ٹکا دیا، یوں تھوڑا سا آرام محسوس ہوا۔ اس کا سانس یخ تھا۔ اس نے دفتر کا جائزہ لیا، نہایت غریبانہ سا انتظام تھا۔ لکڑی کی ایک پرانی کرسی، پیڈل والی مشین اور شیشے کی ایک الماری جس میں خالی بوتلیں رکھی تھیں۔ کرسی کے مقابل کھڑکی میں شانوں کی اونچائی پر کپڑے کا پردہ لٹک رہا تھا۔ دندان ساز کو اپنی طرف آتے دیکھ کر میئر نے ایڑیاں مضبوطی سے جوڑیں اور منہ کھول دیا۔

اوریلیو ایسکو بار نے اس کا چہرہ روشنی کی طرف موڑا اور اس کے متاثرہ دانت کو دیکھا۔ پھر اس نے جبڑا انگلیوں کے محتاط دباؤ سے بند کر دیا اور کہا:

"تمھیں بے ہوش کیے بغیر دانت نکالنا پڑے گا!"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ دانت کے نیچے پیپ بھری ہوئی ہے۔"

میئر نے ڈاکٹر کی آنکھوں میں جھانکا۔ "ٹھیک ہے۔" اس نے کہا، اور مسکرانے کی کوشش کی۔ دندان ساز نے اس کی مسکراہٹ کا جواب نہ دیا۔ ابالے ہوئے اوزاروں والا گرم تسلا اس نے میز پر رکھا اور ایک ٹھنڈی چمٹی سے، کسی عجلت کے بغیر، اوزار باہر نکالے۔ جوتے کی نوک سے اگال دان کو ہلا کر اس نے ٹھیک جگہ رکھا اور ہاتھ دھونے کے لیے تلکے کے آگے جا کر کھڑا ہوا۔ ان سب کاموں کے دوران اس نے ایک بار بھی میئر کی طرف نہ دیکھا لیکن میئر نے ایک لمحے کے لیے بھی ڈاکٹر کو اپنی نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔

متاثرہ دانت نچلے جبڑے کی عقل داڑھ تھی۔ دندان ساز نے اپنے پاؤں پھیلائے اور گرم زنبور سے دانت کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ میئر نے اپنی تمام قوت سے دونوں ہاتھوں سے کرسی کے بازوؤں کو جکڑا اور پاؤں اکڑا کر بیٹھ گیا۔ اسے اپنے گردوں میں یخ آلود خلا کی موجودگی کا احساس ہوا، لیکن اس نے آواز نہ نکالی۔ دندان ساز فقط اپنی کلائی کو حرکت دے رہا تھا۔ کسی کینے کے بغیر، بلکہ ایک ترشی آمیز ملائمت سے اس نے میئر سے کہا:

"ہمارے بیس آدمیوں کے قتل کا حساب تم اب چکاؤ گے۔"

میئر نے اپنے جبڑے میں ہڈی کی کڑکڑاہٹ کو محسوس کیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے لیکن جب تک دانت منہ سے باہر نہ آ گیا اس نے سانس تک نہ لیا۔ آنسوؤں کے عقب سے اس نے دانت کو دیکھا۔ اسے یہ دانت اپنی ساری تکلیف سے اس قدر غیر متعلق لگا کہ وہ پچھلی پانچ راتوں کی اذیت کو سمجھنے میں ناکام رہا۔

پسینے میں شرابور، کانپتا ہوا، وہ اگال دان کے اوپر جھکا رہا۔ اس نے اپنے کوٹ کے بٹن کھولے اور پتلون کی جیب میں سے رومال نکالنے کی کوشش کی۔ دندان ساز نے صاف کپڑا اس کی طرف بڑھایا۔

"اپنے آنسو صاف کرو۔" اس نے کہا۔

میئر نے آنسو پونچھے۔ وہ کانپ رہا تھا۔ جب تک دندان ساز ہاتھ دھوتا رہا، میئر بوسیدہ چھت کو دیکھتا رہا جس پر گرد آلود جالے لگے ہوئے تھے، جن میں مکڑیوں کے انڈے اور مردہ کیڑے مکوڑے لٹکے ہوئے تھے۔ دندان ساز ہاتھ پونچھتا ہوا واپس آیا۔ "گھر جا کر آرام کرو۔" وہ بولا، "اور نمک کے پانی سے غرارے کرتے رہو۔"

میئر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے تقریباً فوجیوں کے سے سرسری انداز میں دندان ساز کو سلیوٹ کیا اور دروازے کی طرف چلا۔ چلتے ہوئے اس نے اپنی ٹانگوں کو جھٹک کر سیدھا کیا اور کوٹ کے بٹن بند کیے۔

"بل بھجوا دینا" اس نے کہا۔

"کس کے نام؟ تمھارے یا ٹاؤن کمیٹی کے؟"

میئر نے اس کی طرف دیکھے بغیر کلینک کا دروازہ بند کیا۔ جالی کے دروازے کے باہر سے اس کی آواز آئی:

"کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سالی ایک ہی بات ہے۔"

■

بشکریہ: ماہنامہ امیر بیل ڈائجسٹ، لاہور پاکستان، مدیر اعلیٰ: یونس حسرت

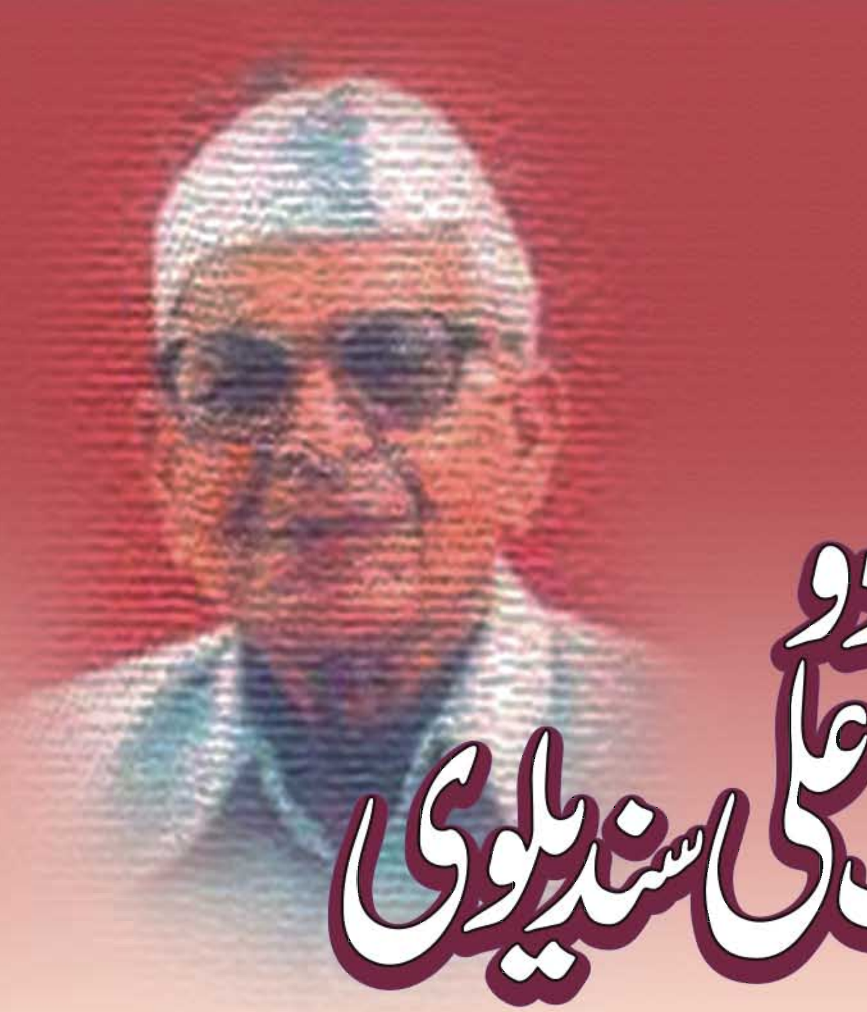

جمال نصرت

عاشقِ اردو وجاہت علی سندیلوی

اردو زبان کا وہ عاشق تھا۔ جس دن اس نے اردو پڑھنا سیکھا اس کے بعد زندگی کے آخری دن تک اردو سے والہانہ محبت کرتا رہا۔ وہ اردو زبان کی صفات و ضرورت بتانے اور اسے خوبصورت بنانے والوں میں سے تھا۔ اردو کے لیے لڑنے والا، اردو پر زیادتی ہونے پر عہدے سے استعفادینے والا، اپنا پیشہ چھوڑ کر اردو اخبار کی نوکری کرنے والا، اردو تدریس کو نیا موڑ دینے والا وہ شخص وجاہت علی سندیلوی تھا۔ وہ مسلسل اچھے کو اور اچھا بنانے میں لگا رہا۔ وجاہت علی طنز و مزاح، تنقید، ریسرچ، رپورتاژ، تدریس، افسانے، ناول، نظم، غزل ڈرامہ سیاست، مقالے، مراسلے ہی کیا ہر موضوع پر، بس اسی جذبے کے تحت 65 سالوں تک لکھتے رہے، اور 26 کتابیں اردو کو دیں اور بہت سا سرمایہ ایسا بھی ہے جو شائع تو ہوا ہے مگر کتابی شکل میں موجود نہیں ہے۔ آپ کی چہیتی بیٹی ڈاکٹر صبیحہ انور اس کام میں مستعدی سے لگی ہیں۔

وجاہت صاحب یکم مارچ کو 1916 میں بھوپال میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد چودھری عشرت علی صاحب خان بہادر چودھری نصرت علی صاحب سکریٹری انجمن تعلق داران اودھ کے بیٹے اور والدہ سروری بیگم صاحبہ میر سید محمود علی صاحب رئیس بھوپال کی بڑی بیٹی تھیں۔ آپ کے والد سندیلہ کے ایک بڑے زمین دار تھے۔ وہ بڑے مخلص، دوست نواز اور خوش مزاج انسان تھے۔ ان کا حلقۂ احباب وسیع تھا۔ صبح و شام ان کے ملنے والے ان کے یہاں جمع ہوتے جن میں بیشتر سندیلہ کے ممتاز شعرا تھے۔ جیسے وزیر حسن صاحب نشتر سندیلوی، مولانا عبدالعلی صاحب شوق سندیلوی امیر حسن صاحب بسمل سندیلوی، امیر احمد صاحب عبرت سندیلوی وغیرہ۔ عموماً شعر و شاعری کا سلسلہ رہتا، ادبی لطائف اور کوائف سنائے جاتے، آم، موسم اور حالات حاضرہ پر تبصرہ کیا

وجاهت صاحب اپنی سات بهنوں کے اکیلے بهائی تهے۔ وه غیر معمولی طور پر چاهے جاتے۔ ابهی سات برس کے بهی نهیں هوئے تهے که والده گزر گئیں۔ اس سانحے نے ان کو بڑا حساس اور دردمند بنا دیا تها۔ آپ کی تعلیم کا آغاز کسی اسکول یا مدرسے میں نهیں بلکه گهر پر هی استاد، معلم اور اتالیق رکھ کر کیا گیا۔ حافظ محمد تقی صاحب نے کلام پاک ختم کرایا۔ ماسٹر ریاست علی صاحب نے اردو اور ریاضی پڑهائی۔ اخبار میں اشتهار دے کر بشیر الدین غازی پوری صاحب کو انگریزی پڑهانے پر مقرر کیا گیا۔

جاتا۔ انگریزوں کے ظلم پر بھی بات چیت ہوتی۔ بے فکری کے زمانے اور پرخلوص احباب کی یہ محفلیں اب اوراق پارینہ ہو چکی ہیں۔ وجاہت صاحب بھی ان میں اکثر موجود رہتے۔ اسی سے ان کو مجلس کے آداب آئے۔

وجاہت صاحب اپنی سات بہنوں کے اکیلے بھائی تھے۔ وہ غیر معمولی طور پر چاہے جاتے۔ ابھی سات برس کے بھی نہیں ہوئے تھے کہ والدہ گزر گئیں۔ اس سانحے نے ان کو بڑا حساس اور دردمند بنا دیا تھا۔ آپ کی تعلیم کا آغاز کسی اسکول یا مدرسے میں نہیں بلکہ گھر پر ہی استاد، معلم اور اتالیق رکھ کر کیا گیا۔ حافظ محمد تقی صاحب نے کلام پاک ختم کرایا۔ ماسٹر ریاست علی صاحب نے اردو اور ریاضی پڑھائی۔ اخبار میں اشتہار دے کر بشیرالدین غازی پوری صاحب کو انگریزی پڑھانے پر مقرر کیا گیا۔ پھر مقامی کالج میں آٹھویں درجے میں داخل ہو کر پاس ہوئے۔ ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کرسچن کالج لکھنؤ سے پاس کیا۔ انیس برس کی عمر میں لکھنؤ یونی ورسٹی سے بی اے اور پھر 2 سال بعد ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا۔ پھر ٹریننگ کے بعد 1940 میں مقامی عدالتوں میں وکالت کا آغاز ہوا جہاں ان کو بہت جلدی شہرت حاصل ہوئی اور کام ملتا گیا۔ وکالت کا یہ سلسلہ 1996 یعنی وفات تک جاری رہا۔ آخر میں گھر پر ہی وکیلوں کو مشورہ دیتے اور کسی

خاص معاملے میں بحث کے لیے عدالت جاتے۔ ہاں بیچ میں سال ڈیڑھ سال کا وہ حصہ شامل نہیں ہے جب رفیع احمد قدوائی صاحب کے حکم اور حیات اللہ صاحب عشرت علی صدیقی صاحب کے اسرار پر 1944 سے 1945 تک روزنامہ قومی آواز میں سب ایڈیٹر رہے۔ ان کے لیے اکثر دوست اور عزیز کہتے کہ انھوں نے اپنی صلاحیتوں کو ایک چھوٹے سے قصبے کی فضاؤں میں قید رکھا۔ آپ منصفی کا امتحان پاس کرکے بھی باہر نہیں گئے۔ سیاست میں بہت بلائے گئے۔ لکھنؤ میں وکالت کرنے کے لیے بلایا گیا مگر آپ نے اپنے والد کی شفقت، ان کی پیرانہ سالی، ان کی بیماریوں اور ان کی ذمے داریوں کے لیے سندیلے کو ہی ترجیح دی۔ وہ اکثر کہتے کہ ''میری زندگی کا بہترین حصہ وہی ہے جس میں مجھے شفیق والد کی خدمت گزاری کی سعادت حاصل ہوئی۔ ادبی شوق اور ذوق مجھے ان سے ہی ملا۔'' یہ بھی لکھا ہے کہ ان کے پاس کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ تھا اردو کے بہت سے رسالے اور اخبارات جن میں 'پھول' لاہور، اور 'پہلی کرن' دہلی بھی تھے جاری کروا دیے تھے۔ ان کے علاوہ دوسری کتابیں بھی وہ پڑھتے اور بہت چھوٹی عمر میں ان کو اردو پڑھنے اور لکھنے کی استعداد ہوگئی تھی۔

وجاہت صاحب ٹینس اور بیڈمنٹن کے ایک اچھے کھلاڑی تھے۔ کرسچن کالج میں سکریٹری اور لکھنؤ یونیورسٹی یونین کے 1938 میں وائس پریزیڈینٹ اور یونین کے وزیر داخلہ منتخب ہوئے اور یونیوسٹی میگزین کے اردو سیکشن کے ایڈیٹر ہوئے۔ آپ 1937 میں باقاعدہ عملی سیاست میں آگئے تھے۔ 1939 میں گورکھپور کے رئیس شیخ محمودالحق صاحب کی بڑی بیٹی سعیدہ بیگم صاحبہ سے شادی ہوئی اور آپ کے 2 بیٹے نہال عظمت ایڈوکیٹ اور پروفیسر جمال نصرت اور 3 بیٹیاں نجمہ یونس، ڈاکٹر صبیحہ انور اور نگار شکیل ہیں۔

وجاہت علی جواہر لعل نہرو کی طلبہ تحریک میں شامل رہے اور ذاتی طور بھی ان سے قربت حاصل تھی۔ انھوں نے کانگریس کے ترجمان 'خبرنامہ' کا اڈیٹر بھی بنا دیا۔ آپ عموماً فرقہ واریت کے خلاف اور سیکولرزم اور سوشلزم پر لکھتے۔ آپ کی کتاب 'غریب مسلمان کدھر جائیں' کو انگریز سرکار نے ضبط بھی کرلیا۔ گاندھی جی کے حکم پر آپ جیل نہیں گئے اور چھپ کر تحریک آزادی کا کام زور قلم سے کرتے رہے۔ ضلع اور صوبے کی بہت سی کمیٹیوں کے ممبر رہے۔ ہندوستان کی آزادی کے بعد جب اسکولوں سے اردو نکالی جانے لگی تو آپ نے احتجاج کیا اور کامیابی نہ ملنے پر تعلیمی چیئرمینی سے ہی نہیں ممبری سے استعفا دے دیا۔ بعد میں 1953 میں آپ سندیلہ میونسپل بورڈ کے چیئرمین ہوئے۔ اسی دوران قصبے میں واٹر ورکس اور بجلی کی سپلائی آئی۔ صدر سڑک سیمنٹ کی بنی اور رفیع احمد میموریل لائبریری قائم ہوئی۔ سبزی منڈی اور غلہ منڈی کے درمیان ایک سڑک کی ضرورت تھی۔ بورڈ کے پاس

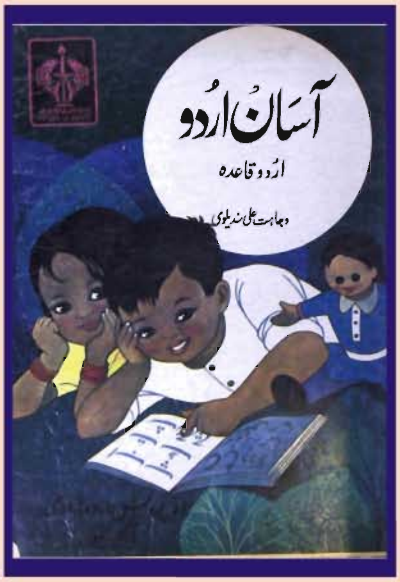

پیسہ نہیں تھا تو پھر کوئی پیسہ خرچ کیے بغیر شرم دان اور چندے سے سڑک بنائی گئی اور اس کا نام وجاہت مارگ رکھا گیا۔ سندیلہ بار ایسوی ایشن کے ایک عرصے تک سکریٹری رہے پھر 3 بار صدر رہے۔ بعد میں تاعمر سرپرست بنا دیے گئے۔ صوبائی انجمن ترقی اردو کے بھی نائب صدر رہے۔ نگر سدھار سمیتی کے بھی صدر رہے۔

ادبی سرگرمیوں کے سلسلے میں ابھی کالج میں تھے کہ میگزین کے ایڈیٹر بنائے گئے اور خود ہفتہ وار پیغام لکھنؤ اور حقیقت لکھنؤ میں مضامین اور مراسلے لکھے گئے۔ جب ایل ایل بی میں تھے تو روزنامہ حق لکھنؤ میں اسسٹنٹ ایڈیٹر بن کر ملازمت کرنے لگے۔ یہاں وہ مزاحیہ کالم بھی لکھتے جو ان سے پہلے شوکت تھانوی صاحب لکھا کرتے تھے۔ پھر آپ کانگریس کے خبرنامہ کے ایڈیٹر ہوئے۔ اسی زمانے سے آپ کے افسانے اردو کے مقتدر اخباروں اور رسالوں میں شائع ہونے لگے۔ چونکہ آپ شروع سے ہی انجمن ترقی مصنّفین کے ممبر تھے اور اس کے نظریات سے متاثر تھے لہٰذا زیادہ تر سنجیدہ افسانے لکھے لیکن حق اور قومی آواز میں دیگر کاموں کے علاوہ مزاحیہ کالم آپ ہی کے ذمے تھا جہاں وہ میزبان کے نام سے لکھتے اور یہ طرز بیان آپ کو زیادہ مرغوب تھا۔ اسی لیے انھوں نے اپنے تجربات اور مشاہدات کا ترجمان مزاحیہ انشائیوں، خاکوں اور افسانوں کو بنایا۔ اس میں ہی آپ کو ملک گیر شہرت ملی۔ ان کے افسانے اور مضامین سبھی بڑے اور معتبر رسالوں میں نہ صرف اردو بلکہ ان کے ترجمے ہندی اور انگریزی میں بھی شائع ہونے لگے۔ پچاس سے زیادہ خاکے اور ڈرامے ریڈیو سے بھی نشر ہوئے۔ کل ہند طنز و مزاح کے سیمیناروں میں صوبے کے نمائندے کی حیثیت سے شریک بھی ہوئے۔ متعدد کتابوں پر انعام ملا جن میں ملک کی کئی اکادمیاں شامل ہیں۔ اردو اکادمی، یوپی نے اپنا سب سے بڑا ایوارڈ دیا۔ نوائے میر ایوارڈ بھی آپ کو دیا گیا۔ جنگ آزادی میں قلم سے خدمت کرنے والوں کو جب مجاہد آزادی مانا گیا تو آپ کو بھی شامل کیا گیا۔ اس سلسلے کی سہولتیں وفات تک آپ کو ملتی رہیں اور مجاہد آزادی کی سند دی گئی۔

زندگی کے آخری دور میں باقاعدہ شاعری بھی کرنے لگے اور اس میدان میں بھی اپنی معتبر حاضری درج کرائی۔ آپ کی کل 26 تصانیف شائع ہوئی ہیں جس کا گوشوارہ اس طرح ہے: طنز و مزاح 10 کتابیں، افسانے 5 مجموعے، ناول ایک، شعری مجموعے تین، سیاست پر ایک کتاب، رپورتاژ، اردو تدریس، بچوں کا ادب اور غالبیات پر کتابوں کے علاوہ مقالات پر مشتمل ایک کتاب زیر طبع ہے۔ ان کی لکھی ہوئی اردو تدریس کی کتاب 'آسان اردو' کی لاکھوں کاپیاں اردو کے پرچم کو آج بھی بلند کر رہی ہیں۔

اردو کا یہ مایہ ناز فرزند 9 اکتوبر 1996 کو لکھنؤ میں ایک نرسنگ ہوم میں معمولی سی علالت میں دار فانی کو چھوڑ گیا:

جو کچھ تھا اپنے پاس تجھے دے کے اٹھ گیا
سوغات کو نہ دیکھ، میرے حوصلے کو دیکھ

■

Prof. Jamal Nusrat, Roshni, 509/148, Old Hyderabad, Lucknow - 226007 (UP)

عبدالقادر

فارسی زبان اور لچھمی نرائن شفیق

لچھمی نرائن شفیق 2 صفر 1158ھ مطابق 1738 اورنگ آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ منسارام آپ کے والد اور بھوانی داس آپ کے دادا تھے۔ بھوانی داس کی موت کے وقت منسارام کی عمر صرف دس سال تھی۔ اس کمسنی میں والد کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ دورِ یتیمی میں جسونت رائے نے منسارام کی پرورش کی پوری ذمے داری بخوبی اُٹھائی۔ آپ کھتری کپور ذات سے نسبت رکھتے تھے۔ یہ برادری اس خطّے میں اپنا ایک الگ اثر و پہچان رکھتی تھی۔ انھی دنوں سیر و سیاحت کی غرض سے بھوانی داس لاہور چھوڑ کر اورنگ آباد دکن سکونت پزیر ہوئے۔ بادشاہ اورنگ زیب نے اپنے لشکر میں انھیں ایک خاص اہم عہدے پر مامور کیا۔ بھوانی داس فن مصوری میں ماہر تھے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے آپ دربار میں پیشکار کے کام پر مامور تھے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اورنگ زیب بادشاہ کو فارسی شاعری سے اُلفت نہ تھی۔ کیونکہ اس نے اپنے دربار سے ملک الشعرا کے خاص عہدے کو ختم کر دیا تھا۔ لیکن محمد شاہ رنگیلے نے پھر سے مغل دربار میں شعر و شاعری کی محفل سجائی۔ شعرا اور فنکاروں کو یکجا کیا اور اُنھیں بڑے بڑے انعامات سے نوازا۔ ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی نے لکھا ہے کہ بہادر شاہ کے زمانے سے محمد شاہ کے دورِ حکومت تک فارسی شعر و شاعری اور ادب کا دستور تھا۔ اُس زمانے میں مرزا عبدلقادر بیدل عظیم آبادی، سراج الدین علی خان آرزو، عبدالجلیل بلگرامی، مرتضیٰ قلی خاں فراق اور سلمان قلی خان وداد وغیرہم فارسی میں اشعار کہتے تھے اور کبھی کبھی اردو میں بھی کہتے تھے۔ لیکن زیادہ تر رواج فارسی کا ہی تھا۔ منشی غلام حسین خاں کا بیان ہے کہ شیخ محمد علی حزیں کو محمد شاہ نے وزارت کا عہدہ دینا چاہا تھا، مگر انھوں نے منظور نہیں کیا۔ اس عہد میں والہ داغستانی، شاہ فقیر اللہ آفریں لاہوری، میر شمس الدین فقیر دہلوی، شاہ عبدالحکیم حاکم لاہوری، مولانا آزاد بلگرامی، صمصام الدولہ شاہنواز خاں، مرزا افضل بیگ خاں قاقشال، ثابت الٰہ آبادی، وغیرہم بھی فارسی میں صاحب دیوان شعرا تھے۔ لیکن اس عہد میں فارسی زبان و ادب سے تعلق رکھنے والی شخصیتوں کی کمی نہیں تھی۔

بلگرام قصبہ ضلع ہردوئی صوبہ اُتر پردیش کو یہ فخر حاصل ہے کہ مولانا آزاد بلگرامی جیسی تابناک شخصیت اس خاک سے وجود میں آئی اور اس کے بعد ہی بلگرام کا مقام فارسی شعر و ادب کی دنیا میں بلند و بالاتر ہو گیا۔ یہی وہ بلگرام ہے جہاں سے بے شمار فارسی شعرا و ادبا پیدا ہوئے اور ہندوستان کے مختلف شہروں میں پھیل گئے۔ یہاں کی آب و ہوا میں روحانیت کی خوشبو جذب و پیوست اور رچی وبسی ہوئی ہے اور کیوں نہ ہو۔ حضرت بختیار کاکی جیسی عظیم شخصیت کی دعاؤں کے فیض نے اس سرزمین کے ذرّے ذرّے کو تابناک و منوّر بنا دیا۔ اس عہد میں لچھمی کی تعلیم و تربیت ایک باکمال و تجربہ کار استاد مولانا آزاد بلگرامی کے ہاتھوں ہوئی۔ لائق استاد کی سرپرستی میں پرورش پرداخت کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کے اندر سن شعور سے ہی فارسی زبان و ادب کا ذوق و شوق پروان چڑھنے لگا۔ آپ ذہین تو تھے ہی نقش و نگار مرتب ہونے میں زیادہ وقت صرف نہ ہوا۔ ان کی تعلیم کے ساتھ ساتھ سخن گوئی کی مشق بھی چلتی رہی۔ زبان میں تراش و خراش میں نکھار فروغ پاتا رہا۔ یہاں تک کہ آپ فارسی زبان کے صاحب دیوان شاعر بن گئے۔

'مآثر آصفی' اور 'مآثر حیدری' میں لکھا ہے کہ آپ فن تاریخ میں بھی دخل رکھتے تھے۔ 'تذکرہ سخنوران بلند فکر' میں مزید لکھا ہے کہ شفیق فن تاریخ نویسی میں کامل درسگاہ رکھتے تھے۔ وہ اردو و فارسی زبان میں عمدہ اشعار بھی کہتے تھے۔ آپ کے تین تذکرے فارسی زبان میں مقبول عام ہیں۔ 'گل رعنا' شام غریباں اور چمنستان شعرا' جیسے تذکرے آج تک وجود میں نہیں آئے۔

شفیق نے نواب میر نظام علی خان صوبہ دار دکن کی حکومت میں 1175ھ مطابق 1755 تک ملازمت کی۔ آصف جاہ کے عہد حکومت کے ایک اہم منصب دار و ناصر جنگ شہید کے عہد کے دیوان اور مآثر الامرا کے مصنف شاہ نواز خان، جنھیں عالم گیر ثانی بادشاہ نے 1168ھ مطابق 1752 میں شاہ نواز خان کو 'تحفہ اور مراتب' عطا کیے تھے۔ انھوں نے شفیق کو 'دولت چند' کے لقب سے نوازا تھا۔ پہلے آپ کا تخلص 'صاحب' تھا بعدۂ استاد محترم مولانا آزاد بلگرامی نے 1186ھ مطابق 1766 میں 'شفیق' تخلص عطا کیا۔ بعض تذکروں میں مرقوم ہے کہ آپ اردو زبان (ریختہ) میں 'صاحب' ہی تخلص رکھتے تھے۔

'مآثر آصفی' اور 'مآثر حیدری' میں لکھا ہے کہ آپ فن تاریخ میں بھی دخل رکھتے تھے۔ 'تذکرہ سخنوران بلند فکر' میں مزید لکھا ہے کہ شفیق فن تاریخ نویسی میں کامل درسگاہ رکھتے تھے۔ وہ اردو و فارسی زبان میں عمدہ اشعار بھی کہتے تھے۔ آپ کے تین تذکرے فارسی زبان میں مقبول عام ہیں۔ 'گل رعنا' 'شامِ غریباں اور چمنستان شعرا' جیسے تذکرے آج تک وجود میں نہیں آئے۔ گل رعنا اور شام غریباں کے بیش قیمتی قلمی نسخے خدا بخش خان لائبریری پٹنہ (بہار) میں موجود ہیں اور چمنستان شعرا شائع ہو چکا ہے۔ اس میں شفیق نے حیدر آباد صوبہ دکن

کے ایک گمنام شاعر ناصر جنگ شہید کے اردو شعر کو نقل کیا ہے:

چشم بد دور خوش نین سارے
اپنے ناصر کو پیار کرتے ہیں
(چمنستان شعرا،ص314)

'گل رعنا قلمی' میں ناصر جنگ کے متعلق رقم طراز ہیں:

ناصر: نواب نظام الدولہ ناصر جنگ شہید خلف الصدق نواب آصف جاہ غفران پناہ است و برآسمان امارت و قابلیت، آفتاب عالم تاب احوال مفصل او کسی بقلم تواند و اورد کہ لطاق ہمت بہ تصنیف کیابی علیحدہ بر بندو ناچار بہ ترجمہ کہ جنا آزاد مدظلہ العالی مجملاً در خزانہ عامرہ تحریر فرمودہ اند از اں مجمل ہم اجمالی برگرفتہ در ینجا رقم می پزیرد۔ نواب بعد رحلت نواب آصف جاہ، بر مسند ریاست دکن .... غنیم را دست خوش ہراس داشتۂ کہ تا آخر العہد او یا از خدمت نگزاشت ....قضا و قدر اسباب انتقال نواب نظام الدولہ آمادہ ساخت و دردل مظفر جنگ و ہمت خان وغیرہما بقتل رسیدند وخود نواب نظام الدولہ یک قلم قاتلان خود را بخاک ہلاک غلطانیہ۔ بافقیر (یعنی آزاد بلگرامی) و نظام الدولہ معیت و اخلاص فوق البیان بود و از ابتدای ملاقات تا انتہای ایام حیات ہمشل من از ورادردام حسن خلق خود مقصد داشت۔ (گل رعنا از لچھمی نرائن شفیق ورق،239)

اس تحریر کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ آصف جاہ کے متعلق اور ناصر جنگ شہید کی شہادت کے احوال و واقعات بہت ہی واضح طور پر بیان کیے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ناصر تصویریں بہت ہی دلکش بناتے تھے اور فن موسیقی اور سرود سنگیت میں بھی ماہر استاد تھے۔ انھیں سنسکرت زبان پر مکمل عبور حاصل تھا۔ وہ بہت شستہ و سلیس بولتے اور عمدہ خوشخط لکھتے تھے۔ ان کے اوصاف قلم سے لکھے نہیں جاسکتے۔ وہ امارت و قابلیت کے آسمان پر درخشاں ستارے کی مانند، اور چمکتے ہوئے سورج کی طرح تھے۔ ان کے مفصل احوال لکھنے کی ہمت و جرأت کسی کے اندر نہیں تھی۔ انھوں نے ناصر جنگ کے دیوان کو اُن کے دستخط کے ساتھ دیکھا تھا جس میں اس وقت تقریباً چھ 6000 ہزار اشعار تھے:

خوف سے مار کے یاراں اسے لرزاں نہ کرو
زلف کا نام نہ لیو دل کو پریشاں نہ کرو
نین کی چکری میں دل جڑ کے بھیجو ہوں تری خاطر
اگر پہنچے تمھارے ہات لکھ بھیجو کہ پہنچی ہے
اکھڑی ہے چوٹ غم کی مو سر سے تا کف پا
تم کو نہ چھاجتا ہے ہم سے بھٹک کے چلنا

ناصر جنگ شہید کی شہادت کے احوال و واقعات میں آزاد بلگرامی، قاقشال، لچھمی نرائن شفیق، قدرت اللہ گو پاموی اور میر احمد علی خان عاقل رفاعی بھی متفق ہیں۔ شفیق نے 'گل رعنا' نام سے فارسی تذکرہ 1182ھ مطابق 1762 میں لکھا تھا۔ وہ ان دنوں دربار شاہی سے وابستہ تھے اور خصوصی امور پر اپنے فرائض انجام دے رہے تھے۔ مولانا آزاد بلگرامی کی پیروی سے شاہنواز خان نے انھیں 'بخشی الممالک' دکن کا عہدہ دیا تھا۔ واضح ہو کہ آزاد بلگرامی اور شاہنواز خان ایسے دوست تھے معلوم ہو دو قلب ایک جان۔

(1) چمنستان شعرا،ص (2) 314 گل رعنا قلمی از لچھمی نرائن شفیق ورق (3) 239 چمنستان شعرا،ص 314

ان کی شہادت پر بیحد مغموم ہوئے اور ذیل کا قطعہ تاریخ کہا:

رفت صمصام الدولہ از جہان
سوم ماہ شریف رمضان

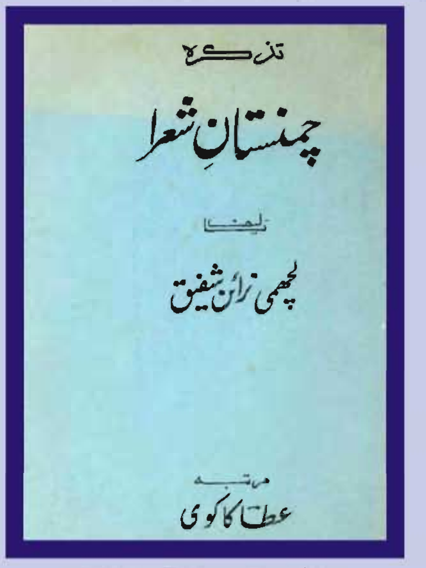

سال این واقعہ آن سد خود
نکفت ما کشتۂ عبد الرحمان

شفیق نے اپنے تذکروں میں بنگال کے ایک روپوش فارسی شاعر مرشد قلی خان مخمور کا ذکر کیا ہے وہ لکھتے ہیں کہ مخمور صاحب دیوان شاعر تھے۔ لیکن راقم حروف کو ان کا دیوان اب تک دستیاب نہ ہو سکا۔ نظام الملک آصف جاہ صوبہ دار دکن سے مخمور کے دوستانہ تعلقات تھے۔ وہ آصف جاہ سے سات سال بڑے تھے۔ لیکن فارسی کے بیشتر تذکروں میں مخمور کا ذکر نہیں ملتا۔ مرشد قلی خان مخمور فن سپہ گری و تلوار بازی میں ماہر تھے۔

1180ھ مطابق 1760 میں جب دوسری بار میر شمس الدین فقیر دہلوی اورنگ آباد تشریف لے گئے تو ان دنوں شفیق روزانہ شام کے وقت فقیر دہلوی سے ملنے ان کی قیام گاہ پر جایا کرتے تھے۔ شفیق کی اکثر و بیشتر ملاقاتیں مولانا آزاد بلگرامی سے ہوتی تھیں۔ وہاں بھی فارسی شاعری کی اصلاح و مشق آپ ان سے لیتے رہے۔ اس تربیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی زبان میں شفیق کو مکمل عبور حاصل ہو گیا۔ اورنگ آباد میں شفیق نے میر شمس الدین فقیر دہلوی کے استقبال میں نہایت عمدہ قطعہ تاریخ کہا ہے:

وارد این شہر در ذی الحجہ شد
شاعر و دانش و ر و روشن ضمیر
سال تاریخ قدوم او شفیق
گفتہ آمد میر شمس الدین فقیر

شفیق نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں ایسی شاعری کی جس کی مثال سرزمین ہندوستان میں بہت مشکل سے ملے گی۔ ان کی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت اور خوبی یہ ہے کہ اشعار میں جن جدت اسلوب کو داخل کیا ہے وہ نہایت عمدہ ہیں ساتھ ہی آسان لفظوں کو دلکش انداز میں عام فہم طور پر استعمال کیا ہے۔ درد اور شیرینی ان کی شاعری کے خاص جز ہیں۔ فارسی زبان پر انھیں پوری قدرت حاصل تھی جس کا اندازہ ذیل میں ان کے چند اشعار سے بہ خوبی لگایا جاسکتا ہے
؎ لگایا جاسکتا ہے:

گرچہ ای دوست نہ دیدم بہ چمن روی ترا
دائم از باد صبا می شوم بوی ترا
شانہ زخمی کن و آشفتہ مکن دلہارا
جمع گشتند درآن زلف پرشانی چند
سنبل تازہ و تر دود شود در چشمم
گر نہ بینم بہ چمن سنبل گیسوی ترا
دست مالیدن تو شو د نہ بخشی د شفیق
حیف چون رنگ حنا فصل گل از دست تو رفت

تصنیفات و تالیفات میں لچھمی نرائن شفیق کی طویل فہرست ہے۔ ذیل میں ان کے نام درج کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ تاکہ ہم تحقیق کاروں کو بروقت دشواریوں کا سامنا نہ کرنا پڑے اور مستقبل میں مزید استفادہ کیا جاسکے:

(1) حقیقت ہای ہندوستان
(2) چمنستان شعراء
(3) شام غریباں
(4) گل رعنا
(5) بساط الغنائم
(6) مآثر حیدری
(7) مآثر آصفی
(8) حالات حیدر آباد
(9) تمنیق شگرف
(10) خلاصۃ الہند

Dr. Abdul Qadir, Lecturer Persian, G.I. College, Allahabad - 211001 (UP)

احمد علی جوہر

اقبال متین
کثیرالجہات ادبی شخصیت

اقبال متین (پیدائش: 2فروری 1929، وفات: 5مئی 2015)اردوادب میں کثیرالجہات شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک مستند افسانہ نگار، ناولٹ نگار، یادنگار، شاعر، مضمون نگاراور خاکہ نویس تھےاوران کا شمار اہم اورممتاز افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ اصل نام 'سید مسیح الدین خاں' عرف 'اقبال' اور تخلص 'متین' رکھا تھا۔اقبال متین ان کا قلمی نام ہےاور تعلیمی ریکارڈ میں بھی یہی نام درج تھا۔ان کی پیدائش فرحت منزل، محلّہ رام کوٹ، حیدرآباد میں ہوئی۔ان کی تاریخ پیدائش اسکول کے تعلیمی ریکارڈ کے مطابق 2فروری 1929 ہے۔ اقبال متین کے والدسید عبدالقادر شاعر تھےاورناصر تخلص کرتے تھے۔ان کے دو چچا سید قادرالدین تمکین سرمست (پدر یوسف سرمست)اورنسیم قاسمی خوش فکر غزل گوشاعر تھے۔تیسرے چچا دستگیرالدین ڈرامہ نویس تھے۔ ان ہی بزرگوں کے زیراثر اقبال متین کے شعری وادبی ذوق کی نشوونما ہوئی تھی۔

اقبال متین کی ابتدائی تعلیم مدرسہ وسطانیہ بشیرآباداور مدرسہ فوقانیہ، چیتاپور میں ہوئی۔ سٹی ہائی اسکول، حیدرآباد سے دسویں کا امتحان پاس کیا۔ چوں کہ ان کے والد تعلقدار اور تحصیلدار کے عہدے پر فائز تھے، اس لیے ان کے تبادلے کے ساتھ ساتھ اقبال متین کی درسگاہیں بھی بدلتی رہیں۔ کچھ دنوں ان کی تعلیم ایم اے او انسٹی ٹیوٹ، عابڈس، حیدرآباد، سٹی کالج، حیدرآباد اور دارالعلوم کالج، حیدرآباد میں ہوئی۔ انٹرمیڈیٹ انھوں نے چادرگھاٹ کالج، حیدرآباد سے پاس کیا۔ان تعلیمی اداروں میں انھیں مخدوم محی الدین اورمحی الدین قادری زور جیسے اساتذہ کی سرپرستی حاصل رہی۔ یہاں انھیں رفقا بھی ایسے میسّر آئے جو ستھرے ادبی ذوق کے مالک تھے۔ان اساتذہ اور رفقاء کی صحبت نے بھی ان کے ادبی شعور کو جلا بخشنے میں اہم رول ادا کیا۔ انٹرمیڈیٹ کے بعد جب اقبال متین کو ملازمت نہیں ملی تو انھوں نے پان کی دکان لگالی۔ یہ دکان زیادہ نہیں چلی۔ اسی دوران محکمہ آبکاری میں انھیں ملازمت ملی۔ پولیس ایکشن کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہوگیا تو حیدرآباد کے جاگیرایڈمنسٹریشن میں ملازم ہوئے۔ یہاں ان کا تقررکلرک کی حیثیت سے ہواتھا۔ جاگیرایڈمنسٹریشن جب محکمہ بندوبست میں ضم ہوگیا تو اقبال متین کی خدمات محکمہ مال کے سپرد کردی گئیں۔ یہاں ترقی کرکے وہ نائب تحصیلدار کے عہدے پر فائز ہوئے اوراسی عہدے پر خدمات انجام دیتے ہوئے سبکدوش ہوئے۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد وہ اپنی تصنیفی سرگرمیوں میں بڑی مستعدّی سے منہمک رہے۔ یہی وجہ ہے کہ عمر کے اس پڑاؤ میں وہ اپنی کئی تخلیقات وتصنیفات منظرعام پر لانے میں کامیاب رہے۔ ان کی آخری تصنیف 'اُجالے جھروکے میں' (مضامین کا مجموعہ) 2008میں شائع ہوئی۔اس کے بعدوہ ضعیفی کے تقاضے کے تحت تصنیفی وتخلیقی کاموں سے دست بردار ہوکر آرام فرمانے لگے۔ وہ اس اعتبار سے خوش نصیب رہے کہ انھیں کوئی بڑا عارضہ لاحق نہیں ہوا البتہ اخیر عمر میں وہ تھوڑا کم سننے لگے تھے۔ضعف وپیرانہ سالی کے باوجود وہ نوجوانوں سے اس شفقت ومحبت سے ملتے تھے کہ ان کے دلوں میں ایک نئی اُمنگ پیدا ہوجاتی تھی۔ وہ فون پراس پیار بھرے انداز میں بات کرتے تھے کہ ان سے مسلسل بات کرتے ہی رہنے کو جی چاہتا تھا۔ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ شخص ابھی بالکل ضعیف نہیں ہوا ہے۔سچ کہا ہے کسی نے کہ حقیقی ادیب کبھی ضعیف نہیں ہوتا ہے۔ کسے معلوم تھا کہ ایسی محبوب شخصیت اچانک ہم سے جُدا ہوجائے گی۔ان کے چھوٹے بیٹے سید سدید اقبال کے مطابق موت سے تین چار دن پہلے سر میں چکّر آنا شروع ہوا۔ بالآخر 5مئی کی صبح 9:20سے 9:30 کے درمیان انھوں نے اپنی زندگی کی آخری سانس لی۔اللہ مرحوم کوغریق رحمت کرے۔

اقبال متین کی دوشادیاں ہوئی تھیں۔ پہلی شادی پھوپھی زاد بہن سیدہ بدرالنسا بیگم منیر سے ہوئی۔ اس کے انتقال کے بعد دوسرا عقد شاہ جہاں بیگم رابعہ سے ہوا۔ ان کو کل 9اولادیں ہوئیں۔ 7لڑکے اور 2لڑکیاں۔ان میں سے تین لڑکوں کا انتقال ان کی زندگی ہی میں ہوا۔پہلی بیوی اور بچّوں کی ناگہانی موت سے اقبال متین کو دلی صدمہ پہنچا۔انھوں نے اپنی تخلیقات میں رِقّت آمیز پیرائے میں اس دردوغم کا اظہار بھی کیا ہے۔

اقبال متین کی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہوا۔ان کی پہلی نظم 'کب تلک'، 'سب رس' حیدرآباد میں 1942 میں شائع ہوئی۔ اسی سال ان کی دوسری نظم 'کیوں؟' کے عنوان سے حیدرآباد ہی کے رسالہ 'ارم' میں چھپی۔ان چند نظموں کے کہنے کے بعد اقبال متین نے اپنا رُخ شاعری سے کہانی کی طرف کیا۔ان کی پہلی کہانی 'چوڑیاں' کے عنوان سے جون 1945 میں 'ادبِ لطیف' لاہور میں شائع ہوئی۔ دوسری کہانی ''سنہری لکیریں'' فروری 1946 میں 'ادبی دنیا' میں چھپی۔ تیسری کہانی 'مرگھٹ' اور چوتھی کہانی 'تانبہ اور پانی' 'ادبِ لطیف' اور 'نیا دور' میں شائع ہوئیں۔ان ابتدائی کہانیوں کی اشاعت کے بعد کچھ گھریلو الجھنوں اور نجی پریشانیوں کی وجہ سے وہ کچھ برسوں تک خاموش رہے۔اس خاموشی کے بعد وہ پھر افسانے لکھنے کی طرف ایسے مائل ہوئے کہ افسانے ہی کے ہوکر رہ گئے۔ 1960 میں ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'اُجلی پرچھائیاں' کے عنوان سے منظرعام پر آیا۔ اس کے بعد ان کے چھ اور افسانوی مجموعے سامنے آئے جن کے نام علی الترتیب یہ ہیں۔ 'نُچا ہوا البم' (1973)، 'خالی پٹاریوں کا مداری' (1977)، 'آگہی کے ویرانے' (1980)، 'مزبلہ' (1989)، 'میں بھی فسانہ تم بھی کہانی' (1993)، 'شہرآشوب' (2003)

اقبال متین نے افسانوں کے علاوہ ناولٹ، یادیں اور خاکے بھی لکھے ہیں۔ مضامین بھی سُپردِ قلم کیے ہیں اور شاعری بھی کی ہے۔ 'چراغِ تہہِ داماں' (1976) ان کا ناولٹ ہے۔ 'سوندھی مٹی کے بُت' 19950) ان کے لکھے خاکوں کا مجموعہ ہے۔ 'باتیں ہماریاں' (1998) ان کی یادوں پہ مشتمل مجموعہ

ہے۔ ’صریر جاں‘ (2006) شعری مجموعہ ہے۔ ’اعتراف وانحراف‘ (2006) اور ’اُجالے جھروکے میں‘ (2008) ان کے مضامین کے مجموعے ہیں۔

اقبال متین کی ادبی شخصیت کے مختلف زاویے ہیں۔ انھوں نے اردو ادب کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان مختلف ادبی اصناف میں طبع آزمائی نے ان کی شخصیت کو رنگا رنگ بنا دیا ہے۔ اقبال متین کی شخصیت کے اگرچہ کئی پہلو ہیں مگر ان کی بنیادی شناخت افسانہ نگار کی ہے۔ ان کا افسانوی سفر تقریباً چھ دہائیوں پر محیط ہے۔ اس طویل عرصے میں انھوں نے افسانوی ادب کے سرمائے میں گراں قدر اضافہ کیا ہے اور بہت سی ایسی خوبصورت اور شاہکار کہانیاں لکھی ہیں جن سے دنیائے افسانہ میں ان کی اپنی منفرد و مستحکم شناخت قائم ہوئی اور وہ باکمال افسانہ نگاروں میں تسلیم کیے گئے۔

اقبال متین نے اپنی کہانیوں میں حیدرآباد کی زوال پذیر جاگیردارانہ زندگی، اس کے تضاد اور اس کے اقدار، جاگیردار طبقے کی جھوٹی شان وشوکت اور کھوکھلی رعونت کی حیرت انگیز تصویر کشی کی ہے۔ ’گرتی دیواریں‘، ’ملبہ‘، ’کتاب سے کتبہ تک‘ اور ’آدمی اور آدمی‘ اس موضوع پر دلچسپ افسانے ہیں۔ ان کے افسانوں کے عام موضوعات انسانی اقدار کے زوال، انسانوں کی خود غرضی، زندگی سے اخلاقیات کا یکسر غائب ہو جانا، مذہب کے نام پر فرقہ وارانہ منافرت کا زبردست پروپیگنڈا، قتل وغارت گری، شہروں کا تیزی سے بدلتا ہوا کردار، زندگی کے ہر شعبے پر تصنّع کا ملمّع، دولت کی ہوس میں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی دوڑ، آبادی کے ایک بڑے طبقے میں شدید غربت، بوڑھے والدین کو بے یارو مددگار چھوڑ کر غیر ملکوں میں بس جانا، پال پوس کر بڑا کرنے والے والدین کے تئیں غیر انسانی بے اعتنائی، دنیا سے جانے والوں کی ناقابل فراموش اور غمگین یادیں وغیرہ ہیں۔ اقبال متین کے افسانوں کو پڑھ کر یہ شدید احساس ہوتا ہے کہ وہ موجودہ حد سے بڑھی ہوئی مادّی تہذیب سے بے حد نالاں ہیں۔ اس مادّی تہذیب کی وجہ سے انسانی واخلاقی قدریں ملیامیٹ ہو رہی ہیں۔ افراد بے حس ہو رہے ہیں۔ افراد کی طرح ہمارے شہر بھی بے چہرہ اور بے حس ہو چکے ہیں۔ اب ان کی کوئی انفرادی شناخت باقی نہیں رہ گئی ہے۔ اس سنگین صورت حال سے اقبال متین سمجھوتہ نہیں کر سکتے۔ شاید اسی لیے ان کے اکثر مرکزی کردار شدید ترین ذہنی اور دماغی الجھنوں اور مستقل بے خوابی کا شکار نظر آتے ہیں۔

اقبال متین کے افسانے فنّی وتکنیکی اعتبار سے بہت متاثر کرتے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں فنکارانہ اختصار سے کام لیا گیا ہے اور فنّی ہنرمندی کا بھرپور مظاہرہ کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیاں ساحرانہ فضا پیدا کرنے اور قاری کو اپنی طرف متوجّہ کرنے میں خاصی کامیاب ہوئی ہیں۔ ناقدین نے ان کی افسانہ نگاری کو تحسین کی نظروں سے دیکھا ہے اور انھیں اہم افسانہ نگاروں میں تسلیم کیا ہے۔

اقبال متین نے اپنے ناولٹ ’چراغِ تہہِ داماں‘ میں موجودہ سرمایہ دار مادّی معاشرے کی عکاسی کی ہے۔ یہاں سماج کے اس رُخ کو بے نقاب کیا گیا ہے کہ عورتوں کے جسم سے تو سب پیار کرتے ہیں مگر ان کی روح کی پرواہ کوئی نہیں کرتا۔ اس ناولٹ کے دو اہم کردار ہیں۔ ماں کوشلیا، اس کا بیٹا شانوجہ۔ کوشلیا اپنی غلطیوں اور حالات کی مجبوریوں کے تحت طوائف بن جاتی ہے۔ وہ اپنے بیٹے شانوجہ کو اس ماحول سے دور رکھنا چاہتی ہے مگر اس کی کوشش رائیگاں جاتی ہے اور شانوجہ ایک کامیاب مرد طوائف کے روپ میں سامنے آتا ہے۔ شانوجہ کوشلیا کا بیٹا ہے اور اس کے لیے وہ ایسا چراغ ہے جس کے سہارے وہ زندگی جینا چاہتی ہے مگر جب یہ ٹمٹماتا چراغ بُجھ جاتا ہے تو کوشلیا کی زندگی کی رہی سہی آخری اُمیّد بھی ختم

اقبال متین نے شاعری بھی کی ہے۔ ان کے شعری مجموعے ’صریر جاں‘ میں سو غزلیں اور سولہ نظمیں ہیں جو اپنی رعنائی ودلآویزی سے متاثر کرتی ہیں۔ ان کی شاعری عموماً ان کی ذات کے گرد گردش کرتی نظر آتی ہے۔ شہریار ان کی شاعری کے بارے میں رقم طراز ہیں: ’’اقبال متین کی شاعری کے بارے میں جو باتیں خاص طور سے کہی جاسکتی ہیں

ہو جاتی ہے، اسی لیے وہ موت کی آغوش میں چلی جاتی ہے۔ اس ناولٹ میں اقبال متین نے موجودہ معاشرے کے ایک سنگین ترین رُخ کو سامنے لا کر کئی زاویوں سے ہمیں سوچنے پر مجبور کیا ہے۔ فنّی اعتبار سے یہ ایک دلچسپ ناولٹ ہے۔

’سوندھی مٹی کے بت‘ میں اقبال متین نے شخصیات اور خاکے کے عنوانوں کے تحت ان ممتاز ہستیوں پر قلم اُٹھایا ہے جن سے عمر کے مختلف حصوں میں ان کا شب وروز کا ساتھ رہا ہے، یا پھر جن سے وہ متاثر ہوئے ہیں۔ ان میں سے بیشتر بلند پایہ ادیب، شاعر اور پُرخلوص دوست ہیں۔ مخدوم محی الدین، سلیمان اریب، شاذ تمکنت، ڈاکٹر سید عبدالمنان اور حسن چشتی پر لکھے خاکہ نما مضامین اور لطیف ساجد، تمکین سرمست، پروفیسر یوسف سرمست، راشد آزر، ڈاکٹر غیاث صدیقی اور ابراہیم شفیق پر لکھے خاکے بہت موثر ہیں۔ ان خاکوں میں شخصیات چلتی پھرتی نظر آتی ہیں اور اپنی خوبیوں وخامیوں کے ساتھ اس طرح ہماری نگاہوں کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہیں کہ ہمارے ذہن ودل میں گھر کر جاتی ہیں۔ اس مجموعے کے بیشتر خاکے فنّی اعتبار سے اچھے ہیں۔

’باتیں ہماریاں‘ میں اقبال متین نے ماضی کی خوبصورت یادوں کو دلکش ادبی پیرایہ اظہار عطا کیا ہے۔ یہاں انھوں نے مختلف علمی وادبی، سماجی وسیاسی شخصیات سے وابستہ یادوں کو اس خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے کہ ان یادوں کے آئینے میں ہمیں ان شخصیات کے اخلاق وکردار کی ایک حسین جھلک نظر آتی ہے۔ ان یادوں میں ہمیں اس بزم کی خوشبو بھی محسوس ہوتی ہے جس میں اقبال متین کی ان شخصیات سے ملاقات ہوئی اور ان کے ساتھ ان کا وقت گزرا۔ یہ یادیں اردو ادب کا بیش بہا سرمایہ ہیں۔

’اعتراف وانحراف‘ اور ’اُجالے جھروکے میں‘ اقبال متین نے مختلف ادبی شخصیات اور ان کے فن کو محور بنا کر تاثراتی مضامین لکھے ہیں۔ ان مضامین میں ہلکی تنقید کی چاشنی بھی ملتی ہے۔ کہیں کہیں سوانحی اشارے بھی پائے جاتے ہیں۔ ان مضامین میں زیادہ تر شخصیات کے شخصی اوصاف کو ادبی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ادبی اعتبار سے یہ مضامین لائق مطالعہ ہیں۔

اقبال متین نے شاعری بھی کی ہے۔ ان کے شعری مجموعے ’صریر جاں‘ میں سو غزلیں اور سولہ نظمیں ہیں جو اپنی رعنائی ودلآویزی سے متاثر کرتی ہیں۔ ان کی شاعری عموماً ان کی ذات کے گرد گردش کرتی نظر آتی ہے۔ شہریار ان کی شاعری کے بارے میں رقم طراز ہیں: ’’اقبال متین کی شاعری کے بارے میں جو باتیں خاص طور سے کہی جاسکتی ہیں وہ یہ ہیں کہ شاعری (1) خاصی Personal یعنی ذاتی ہے (2) غموں میں ڈوبی ہوئی ہے اور (3) زندگی کی تلخی اور ماضی کے عذاب لیے ہونے کے باوجود خاصی مہذب ہے۔‘‘ (بحوالہ، اقبال متین سے اُنسیت، مرتب: نورالحسنین، ص، 361) اقبال متین کی شاعری بڑی شاعری کے زمرے میں اگرچہ نہیں آتی مگر سنجیدہ توجہ کی مستحق ضرور ہے۔

اقبال متین نے مختلف ادبی اصناف میں طبع آزمائی ضرور کی ہے مگر ان کی امتیازی شناخت افسانہ نگار کی ہے۔ افسانہ نگاری کے میدان میں انھوں نے فکری وفنّی مہارت کا ایسا مظاہرہ کیا کہ ان کا شمار معتبر اور اہم افسانہ نگاروں میں ہونے لگا۔ افسانہ کے میدان میں ان کی گراں قدر خدمات کو دیکھتے ہوئے ان کے بارے میں یہ کہنا بالکل بجا ہوگا کہ وہ آزادی کے بعد کے منفرد وممتاز اور قدآور افسانہ نگار ہیں جن کے ذکر کے بغیر اردو افسانے کی کوئی بھی تاریخ مکمل نہیں کہی جاسکتی۔

■

Ahmad Ali Jauher, Research Scholar, Room No: 236-E, Brahmaputra Hostel, JNU, New Delhi-110067

ناشر نقوی

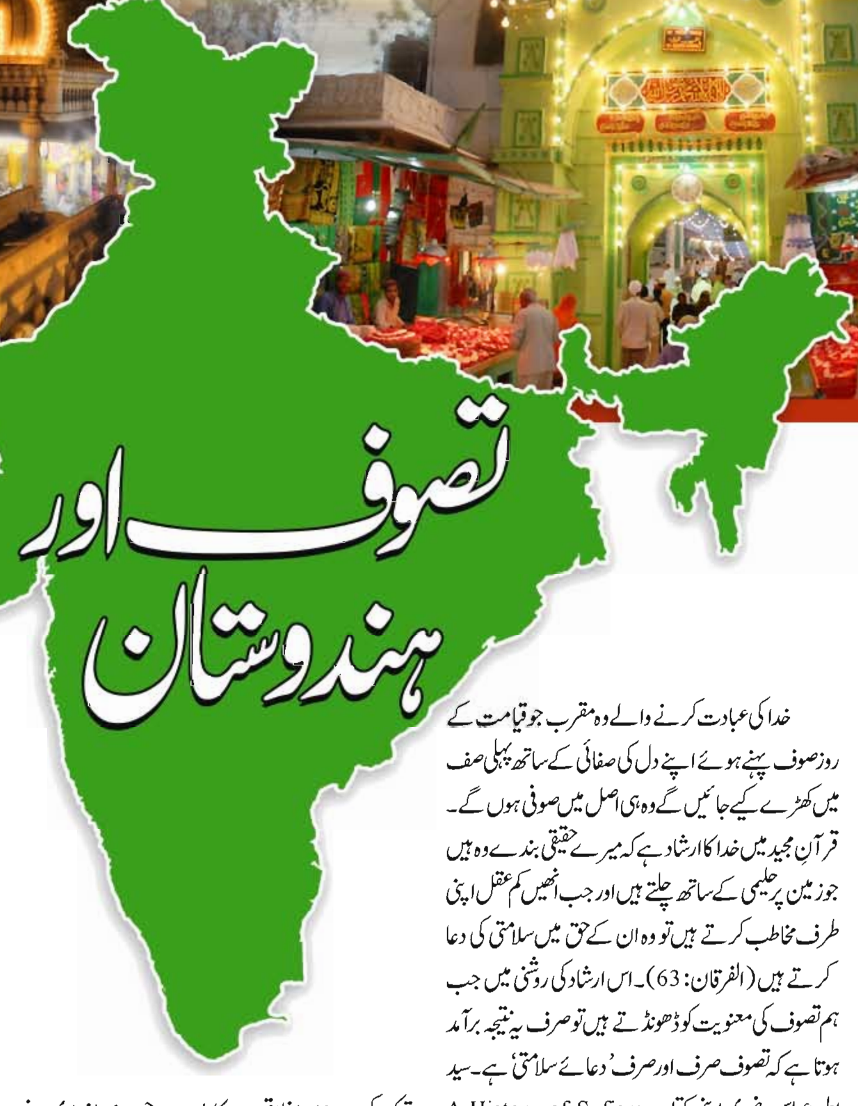

تصوف اور ہندوستان

خدا کی عبادت کرنے والے وہ مقرب جو قیامت کے روز صوف پہنے ہوئے اپنے دل کی صفائی کے ساتھ پہلی صف میں کھڑے کیے جائیں گے وہ ہی اصل میں صوفی ہوں گے۔ قرآنِ مجید میں خدا کا ارشاد ہے کہ میرے حقیقی بندے وہ ہیں جو زمین پر حلیمی کے ساتھ چلتے ہیں اور جب انھیں کم عقل اپنی طرف مخاطب کرتے ہیں تو وہ ان کے حق میں سلامتی کی دعا کرتے ہیں (الفرقان: 63)۔ اس ارشاد کی روشنی میں جب ہم تصوف کی معنویت کو ڈھونڈتے ہیں تو صرف یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ تصوف صرف اور صرف 'دعائے سلامتی' ہے۔ سید اطہر عباس رضوی اپنی کتاب A History of Sufism in India میں لکھتے ہیں:

''اُن روحانیت پرستوں کو ہی صوفی، ولی اللہ، درویش یا فقیر کہا جاتا ہے جو عبادت اور نفیِ ذات کے ذریعے روحانی ارتقا کے لیے کوشاں ہوتے ہیں۔ (ص 27)

روحانیت، ربوبیت پر یقین کی طاقت کا نام ہے جو ارادوں کی قوت اور اعتماد کی ریاضت سے حاصل ہوتی ہے۔ اس طاقت کا تعلق اجتماعیت سے نہیں انفرادیت سے ہوتا ہے۔ انفرادیت میں بنیادی درس یہ ہے کہ جو بات تم اپنے لیے پسند نہیں کرتے اُسے دوسروں کے لیے بھی پسند نہ کیا کرو۔

دوسرے لفظوں میں تصوف دنیاوی اور نفسیاتی لذتوں کو ترک کر دینے اور اخلاقِ حسنہ کا نام ہے جسے جنید بغدادی نے 'خیال کی دوستی' کا نام دیا ہے۔ خود پر قابو پانے سے جو باطنی قوت پیدا ہوتی ہے وہ ہی تصوف کی پہچان ہے۔ تصوف کے کچھ مخالفین نے ترکِ دنیا یعنی ترکِ لذت سے یہ بھی مفہوم نکال لیا کہ صوفی دنیا والوں سے اپنا رشتہ منقطع کر لیتے ہیں اور اس طرح تارکِ دنیا ہو جاتے ہیں۔ جبکہ تصوف اخلاقِ کریمہ ہے جو بہتر زمانے میں بہتر شخص سے بہتر قوم کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے۔ اس کا تعلق ولایت سے ہوتا ہے۔ تاریخ اسلام اور صوفیوں کی روایت کے مطابق اسلام میں ختمِ نبوت کے بعد ولایت کا سلسلہ حضرت علیؑ سے شروع ہوا جو قیامت تک جاری رہے گا۔ پروفیسر شمسی تہرانی لکھتے ہیں:

علما اور مفسرین میں حضرت علی کے لیے حدیثِ غدیر مَن کُنت و مولا سبھی کو تسلیم ہے اور اس سے صوفیائے اسلام نے حضرت علی کو شاہِ ولایت قرار دیا ہے۔

(تاریخِ خواجہ خواجگان: ص 123)

آٹھویں صدی عیسوی کے بزرگ صوفی حضرت شہباز قلندرؒ سے منسوب یہ اشعار حضرت علی کی ولایت کا ایسا اعلان ہیں جو ہمیشہ فضاؤں میں گونجتے رہتے ہیں:

دما دم مست قلندر
علی شہباز قلندر
علی دا پہلا نمبر
علی دم دم دے اندر

اور معروف بزرگ حضرت بوعلی قلندرؒ کا یہ آفاقی قطعہ بھی زبان زدِ عام ہے:

حیدریم قلندرم ہستم
بندۂ مرتضیٰ علیؑ ہستم
پیشوائے تمام رندانم
کہ سگِ کوئے شیرِ یزدانم

حضرت علی کی ولایت کے سلسلے میں حضرت مجدد الف ثانی سرہندیؒ نے ایک جگہ اپنے مکتوبات میں لکھا ہے:

''حضرت علی و ران کے بعد گیارہ ائمہ اہلِ بیت کو صوفیائے اسلام اپنا مرجع سمجھتے ہیں۔ یعنی قربِ ولایت کا منبع فیض حضرت علیؑ ہیں۔ (بحوالہ، تاریخ خواجہ خواجگان: ص 55)

اسلام کے ابتدائی زمانے میں حضرت علی کی روحانی

ولایت کے ورثہ دار امام حسن کی صلح نے تصوف کو عروج بخشا ہے۔یہیں سے تصوف میں 'صلحِ کُل' کا فلسفہ پروان چڑھا ہے۔مولانا عبدالرحمن جامی نے اپنی کتاب 'نفحات الانس' میں حضرت علی کے شاگرد شیخ ابو ہاشم کوفی کو پہلا باضابطہ صوفی قرار دیا ہے۔صوفی سے متعلق امام محمد باقر نے فرمایا ہے:

تصوف خوش اخلاقی کا نام ہے یعنی جو شخص زیادہ خوش اخلاق ہوتا ہے وہ زیادہ صوفی ہوتا ہے۔(ترجمہ' کشف المحجوب از غلام معین الدین صفحہ 73)

دنیا میں ظہورِ اسلام کے زیرِ اثر تصوف نے باطنی علم سے استوار ہو کر ایک عالم گیر تحریک کی صورت اختیار کی۔اہلِ تصوف کے یہاں رائج تصورِ چار پیر، چودہ خانوادے کے مطابق پیغمبرِ اسلامؐ کے بعد حضرت علی سے جن چار برگزیدہ ہستیوں تک باطنی علم پہنچا وہ حضرت امام حسن، حضرت امام حسین، خواجہ حسن بصریؒ اور خواجہ کمیلؒ ہیں۔ یہ وہ چار پیر ہیں جن میں سے خواجہ حسن بصریؒ (643-738) سے مربوط چودہ خانوادے سامنے آئے جن سے صوفیوں کے تمام سلسلے منسلک ہوئے۔تصوف کے یہ سلسلے ہیں زیدیہ، عیاضیہ، ادمیہ، ہبیریہ، چشتیہ، عجمیہ، طیفوریہ، سقطیہ، جنیدیہ، گازرنیہ، طوسیہ، سہروردیہ، نقشبندیہ اور فردوسیہ۔درحقیقت صوفیوں نے رضا کارانہ طور پر دنیا کے عیش و آرام کو ٹھوکر مار کر اپنے سادہ لباس اور اعلیٰ کردار کے ذریعے اپنی الگ شناخت قائم کی۔

عرب کے سماج کی بے راہ رویوں، قبائلی زندگی کی لوٹ مار اور آپسی نفاق و تفریق سے پریشان ہو کر، جن خدا ترس لوگوں کا ضمیر بیدار تھا وہ منتشر ماحول سے کنارہ کشی کرتے ہوئے گوشہ نشینی اختیار کر گئے۔اسلامی دنیا میں ابھری ہوئی بدامنی اور بدحالی نے حساس لوگوں کی ایک بڑی جماعت کو داخلیت پسند بنا دیا اور یہ لوگ صوف پوش ہو کر دنیا سے الگ تھلگ پرامن راہوں پر نکل پڑے۔اولادِ علی کا ایک سلسلہ امامت کی ذمے داریوں میں لگا رہا تو دوسرا سلسلہ توکل اور سلوک کا مبلغ ہو گیا۔عراق کے حسن بصریؒ (643-738 عیسوی) لباسِ صوف کو ترکِ دنیا کی علامت تصور کرتے تھے اور ظاہر و باطن میں توازن قائم رکھنے پر زور دیتے تھے۔اسی طرح حضرت رابعہ بصریؒ کی کُل اساس ایک ٹوٹا ہوا گھڑا، ایک پھٹی ہوئی چادر تھی، تکیے کی جگہ ایک اینٹ کا استعمال کرتی تھیں۔انھیں غربت پسندی کی تصویر کہا جاتا ہے۔ دوسری طرف کوفے میں حضرت ابو ہاشمؒ تھے جن کی تبلیغ تصوف یہ تھی کہ علم انسان کی ذاتی ملکیت ہوتا ہے جبکہ محبت کی دولت کو دونوں ہاتھوں سے لُٹایا جا سکتا ہے۔ابتدائی صوفیوں کا تیسرا مرکز بلخ تھا جہاں بادشاہت کو چھوڑ کے حضرت ابراہیم بن ادہمؒ (703-778) نے فقیری کو اختیار کیا تھا۔ان کا کہنا تھا کہ مذہبی آدمی، انکساری کی باتیں کرتا ہے جبکہ سالک انکساری کو اپنا شیوہ بناتا ہے۔عراق میں صوفیوں کا ایک اور مرکز شہرِ مرُو میں قائم ہوا جہاں کے ابو علی طالقانیؒ، عبداللہ حنظلیؒ اور ابو نصر بشرؒ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔آخر الذکر بزرگ نے فقیروں کے تین درجے متعین کیے تھے۔ پہلے درجے میں وہ فقیر آتے ہیں جو نہ کسی سے طلب کرتے ہیں اور نہ کسی کا تحفہ قبول کرتے ہیں ان کو جو ضرورت ہوتی ہے تو اسے خود خدا پورا کرتا ہے۔دوسرے وہ فقیر ہیں جو ہاتھ تو نہیں پھیلاتے لیکن عطیات قبول کر لیتے ہیں۔تیسرے وہ ہیں جو در در کی بھیک

مانگتے پھرتے ہیں۔حضرت ابو نصر بشرؒ نے اول درجے کی فقیری اختیار کرنے کی ہی تلقین کی ہے۔نویں صدی عیسوی میں تصوف کے مراکز نقشب، ترمذ، نیشاپور، بسطام، اور شیراز میں قائم ہوئے۔ یہاں کے بزرگوں میں حضرت ذوالنونؒ، ابو تراب عسکرؒ، عبداللہ ترمذیؒ، ابوالحسن سیاریؒ اور صالح حمدونؒ قابلِ ذکر ہیں جنھوں نے توحید، ترک، روزہ، فاقہ، قلب کی پاکیزگی کو اپنے پیغامات کی بنیاد بنایا۔اسی طرح دسویں صدی عیسوی میں شیراز کے حضرت عبداللہ محمدؒ نے غیبت پر زور دے کر صوفی مسلک کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا۔اسی زمانے کے حضرت ابو بکر شبلیؒ (وفات 946عیسوی) نے سالکوں کو اپنے دل کی تمام تر تمناؤں اور امنگوں کو عشقِ الٰہی میں تبدیل کرنے کی تلقین کی۔حضرت شبلیؒ حضرت شیخ علی ہجویری داتا صاحبؒ کے مرشد تھے۔ان کا ایک واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے ایک بار ایک دنیاوی حکیم سے کہا تھا مجھے گناہوں کا مرض ہے اگر اس کی دوا آپ کے پاس ہو تو عنایت کر دیں۔یہ بات ہو ہی رہی تھی کہ قریب ہی ایک تنکے چننے والا فقیر ان کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ شبلیؒ میرے پاس آؤ میں تمھیں اس کی دوا بتاتا ہوں۔دوا تن کر جب حضرت شبلیؒ نے نگاہ اُٹھائی تھی تو وہ مجذوب فقیر غائب ہو چکا تھا۔گناہوں کے مرض کا اُس نے جو نسخہ بتایا وہ یہ تھا۔

حیا کے پھول، صبر و شکر کے پھل، عجز و نیاز کی جڑ، غم کی کونپل، سچائی کے درخت کے پتے، ادب کی چھال، حسنِ اخلاق کے بیج، یہ سب لے کر ریاضت کے ہاون دستے میں کوٹنا شروع کرو اور اشکِ پشیمانی کا عرق ان میں روز ملاتے رہو۔ان سب دواؤں کو دِل کی دیگچی میں بھر کر شوق کے چولہے پر پکاؤ۔ جب پک کر تیار ہو جائے تو صفائے قلب کی صافی میں چھان لینا اور شیریں زبانی کی شکر ملا کر محبت کی تیز آنچ دینا، جس وقت تیار ہو کر اُترے تو اِس کو خوفِ خدا کی ہوا سے ٹھنڈا کر کے استعمال کرنا۔

(بحوالہ: روشنی کا سفر، ص27)

صوفیوں کی الگ الگ پہچان قائم ہونے اور عوام میں مقبولیت کے ساتھ ساتھ روایت پرست مسلمان حاکموں کی بدگمانیوں میں بھی اضافے ہوتے گئے جس کے سبب نوبت یہاں تک پہنچی کہ حاکمِ وقت بزرگانِ دین کی سرکوبی کرنے لگے۔کچھ نے تو یہ بھی کہا کہ کیونکہ قرآن اور احادیث میں تصوف کا ذکر نہیں ملتا اس لیے تصوف غیر اسلامی تحریک ہے۔اس بے بنیاد مخالفت کا جواب مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنی کتاب 'تصوفِ اسلام' سے یوں دیا ہے:

صوفیا انبیا کے جانشین ہوتے ہیں، یہ انواع عبادات، حقائقِ طاعات، اور اخلاقِ جمیلہ سے جن درجات عالیہ اور منازلِ رفیعہ کو طے کرنے لگتے ہیں وہاں تک علمائے ظاہری اور فقہا اور اصحابِ حدیث کی رسائی بھی نہیں ہو سکتی۔(تصوف اسلام، ص27)

اسی طرح تصوف کی راہوں میں اندھی تقلید بھی رکاوٹ بن کر سامنے آتی رہی ہے بقول شمسی تہرانی:

جن مصنفین نے وِرد و وظائف اور کشف و کرامت کو مرکزی اور بنیادی حیثیت دی انھوں نے تصوف کی حقیقت کو سمجھنے اور سمجھانے میں رکاوٹیں پیدا کی ہیں۔

(تاریخ خواجۂ خواجگان ص58)

صوفی ازم سے متعلق شریعت، حقیقت، معرفت اور طریقت کے موضوع پر بھی بڑی بحثیں ہوتی رہی ہیں اور اسلامی علمائے ظاہر، صوفیوں کے جذب و کیف کو اپنا نشانہ بناتے رہے ہیں نیز شریعت سے صوفیا کرام کے انحراف کو نمایاں کرنے کی کوششیں کرتے رہے ہیں جبکہ بقول پروفیسر اختر الواسع:

تمام بڑے صوفی بزرگوں نے ہمیشہ شریعت سے گہری وابستگی کا اظہار کیا ہے۔ اس سلسلے میں چراغ دہلوی فرماتے ہیں کہ اگر کوئی مقام حقیقت سے گرے گا تو طریقت میں رہے گا، طریقت سے ساقط ہوگا تو شریعت میں رہے گا لیکن اگر شریعت سے بھی پاؤں پھسلا تو اس کا ٹھکانا کہاں ہے۔

(صوفیانہ ادبی روایت: ص 20)

بہر حال گیارہویں صدی عیسوی میں مسلم سماج سے صوفیوں کے لیے نفرت کے جذبے کو حضرت ابو غزالیؒ (1058-1111) نے اپنی مدلل تفسیروں کے ساتھ پیش کر کے تصوف کو اسلام کا جز قرار دیا۔ انھوں نے اپنے مسلک کو ایسے فلسفے کے طور پر پیش کیا جو کسی بھی قرآنی احکام کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ گیارہویں، بارہویں اور تیرہویں صدی میں تصوف کو چار ایسے تاریخ ساز مفسر اور دانشور ملے، جنھوں نے علمی، فکری اور فلسفیانہ دلیلوں سے اپنے مسلکِ تصوف کو عروج بخشا۔ یہ بزرگ تھے سید علی ہجویریؒ، سنائی، عطارؒ اور رومیؒ۔ جنھوں نے علم مشاہدہ پر زور دے کر تصوف کو فلسفۂ فنا سے ہم رشتہ کرتے ہوئے حال اور وجد کو نئے اندازِ فکر میں پیش کیا۔

ساتویں صدی عیسوی سے تیرہویں صدی عیسوی کے دوران وسط ایشیا کے الگ الگ علاقوں سے ہندوستان میں جو صوفیا کرام آئے انھوں نے اپنی شناخت یا تو اپنے مرشدوں سے کرائی یا اپنے اپنے علاقوں سے۔ لیکن سب ہی سلسلوں کے بزرگوں میں چند باتیں قدرِ مشترک رہیں۔ ایک تو یہ کہ ہر سلسلے کے بزرگ نے حضرت علی سے خود کی وابستگی کا اعلان کرتے ہوئے فخر محسوس کیا۔ دوسرے یہ کہ کشف و کرامات، روحانی تصرف، نظریۂ وحدت، درویشانی نکات، مجاہدات و عبادات، ترکِ لذات، مراقبات، حکماتِ طیبات، علمی معلومات اور سماجی و مذہبی خدمات تقریباً سب کی ایک سی رہیں۔ تصوف کے یہ وہ بنیادی اصول ہیں جنھوں نے ہندوستانی عوام الناس میں ذہنی انقلاب پیدا کر دیا۔

وسط ایشیا کے مختلف خطوں سے غیر منقسم ہندوستان میں جو صوفیا کرام تصورِ وحدانیت کو لے کر آئے ان میں پہلا نام حضرت شہباز قلندرؒ (وفات 756) کا ہے جنھوں نے نویں صدی عیسوی میں حیدر آباد سندھ (پاکستان) کے سیون شہر کو اپنا مسکن بنایا۔ ان کے بعد تخلیق و تصنیف کے حوالے سے پہلا نام سید علی ہجویریؒ (وفات 1010) کا ہے جو داتا صاحب کے لقب سے لاہور میں مشہور ہیں۔ آپ نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب 'کشف المحجوب' سے پہلی بار ہندوستانیوں کو تصوف سے متعارف کرایا۔ ہندوستان میں شروع ہی سے صوفیوں کے چار سلسلوں کو اہم ترین خیال کیا گیا ہے جو مندرجہ ذیل ہیں:

نقشبندیہ سلسلہ: چودھویں صدی عیسوی کے خواجہ بہاء الدین نقشبند (1318-1389) نقشبندیہ سلسلۂ تصوف کے بانی تھے جنھوں نے درویشی کے لیے گیارہ اصول وضع کیے۔ یعنی ہوش در دم، نظر بر قدم، سفر در بطن، یادِ الٰہی بازگشتِ خدا، نگاہ داشتِ خود، یادداشت، تجزیۂ قول و فعل، بے شمار ورد اور پاکیزگیِ قلب۔ ہندوستان میں مغلوں کے دورِ حکومت میں اس سلسلے کے بزرگوں نے خاص شہرت حاصل کی۔ بادشاہ بابر، خواجہ احرارؒ سے بہت عقیدت رکھتا تھا۔ صوفی فقیر علوی حسینیؒ نقشبندی نے اکبر سے کشمیر میں اپنا لوہا منوایا۔ بزرگ خواجہ باقی اللہ (1546-1603) نے پنجاب سے اس سلسلے کو شہرت بخشی ان کے ہی شاگرد شیخ احمد سرہندیؒ (1564-1624)، مجدد الف ثانی نے صوفیوں کے لیے توبہ، زہد، توکل، قناعت، عزلت اور صبر کے چھ اصول بھی بنائے۔ احکامِ اسلامی کی پابندی کو لے کر ان کا رویہ صوفیانہ کم زاہدانہ زیادہ تھا یہی سبب تھا کہ انھوں نے بادشاہ وقت اکبر کے دین الٰہی کی مخالفت کرتے ہوئے سلطنت سے دشمنی بھی مول لی اور قید و بند کی صعوبتیں بھی اٹھائیں۔ اس سلسلے کے درویش وحدت الوجود سے زیادہ وحدت الشہود میں یقین رکھتے ہیں۔

نیک اور بد دونوں طرح کے اعمال، ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں۔ ایک ٹہنی پر بدی کے کڑوے پھل لگتے ہیں اور دوسری پر نیکی کے میٹھے پھل۔ کڑوے پھلوں کے لگنے سے اس پیڑ کو کاٹ کر پھینکا نہیں جاسکتا کیونکہ میٹھے پھل بھی اسی کی شاخ پر لگتے ہیں۔ لہٰذا بہتر یہ ہوگا کہ ہم اس شاخ کے سائے میں رہیں جس پر نیکی کے میٹھے پھل لگے۔

قادریہ سلسلہ: اس سلسلے کی داغ بیل شیخ عبدالقادر جیلانیؒ (ولادت 1077) نے ڈالی تھی جو جیلان بغداد کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے اپنا شجرۂ نسب حضرت علی سے ثابت کیا ہے اسی لیے انھیں 'پیرِ دستگیر' اور 'غوث الاعظم' کے القاب سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ آپ کی دو کتابیں 'الفتح الربانی' اور 'فتوح الغیب' بہت مشہور ہیں۔ آپ کے پیغامِ تصوف کو آپ ہی کے ایک خطبے سے پرکھا جا سکتا ہے، فرماتے ہیں:

نیک اور بد دونوں طرح کے اعمال، ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں۔ ایک ٹہنی پر بدی کے کڑوے پھل لگتے ہیں اور دوسری پر نیکی کے میٹھے پھل۔ کڑوے پھلوں کے لگنے سے اس پیڑ کو کاٹ کر پھینکا نہیں جاسکتا کیونکہ میٹھے پھل بھی اسی کی شاخ پر لگتے ہیں۔ لہٰذا بہتر یہ ہوگا کہ ہم اس شاخ کے سائے میں رہیں جس پر نیکی کے میٹھے پھل لگے۔

(تصوف: تاریخ و فلسفہ صفحہ 35)

ہندوستان میں یہ سلسلہ غوث بندگیؒ، شاہ قمیصؒ، عبدالقدوس گنگوہیؒ اور سائیں میاں میر محمدؒ کے ذریعے سولھویں صدی سے مقبول ہوا۔ سائیں میاں میرؒ وہ بزرگ تھے جن سے سکھوں کے پانچویں گورو شری ارجن دیو صاحب نے امرتسر میں گولڈن ٹیمپل کی بنیاد رکھوائی تھی۔ پنجاب کے مشہور صوفی، سلطان باہوؒ اور شاہ حسینؒ اور اعلیٰ حضرت احمد رضاؒ (بریلی) بھی قادری سلسلے ہی سے وابستہ تھے جو اپنے اپنے زمانے کے عظیم شاعر بھی تھے۔ ہندو پاک کے مسلمانوں میں بریلوی مسلک، جو خود کو رضوی لکھتا ہے، حضرت احمد رضاؒ بریلوی سے ہی مربوط ہے۔ مہاراشٹر میں اورنگ آباد کے احمد شاہ گجراتیؒ، بابا تاج الدین ناگوریؒ، بابا عبداللہ شاہ ناگوریؒ، بہار کے حضرت امام محمد تاج منگیریؒ، مخدوم شرف نہریؒ نالندہ، مخدوم عبداللہ بیابانیؒ چین پور، خانقاہ شیخ تیغ مظفر پور، خانقاہ شیخ مجیب قادریہ پھلواری شریف، یوپی میں شاہ عبداللہؒ حاجی بابا حمیدؒ، خلیفہ حافظ جونپور، گجرات احمد آباد میں شاہ اویسؒ کے علاوہ حضرت شاہ عالم، المعروف شاہ سہاگؒ، بہت مشہور ہیں۔

سہروردیہ سلسلہ: شیخ شہاب الدین سہروردی

(1234-1145)اس سلسلے کے موجد تسلیم کیے گئے ہیں جو عبدالقادر جیلانی کے شاگرد تھے۔آپ کی مشہور تصنیف 'عوارف المعارف' تصوف کی موضوع پر مستند مانی جاتی ہے۔ اپنی اس کتاب سے آپ نے تصوف کو اسلام کے عین موافق ثابت کیا ہے۔ آپ نے خانقاہی نظامِ تصوف کو مستحکم صورت دی نیز خانقاہوں میں رہنے والوں کو بے گھر درویشوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور مہمان نوازی سے پیش آنے کی تلقین کی۔ اسی سلسلے کے بزرگوں نے صوفی آستانوں پر لنگر کی روایت بھی شروع کی جسے دوسرے سلسلے والوں نے بھی پسند کیا۔

ہندوستان میں سہروردیہ سلسلے کے پہلے علم بردار، ملتان کے شیخ بہاء الدین ذکریہؒ تھے۔سہروردیوں نے اپنے اپنے زمانے کے حاکمِ وقت سے بھی رابطے رکھے اور شاہی خاندانوں پر اپنی روحانیت کی دھاک بھی قائم رکھی۔ التمش اور فیروز شاہ تغلق جیسے بادشاہوں کے زمانے میں سہروردی بزرگوں نے حکومتوں سے کافی عزت حاصل کی۔ اس سلسلے کے اہم درویشوں میں سید جلال الدین بخاریؒ، جہانیاں جہاں گشتؒ (اُچ ملتان)، سید برہان الدین قطبِ عالمؒ (گجرات)، سید حسن لالوؒ (کشمیر) اور پیر حاجی علی شاہ بخاریؒ (ممبئی) شہاب الدین سہروردی بنگال، جلال الدین تبریزی گنگوہی، سہارنپور اور حضرت شیخ صدرالدین المعروف حیدر شیخ مالیر کوٹلہ کے نام اہم ہیں۔

چشتیہ سلسلہ: ہندوستان میں صوفیوں کا یہ سلسلہ سب سے زیادہ مقبول ہے۔اس سلسلے کی داغ بیل حضرت سید ابواحمد ابدال چشتیؒ (874-956) نے افغانستان کے چشت شہر سے ڈالی تھی۔ لیکن اسے بارہویں صدی میں عروج ملا خواجۂ خواجگان غریب نواز حضرت سید معین الدین چشتی اجمیری (1142-1236) سے۔ آپ حضرت علی کی بیسویں پشت میں سے ہیں۔ آپ کے تصوف کی بنیاد آپ ہی کا یہ قول ہے:

تین خصلتیں جس میں ہوں وہ اللہ کا ولی ہے۔ اول دریا کی سی سخاوت، دوسرے آفتاب کی سی شفقت، تیسرے زمین کی سی خاکساری اور تواضع

(ترجمہ سیر الاولیا صفحہ 43)

خواجہ غریب نوازؒ ہندوستان کے امیر الطریق کا درجہ رکھتے ہیں۔ آپ کی درویشی سے ہمارے ملک میں علومِ معرفت کا آغاز ہوا۔ ہندوستان میں آپ کے حسنِ سلوک سے نوے لاکھ لوگ حلقۂ اسلام میں شامل ہوئے۔ آپ نے درویشی کے لیے جو نو اصول مرتب کیے وہ یہ ہیں: جمع خوری نہ کرو، قرض لینے سے بچو، بھکاری نہ بنو، اضافی چیزوں کو دوسروں میں تقسیم کردو، برا نہ چاہو، نیکی کا صلہ نہ چاہو، بداعمال کو نیک اعمال کی طرف لاؤ، دن فاقے میں رات عبادت میں گزارو، بے ضرورت مت بولو۔ آپ کی عظمتوں کا لامتناہی سلسلہ ہے۔ سید سلیمان ندوی اپنی کتاب نقوشِ سلیمانی میں لکھتے ہیں:

اگر یہ کہنا صحیح ہے کہ ہندوستان کو غزنی اور غوری بادشاہوں نے فتح کیا تو اس سے زیادہ یہ کہنا درست ہے کہ ہندوستان کی روح کو خانوادۂ چشت کے روحانی سلاطین نے فتح کیا ہے۔ (نقوشِ سلیمانی ص26)

مختصر لفظوں میں کہا جائے تو چشتیہ سلسلۂ تصوف، برِصغیر ہند و پاک کی روحانی دھڑکن اور پاکیزگی کی علامت ہے۔ خواجہ غریب نوازؒ کے علاوہ ان کے دو اہم شاگرد قطب الاقطاب خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ اور شیخ حمید الدین ناگوریؒ نے تصوف کے چراغ کو جو ابدیت بخشی اس کے بارے میں صدیوں سے لکھا جاتا رہا ہے۔ کاکیؒ صاحب کے شاگرد حضرت فریدالدین گنج شکرؒ صرف ایک درویش ہی نہیں پنجاب اور پنجابیت کی روح ہیں۔ آپ پنجابی زبان و ادب کے پہلے شاعر ہونے کے ساتھ اپنے روحانی اور متصوفانہ کلام کے سبب سکھوں میں گورو کے برابر کا درجہ رکھتے ہیں آپ کا بیشتر کلام مقدس 'گورو گرنتھ صاحب' میں شامل ہے۔ بابا فریدؒ کے روحانی وارث محبوبِ الٰہی حضرت نظام الدینؒ اولیا، حضرت جمال ہانسویؒ اور حضرت علاء الدین صابر کلیری نے مادیت کی دھوپ میں عوام کے لیے جو روحانی ٹھنڈک مہیا کی اسے آج بھی بلاتفریقِ مذہب و ملت محسوس کیا جارہا ہے۔ اسی سلسلے کے معروف بزرگ حضرت یوسف الحسنی ہیں جو خواجہ بندہ نواز گیسودرازؒ (کرناٹک) کے نام سے مشہور ہیں۔ قابلِ ذکر ہے کہ اردو ادب میں خواجہ بندہ نواز کو اردو نثر کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ کرناٹک میں خواجہ بندہ نواز گیسودراز کے نام سے جو تعلیمی ادارے ہیں وہ ملک و قوم کے لیے باعث فخر سمجھے جاتے ہیں۔ خواجہ صاحب کے علاوہ دہلی میں شیخ بدرالدین اور ہانسی ہریانہ میں بابا فرید کے اہم شاگرد حضرت جمال ہانسوی، بھی صاحبِ کرامت بزرگ ہیں۔ چشتیہ سلسلہ ہی ہے جس کی اور دوسری شاخیں بھی مقبول اور مشہور ہیں جیسے حضرت نظام الدینؒ اولیا سے 'نظامی'، بابا فریدؒ سے 'فریدی' اور حضرت علاء الدین صابرؒ سے صابری، ان کے علاوہ حضرت بہاء الدین المعروف بابا فریدیؒ رجب پور امروہہ، مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی کچھوچھوی فیض آباد، حاجی سیّد وارث علی شاہ دیوا شریف بارہ بنکی، حضرت حافظ شاہ جمال اللہؒ رام پوری، مخدوم عبدالحق ردولوی، آگرہ میں شیخ سلیم چشتیؒ جن کے دربار سے مغلِ اعظم بادشاہ اکبر کو سلیم عطا ہوا تھا۔ بہار میں ابوسالک چشتیؒ سہس رام، ودیانگر میں عبدالقادر چشتیؒ، مہاراشٹر میں نورالدین چشتیؒ اورنگ آبادی اور برہان پور میں علاء الدین چشتیؒ وغیرہ ایسے بزرگ ہیں جن کے آستانے فیوض و برکات کے روحانی مراکز ہیں۔ آخرالذکر بزرگ کا آستانہ محرم کے ابتدائی عشرے میں ہی پوری طرح کھولا جاتا ہے اور عزاداری کی رسومات ادا ہوتی ہیں۔

آندھرا پردیش کے حیدرآباد کے دکن میں سیّد معین الدین حسینیؒ المعروف قطب شاہ خاموش کا آستانہ مرکزی صوفی آستانہ ہے جہاں بابا فریدؒ کی درگاہ پاک پٹن کی ایک چوکھٹ جذبۂ عقیدت کے ساتھ پاک پٹن سے حیدرآباد پیدل لے جاکر لگائی گئی تھی۔ اسی طرح مدھ پردیش کے گوالیار میں حضرت خانون چشتیؒ اور کشمیر میں درگاہ حضرت شیخ العالمؒ المعروف نُند رشی، حضرت حبہ خاتون، للہہ دے یدسرینگر کی مقبولیت بھی عالم گیر ہے۔

محبوبِ الٰہی کے چہیتے شاگرد حضرت امیر خسروؒ، تو وہ درویش بادشاہ ہیں جنھوں نے ہندوستان کے گنگا جمنی تمدن کو اپنی درویشی، فقیری، شاعری اور قدرتِ فن سے ایک نئی سمت و رفتار دے دی۔ امیر خسروؒ ہی ہیں جو ہماری ہندوی تہذیب کے معمار ہیں۔ خسرو نے ہی ہمیں ہندی اور ہندوی سے اس طرح واقف کرایا:

زحالِ مسکیں مکُن تغافل دو رائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں نہ دارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبانِ ہجراں دراز چوں زلف، و روزِ وصلت چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

خسرو برصغیر ہند و پاک کے رنگوں کے عاشق تھے اس کا اظہار انھوں نے یوں کیا ہے:

ہند میں حُسن کے تین رنگ ہیں: سیاہ، سبز اور گندمی۔ گندمی رنگت پر دل کا لپکنا فطری بات ہے کیونکہ فتنۂ گندم کے بانی آدم ہیں۔ ایک نمکین گیہوں منہ میں جا کر سیکڑوں پھیکی و سیٹھی ٹکیوں سے بہتر ہوتا ہے۔ سیاہ رنگ کو آنکھ میں جگہ ملی جس کی پتلی سیاہ ہے پھر بھی سیاہ سرمے کو چاہتی ہے۔ سفید رنگ عارضی اور بے فائدہ ہے۔ ان سب سے بہتر سبز اور نیلا رنگ ہے کیونکہ جس تخت یعنی آسمان سے تاروں کی زینت ہے وہ بھی نیلا ہے۔ ان رنگوں میں رحمتیں گوندھ دی گئی ہیں۔

ہندوستان میں مذکورہ چار اہم صوفی سلسلوں کے علاوہ کچھ دوسرے صوفی سلسلے بھی ہیں جن میں ایک مولائی سلسلہ ہے۔ اس سلسلے میں خلیفہ یا جانشینی کا تصور نہیں ہے۔ مولائی تصوف میں حضرت سیّد مشہد علیؒ ہندوستان کے ایسے بزرگ ہیں جو خاندانِ رسالت کے جانشین رہے۔

آپ آٹھویں امام حضرت علی رضا کے چھوٹے صاحب زادے تھے جو نویں صدی عیسوی میں ہندوستان آئے۔ آپ کا آستانہ سامانہ پٹیالہ میں مرکزِ عقیدت ہے۔ اسی طرح مولائی سلسلے کے اہم بزرگ مخدوم سیّد حسین شرف الدین شاہ ولایتؒ ہیں جن کا آستانہ امروہہ اتر پردیش میں ہے۔ مولائی سلسلے کے بزرگوں نے پیری مریدی کو روا نہیں رکھا۔ اسی طرح قلندری، رومی ،مدنی ، مداری اور شہیدی سلسلے بھی موجود ہیں ۔رومی صوفی اپنا تعلق مولانا جلال الدین رومی سے وابستہ کرتے ہیں۔ مداری صوفی حضرت بہاؤالدین شاہ مدار سے وابستہ ہیں۔ حضرت شاہ مدار کا مزار کانپور اتر پردیش میں ہے۔ یہ درویش سیاہ پگڑی پہنتے ہیں۔ شہیدی صوفی سلسلے کا تعلق بھی ہندوستان سے ہے۔ اس سلسلے کے بزرگ غازی میاں کا مزار بہرائچ میں ہے۔ بادشاہ سلطان محمد تغلق غازی میاں کے عقیدت مندوں میں سے تھا۔ پنجاب میں شہزادہ پیر، شہیدی صوفی بزرگ تھے جن کا مزار روپڑ میں ہے۔ اسی سلسلے کے درویشوں میں سونی پت کے ماموں بھانجا اور بٹھنڈا کے حاجی رتن کافی مقبول ہیں۔ ہندوستان میں قلندری سلسلے کے بہت سے بزرگ ملک گیر شہرت کے حامل ہیں۔

قلندری سلسلہ: اس سلسلے کا آغاز سیریا کے دمشق شہر سے 1213 میں ہوا جس کے موجد صوفی درویش شیخ یوسف تھے۔ اس سلسلے میں انکسار، انکارِ انا، جذبۂ ایثار، عشقِ الٰہی کی مستی اور دنیاوی لذتوں سے پرہیز کرنا بنیادی شناخت ہے۔ اس سلسلے کے بزرگ کانوں میں بالیاں اور مُندرے بھی پہنتے ہیں۔ پنجاب کے راستے سے قلندری درویش دلّی اور بنگال میں پھیلے۔ سیّد نجم الدین اور خضر رومی قلندری سلسلے کے ابتدائی ہندوستانی بزرگ ہیں۔ اس سلسلے کے سب سے اہم ہندوستانی بزرگ حضرت شیخ شرف الدینؒ ہیں جو بوعلی قلندر (1209-1329) کے نام سے مشہور ہوئے۔ آپ کی خانقاہ پانی پت میں ہے۔ بوعلی شاہ قلندر اپنے زمانے کے نامور فارسی شاعر بھی تھے۔

ہندوستان کی قدیم 'ادویت واد' کی روایت کو صوفیوں کے وحدانی تصور نے ہی جِلا بخشی 'ادویت واد' کے مطابق حقیقتِ مطلق صرف خدا کی ذات ہے اور یہ کائنات اسی کا مظہر ہے۔ ادویت میں کہا گیا ہے کہ یہ دنیا فریبِ نظر ہے، مایا جال ہے۔ اس موضوع کی وضاحت کرتے ہوئے پروفیسر اختر الواسع نے ایک جگہ لکھا ہے:

صوفیوں اور ادویت وادیوں کے نظریات کی آمیزش سے ہندوستان میں وہ راہِ اعتدال وجود میں آئی جس کے نتیجے میں بھگتی کا سلسلہ پروان چڑھا۔ اس طرح ہندوستان کی مذہبی اور تہذیبی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ ('روشنی کا سفر' ص 124)

متذکرہ سب ہی سلسلوں کے صوفیائے کرام اپنے اپنے زمانے کے ادیب و شاعر بھی رہے ہیں۔ ہندوستان کے تقریباً ہر اہم صوفی آستانے سے ای ٹی وی اردو چینل حیدرآباد نے اپنے سیریل کے ذریعے متعارف کرانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

عوام، اپنی مراد اور فریاد اپنے دل کی آواز کے ساتھ اپنے رب تک پہنچانا چاہتی ہے۔ اس کے لیے عوام نے قوالی اور سماع کو بہتر ذریعۂ اظہار سمجھا اور 'تُرکِ ہندی نژاد' امیر خسروؒ کے بنائے ہوئے راگ صنم میں من کنت مولا بھی گایا اور وصال، دھمال، حال اور لازوال کی روایت سے سماع کی محفلوں میں گا کر یوں رنگ بھی بھرا 'آج رنگ ہے، ری ماں آج رنگ ہے' اسی طرح راگ پلاسی پر یا دھنا میں 'دم مست قلندر۔ مست مست' کی روایت بھی ہندوستانی گیت اور سنگیت کے ساتھ تصوف میں آئی ہے۔ ڈاکٹر محمد جہانگیر تمیمی کے بقول:

شعر اور موسیقی کے آمیختہ سے سُریلی اور مدھر آواز حسنِ سماعت کی کائنات ہے، موسیقی ایک پاکیزہ علم ہے، ایک بے نفس آواز کو ہی یہ شرف حاصل ہے کہ وہ الفاظ کا جادو جگا سکے، سُریلی آواز، انسانی گلے کا نور ہے، جو سراسر عطیہ خداوندی ہے۔ موسیقی فی الحقیقت رزق ہے۔ سُر اور سنگیت انسانی جذب و مستی کا اعجاز ہے۔ انسانی گلے کے اس نور کو سستے جذبات اُبھارنے اور نفس پرستی کے لیے کام میں لانا فی الامر حرام ہے۔ علمِ موسیقی یا اس کی ماہیت فی نفسہ حرام نہیں ہے اس حقیقت کا ادراک کیا جانا چاہیے۔ (دین و فقر اور سماع: صفحہ ٹائیٹل بیک)

مذکورہ صوفی سلسلوں میں قادریہ، سہروردیہ اور چشتیہ سلسلے مسلمانوں کے ساتھ ساتھ دوسرے عوام کی بھی زمینی حقیقت کو فراموش نہیں کرتے اور ہندوستانی آرٹ اور کلچر کو ساتھ لے کر چلے ہیں جب کہ نقشبندیہ سلسلہ کیوں کے ابتدا سے ہی زیادہ شریعت پرست رہا اور مسلمانوں کے خاص حلقے سے جڑا رہا اس لیے اس کی عوامی مقبولیت اس طرح نہیں ہے جس طرح قادریہ، سہروردیہ اور چشتیہ سلسلوں کی ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ہر سلسلۂ تصوف کے صوفی نے انسانی بقا اور امنِ عالم قائم کرنے کے لیے علم اور تعلیم کے فروغ پر توجہ دینے کی ضرورت پر زور دیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ صوفیوں کے اس پیغام کو عام کرنے کے لیے ہندوستان میں صوفیوں کے نام سے منسوب بڑے تعلیمی ادارے قائم ہوئے اور ہو بھی رہے ہیں۔ ان اداروں میں خواجہ غریب نواز یونیورسٹی اجمیر، خواجہ معین الدین چشتی لکھنؤ، بابا فرید میڈیکل یونیورسٹی فرید کوٹ، گیسو دراز گُلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ، بابا فرید گروپ آف انسٹی چیوٹ بٹھنڈا، بابا فرید کالج آف ایجوکیشن بٹھنڈا اور حضرت نظام الدین اولیا قطب دکن ایجوکیشن ٹرسٹ حیدرآباد، رومی فاؤنڈیشن انڈیا، صوفی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل، بابا فرید صوفی سینٹر پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ اور جہانِ خسرو دہلی وغیرہ اداروں پر ہمیں ناز ہے۔

بہر حال صوفیا کرام نے ہم جنوبی ایشیا کے لوگوں کو آپسی رواداری کے ساتھ رہنے سہنے کا انداز، ہماری اخلاص پروری، ہماری زبان، ہمارا ادب، ہمارے محاورے، ہمارے میلے ٹھیلے، ہمارے فنونِ لطیفہ یعنی جملہ طرزِ زندگی کو بنایا اور سجایا ہے۔ ان کا طرزِ ادا ساز اور آواز ہے، لحن اور ذہن ہے، سماع ہے جو آج ہمارے قومی فن کی آبرو ہے۔ ہمیں اپنے صوفیا کرام، ان کے پیغامِ امنِ عام اور ان کے دیے ہوئے گنگا جمنی کلچر کے اہتمام اور نظام پر ناز ہے جو ہماری آن، بان، شان اور پہچان ہے۔ ■

Mr. Nashir Naqvi, Prof. & Director, Baba Farid Sufi Center, Punjabi University, Patiala Pnjbab

اردو شاعری اور فلسفۂ تصوف

زرنگار

تعارف:

ابتدا میں تصوف کا تعلق محض حال یعنی ایک وجدانی کیفیت سے تھا لیکن جب تمام علوم وفنون اور فلسفے ترقی کے مدارج طے کر کے متعین شکل اختیار کرنے لگے تو اضطراری طور پر تصوف کو بھی حال اور قال دونوں میں مدغم ہونا پڑا۔ یہ مسلک جوں ہی حال وقال کی امتزاجی شکل میں سامنے آیا تو مباحثوں کے احاطے اور اسلامی وغیر اسلامی کے دائرہ میں متنازعہ فیہ امر بن گیا۔ کچھ اوراق تاریخ نے بھی دلائل دیے کہ ابتدا میں یہ مسلک سنجیدگی، تہذیب نفس، گوشہ نشینی اور اللہ کی طرف محویت کا نام تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ ایک فلسفہ یا مختلف تہذیبوں مثلاً اسلامی اعتقاد ات، یونانی اوہام، ایرانی تخیلات، عیسائی رہبانیت اور ہندی مٹھ ومراسم کا ایک معجون مرکب بن گیا ہے۔

بنظر غائر دیکھیں تو اہل تصوف یا بالفاظ دیگر صوفیائے کرام کے اکثر وبیشتر مشاغل واعتقادات خالص اسلامی تھے لیکن چونکہ ان کو متعین اور شعوری طور پر قرآن وحدیث سے اخذ نہیں کیا گیا تھا، اس لیے یہ نظریہ اب بطور کلی قابل قبول نہیں رہا۔

بہر حال علما زمانہ قدیم سے دور حاضر تک تصوف کے اسلامی وغیر اسلامی ہونے کے لامتناہی مباحثوں میں الجھے ہوئے ہیں۔ اہل طریقت ہمیشہ شریعت کے اصولوں اور اہل شریعت اکثر طریقت کی موشگافیوں کے مابین نقلی وعقلی دلائل کی جستجو اور راہ اعتدال کی تلاش میں گامزن رہتے ہیں نتیجتاً مباحثوں کا اختتام اکثر مولانا ابوالمجاہد زاہد صاحب کے اس شعر کا مصداق ہوتا ہے:

تصوف اس جگہ سے غیر اسلامی تصوف ہے
جہاں سے ساتھ چھوڑا ہے طریقت نے شریعت کا

لیکن ان مباحثوں سے قطع نظر اگر ہم تصوف کے اثرات عوام پر اور خاص طور پر ہندوستانی معاشرے پر دیکھیں تو وہ نقوش بلا مبالغہ ومجادلہ بڑے ہی بنیادی اور کبھی نہ مٹنے والے ہیں۔ ہندوستان میں اسلام کی اشاعت وترویج کا سہرا انھیں صوفیائے کرام کے سر جاتا ہے جو ابتدا میں ہندوستان آئے اور اپنے اخلاق وکردار سے لوگوں کو اپنا فریفتہ بنا لینے میں کامیاب ہوئے۔

تصوف اور اردو شاعری

تصوف کی یہ عطر بیز نسیم سبک گام جب اسلامی دنیا کے اہم مراکز مثلاً عرب، عراق، شام، مصر اور بالخصوص ایران سے ہوتی ہوئی ہندوستان تک پہونچی تو خوشنوایان ہند اس کی خوشبو اور آہنگ کی سحر انگیزی سے مدمست ومدہوش ہونے لگے۔ ایران کی طرح ہندوستان کی فضا بھی تصوف کے لیے موافق ہوئی۔ بے شمار شعرا اس مسلک کے گرویدہ ہو گئے اور موضوع سخن بنا لیا۔

چنانچہ تصوف یقینی طور پر ''برائے شعر گفتن خوب است'' ثابت ہوا۔ فارسی کی طرح اردو شاعری نے بھی تصوف کو اپنے دامن میں جگہ دی۔ سب سے پہلے امیر خسرو بعد ازاں غالب اور اقبال نے بھی موضوع تصوف پر اپنے افکار کے جوہر بکھیرے اور اہل سخن حضرات کی مہربانی سے تصوف حجروں اور خانقاہوں سے نکل کر عوام کے دل تک پہونچ گیا اور زبان زد ہونے لگا۔

تصوف اور سخنوری کا رشتہ ورابطہ ہر زمان ومکاں میں بڑا مضبوط ومستحکم رہا جس کی وجہ یہ ہے کہ تصوف کا منبع و سرچشمہ دل اور حال ہے۔ مدارج السالکین میں علامہ حافظ ابن قیمؒ خود لکھتے ہیں کہ اس علم کا قلب سے بہت گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اس کی تمام سرگرمیاں قلب ہی سے تعلق رکھتی ہیں اس لیے اس کو علم باطن یا علم سینہ کہتے ہیں۔

شعر وادب تو اسی دل کا ترجمان اور حال کی زبان ہے۔ چنانچہ تاریخ کی ورق گردانی بتاتی ہے کہ اکثر صوفیائے کرام یا تو خود شعر گو اور سخنور تھے یا وہ سخن پرور اور اساتذۂ اہل سخن تھے۔ اسلام کی پہلی صوفی خاتون رابعہ بصریؒ خود زبان وبیان

پر قادر اور شعر گوئی میں مہارت رکھتی تھیں آپ کا کلام معرفتِ خداوندی اور خالصتاً حب الٰہی کا سر چشمہ ہے۔

مولانا روم، جامی، حافظ اور سعدی جیسی بلند پایہ ہستیاں محض اپنی شعر گوئی کے سبب چہار عالم میں نامور و نیک نام نہیں ہوئی تھیں بلکہ ان کے کلام میں صوفیانہ افکار و رجحانات نے انھیں اپنے اپنے دور کا Legend بنا دیا تھا علامہ شبلی کے مطابق تو " فارسی شاعری اس وقت تک قالب بے جان تھی جب تک اس میں تصوف کا عنصر شامل نہیں ہوا تھا۔" (1)

چنانچہ ایران کی روح اور دماغ کو اپنی گرفت میں لینے کے بعد صوفیانہ خیالات وجذبات سے مملو اور معطر یہ فضا ہندوستان کی وادیوں میں سرگرم عمل ہوگئی۔ سلسلہ تصوف کے ذیل میں مولانا علی میاںؒ رقمطراز ہیں: "ہندوستان کی فتح سے پہلے اسلام کے چاروں مشہور روحانی سلسلہ قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ، اور سہروردیہ وجود میں آچکے تھے۔ اپنے اپنے وقت پران میں سے ہر ایک کا فیض ہندوستان کو پہونچا اور ہندوستان کی اسلامی تعمیر وتشکیل میں سب کا حصہ ہے...... لیکن ہندوستان کی روحانی فتح اور سرزمین پر اسلام کا پودا نصب کرنے کے لیے حکمت الٰہی نے چشتی سلسلے کا انتخاب کیا۔"(2)

مذکورہ سلسلہ تصوف سے وابستہ تمام افراد و پیشوا نہ صرف صوفیا تھے بلکہ سوائے معدودے چند تقریباً تمام ہی اساتذہ سخن بھی تھے خواہ وہ اصحاب مکاتیب ہوں یا اصحاب کلام ہوں۔

ہندوستان کے یہ روحانی فاتحین یعنی خواجگان چشت بنفس نفیس بڑے زبان داں اور زباں شناس ثابت ہوئے تھے۔ حضرت نظام الدین اولیاء کی ہی نظر کرم کا ثمرہ تھا کہ ہمیں اپنے ہندوستان کی کئی زبانیں بنام ہندوی شان خسروی کے ساتھ بڑی نمایاں وممتاز نظر آتی ہیں۔ ہندوستان کی صوفیانہ شاعری میں امیر خسرو کا تذکرہ اتنا ہی لازم وملزوم ہے کہ جتنا فارسی زبان وادب میں مولانا روم اور شیخ سعدیؒ کا۔

امیر خسرو کا صوفی کلام:

امیر خسرو کو تصوف کا سرچشمہ انھیں خواجگان چشت

سلسلہ تصوف کے ذیل میں مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ رقمطراز ہیں: "ہندوستان کی فتح سے پہلے اسلام کے چاروں مشہور روحانی سلسلہ قادریہ، چشتیہ، نقشبندیہ، اور سہروردیہ وجود میں آچکے تھے۔ اپنے اپنے وقت پران میں سے ہر ایک کا فیض ہندوستان کو پهونچا اور ہندوستان کی اسلامی تعمیر وتشکیل میں سب کا حصہ ہے... لیکن ہندوستان کی روحانی فتح اور سرزمین پراسلام کا پودا نصب کرنے کے لیے حکمت الٰہی نے چشتی سلسلے کا انتخاب کیا۔

کے عظیم بزرگ حضرت نظام الدین اولیاء چشتیؒ کی چوکھٹ پر ملا تھا۔ ان کی شاعری نے عشق حقیقی کے سوز وگداز کو اسی مقام پر جانا تھا اور ان کے کلام پر عارفانہ رنگ انھیں کی نگاہ التفات اور توجہ قلبی سے چڑھا تھا۔ عالم اسلام کے مایہ ناز مؤلف علی میاںؒ امیر خسروؒ اور نظام الدینؒ کے قلبی تعلق کا ذکر اس طرح کرتے ہیں: "امیر خسرو کو حضرت خواجہ سے جو والہانہ وعاشقانہ تعلق تھا وہ ان کے سوانح اور دیوان سے معلوم ہوتا ہے بلبل کو گل سے اور پروانے کو شمع سے جو تعلق ہوتا ہے اسی طرح کا تعلق امیر خسرو کو اپنے مرشد سے تھا حضرت خواجہ کو بھی اس عاشق صادق سے ایسا تعلق تھا کہ فرماتے تھے:

من از ہمہ تنگ آیم واز تو تنگ نیایم

"مجھے بعض اوقات ہر ایک سے وحشت ہونے لگتی ہے
لیکن اس حالت میں بھی تم سے ہرگز نہیں ہوتی" (3)

امیر خسرو کی شاعری محض شاعری نہیں بلکہ ایک اعجاز ہے۔ ان کے عارفانہ کلام کا بنظر غائر مطالعہ کرنے سے ہر صاحب عقل اور اہل نظر یہی نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ یہ موضوعات تو اس سے قبل بھی شعرا اکابر اپنے اپنے کلام میں پیش کر چکے تھے لیکن بیان کا یہ پہلو خسرو کا ہی منتظر تھا۔ ان کے کلام میں سوز عشق کا عنصر سب سے نمایاں تھا اور اس عشق کا مظہر عشق الٰہی، عشق رسول، عشق مرشد اور عشق کائنات ہوتا۔ ان کی پاکیزہ زندگی عشق مجازی سے بالکل پاک رہی۔ وہ عشق حقیقی کے دلدادہ تھے اسی لیے جب کلام میں اس کا اظہار کرتے تو اس میں عارفانہ کیفیت اور سوز وگداز پیدا ہو جاتا۔

امیر خسرو کے اشعار میں بھی دیگر صوفی شعرا کی طرح وحدت الوجود کا عنصر موجود تھا۔ مگر ان کے افکار و نظریات میں فلسفیانہ غلو اور رموز شامل نہیں تھے۔ فکر سادہ اسلامی لیکن بیان خسروی تھا جو ذہن کو خیرہ اور دل کو منور کر دیتا تھا۔

امیر خسرو کے کلام کا ہم یہاں صرف فارسی نمونہ ہی پیش کر سکتے ہیں کہ ان کا ہندوی کلام سوائے معدودے اور بالخصوص ہندوی صوفیانہ کلام بطور کل نایاب ہے:

قطرۂ آب کہ تن مردم است
در دل آں قطرہ جہانے گم است (4)

یہ بڑی سچائی ہے جو خسرو بیان کر رہے ہیں آدم کے دل میں ایک مکمل جہاں پوشیدہ ہے جس نے عارف کو وہ نگاہ عطا کی ہے کہ جس سے علم ومعرفت کے چشمہ ابلتے ہیں۔

روحانی شاعری اور عارفانہ تخلیق کا یہ سفر محض خسرو تک ہی محدود نہیں رہا۔ بلکہ زمانہ در زمانہ ہندوستان کی سرزمین سے بہت بڑے بڑے اور نامور شعرا اس سفر میں امیر خسرو کے ہم رکاب ہوئے۔

یہ ترا بیان غالب:

امیر خسرو کے بعد مرزا اسد اللہ خاں غالب محتاج تعارف نہیں۔ تصوف سے متعلق خود بڑی شوخی اور بے باکی سے کہتے ہیں:

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

نتیجتاً بعض لوگوں کو خیال ہوا کہ غالب صوفی منش نہیں تھے

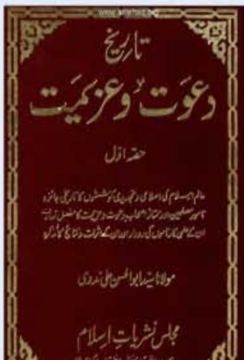

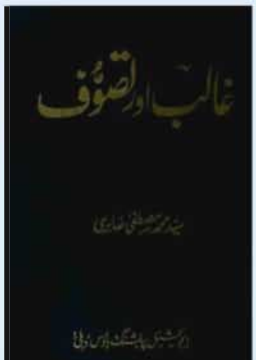

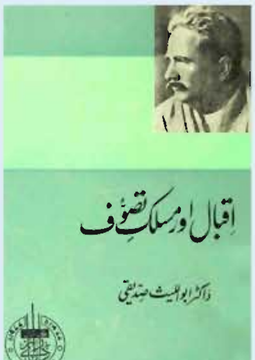

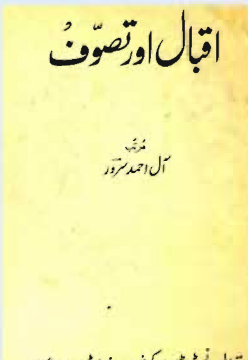

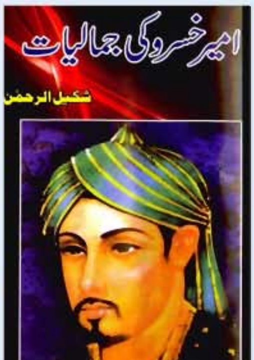

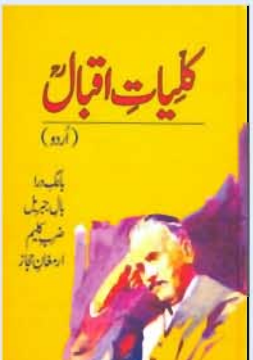

لیکن جس عہد میں ان کی شاعری کا بازار گرم ہوا وہ دور تصوف کے لیے بڑا سازگار تھا اور عوام کی طبیعتیں رنج والم کے انبوہ اور بارگراں سے ترک دنیا کی طرف مائل تھیں چنانچہ غالب نے جب عوام اور خواص سے متعلق ہر موضوع پر طبع آزمائی کی تو تصوف پر بھی ان کا قلم اسی رفتار سے چلا اور متفرق اشعار انھوں نے اس موضوع پر رقم کیے۔

غالب کے عارفانہ اشعار کو بنظر غائر پڑھنے سے جو بات زیادہ ابھر کر آتی ہے وہ یہ ہے کہ غالب اصل میں مئے معرفت سے سرشار ہیں:

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادۂ و ساغر کہے بغیر

مرزا غالب کو تصوف سے بڑا حصہ ملا ہے۔ ان کے اشعار کے سوز وگداز، دعوت فکر، گہرائی و گیرائی، ندرت بیانی، پرواز تخیل اور شدت احساس، معبود حقیقی کی بیکراں بخششوں پر تشکر آمیز بیان اور خالق حقیقی کی غالب نوازی پر ان کے مکمل اعتماد کا پتہ دیتے ہیں۔ غالب کی ہمہ گیر شخصیت کی ایک جہت یہ بھی تھی کہ مذہبی حقائق کو اشعار میں بیان کرنے کا ان کو بڑا ملکہ حاصل تھا۔ جس کو صوفیوں کی صحبت نے مزید سنوار دیا تھا اور وہ کہا کرتے:

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

غالب کا عارفانہ کلام گنجینۂ معانی کا ایک طلسم ہے جس کو سمجھنے کے لیے محض مطالعہ ہی نہیں بلکہ غالب کے بحر میں شناوری کی مہارت لازمی ہے۔

غالب بھی اکثر شعرا کی طرح وحدت الوجود کے قائل ہیں بلکہ اپنے چند اشعار میں اس خیال کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ فریب کثرت عقل کو گمراہ کر کے کائنات ظاہری کی طرف مشغول کرتا ہے اور انسان اس فریب میں آ کر نہ صرف خدا سے بلکہ اپنی حقیقت سے بھی ناآشنا ہو جاتا ہے ایک جگہ کہتے ہیں:

اصل شہود، شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

دنیا کی بے ثباتی اور کائنات کے فنا ہو جانے کے بارے میں غالب کا کلام ملاحظہ ہو:

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

دنیا و مافیہا کی حقیقت کو نئے رنگ سے یوں بھی پیش کرتے ہیں:

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

غالب کی للّٰہیت اور بلا حرص وطمع محبت خداوندی، روحانی کیفیت اور فنافی سبیل اللہ ہو جانے کی آرزو فی الواقع تصوف کا نقطۂ عروج ہے۔ ملاحظہ ہو:

طاعت میں تا رہے نہ مہ و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو

سب سے پہلے رابعہ بصری نے بلا انعام واجر محض عشق الٰہی کے تحت عبادت و ریاضت کی یہ راہ دکھائی تھی جسے شعرا نے اپنے اشعار کا موضوع بنایا۔ غالب نے اس موضوع پر خوب طبع آزمائی کی ہے ایک جگہ اور وہ خالق کی عنایتوں کے نہیں خود خالق کے ہی طالب نظر آتے ہیں:

دونوں جہاں دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

اپنے ایک شعر میں غالب یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ دنیا میں برائی اور بھلائی دونوں مصلحتاً موجود ہیں شرار بولہبی اور نور مصطفوی کے

غالب کا عارفانہ کلام گنجینۂ معانی کا ایک طلسم ہے جس کو سمجھنے کے لیے محض مطالعہ ہی نہیں بلکہ غالب کے بحر میں شناوری کی مہارت لازمی ہے۔

غالب بھی اکثر شعرا کی طرح وحدت الوجود کے قائل ہیں بلکہ اپنے چند اشعار میں اس خیال کا بھی اظہار کرتے ہیں کہ فریب کثرت عقل کو گمراہ کر کے کائنات ظاہری کی طرف مشغول کرتا ہے اور انسان اس فریب میں آ کر نہ صرف خدا سے بلکہ اپنی حقیقت سے بھی ناآشنا ہو جاتا ہے

درمیان تمیز تب ہی ممکن ہے جب دونوں کا وجود ہو۔ شر کا وجود ہی خیر کی اہمیت باور کراتا ہے چنانچہ کہتے ہیں:

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی
چمن زنگار ہے آئینہ باد بہاری کا

یہ سب غالب کی نگاہ عارفانہ کا ہی کمال ہے لیکن غالب کے جملہ کلام کو ایک مقالے میں پیش کرنا دشوار نہیں ناممکن ہے۔

اقبال کا مسلک تصوف:

غالب کے بعد ہندوستان کی زرخیز مٹی سے پھر ایک شہرۂ آفاق ہستی علامہ اقبال پیدا ہوئے جن کو سید میر حسن، داغ، اور سر ٹامس آرنلڈ سے شرف تلمذ حاصل تھا۔

علامہ اقبال کی ذات اردو شاعری کا وہ مرکزی ستون ہے جس نے اردو شاعری کی پرشکوہ عمارت کو تمام عالم میں بہت نمایاں، باوقار اور بلند و بالا بنا دیا۔

ان کے کلام اور موضوعات کا احاطہ کرنا سرحد امکانات سے پرے ہے۔

وہ نہ صرف عظیم المرتبت شاعر، حقیقت شناس مفکر، دوراندیش مصلح قوم اور علوم شرقیہ و غربیہ کے ماہر تھے بلکہ صحیح عاشق رسولؐ اور اسلامی تعلیمات کے نقیب و ترجمان بھی تھے۔ تصوف کے اسرار و رموز سے بھی آگاہ تھے۔ مسائل تصوف پر بیشتر ادبی شہ پاروں اور منظومات میں شاعر مشرق نے اپنے گراں قدر اور خیال افروز نظریات وافکار کا اظہار کیا ہے۔ ان کے انداز فکر اور اسلوب کی نمایاں ترین خصوصیت توازن واعتدال ہے۔ وہ کوری تقلید کے سخت مخالف تھے اور ہر معاملے میں اپنا ایک خاص نظریہ رکھتے تھے۔

تصوف سے متعلق علامہ کا خیال نہایت سادہ تھا اسلم جیراج پوری کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں: ''تصوف سے اگر اخلاص فی العمل مراد ہے تو کسی مسلمان کو اس پر اعتراض نہیں ہو سکتا ہاں جب تصوف فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے اور عجمی اثرات کی وجہ سے نظام عالم کے حقائق اور باری تعالیٰ کی ذات سے متعلق موشگافیاں کر کے کشفی نظریہ پیش کرتا ہے تو میری روح اس سے بغاوت کرتی ہے۔''(5)

چنانچہ اسی اسلامی تصوف کا رنگ ان کی شاعری میں خوب سے خوب تر نظر آتا ہے۔ علامہ ذات الٰہی سے ہم کلام ہوتے ہیں اور حصول عرفان کی دعا کرتے ہیں:

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

علامہ کے بارے میں سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں: ''شاید یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہو کہ ڈاکٹر اقبال مرحوم ایک صوفی خاندان میں پیدا ہوئے تھے، ان کے والد مرحوم ایک خوش اوقات صوفی تھے اور ان کے ہاں آنے والے دوستوں کا مذاق بھی یہی تھا اور اسی ماحول میں اقبال کی پرورش ہوئی۔''(6)

چنانچہ خاندانی پرورش کا اثر، علوم اسلامیہ و غیر اسلامیہ سے آگہی اور ذاتی طلب کا ہی ثمرہ تھا کہ ان کو من جانب اللہ وہ عرفان کامل ودیعت ہوا جو ان کو شاعر اسلام اور صاحب دل بینا بنا گیا اور وہ پوری انسانیت کو مخاطب کر کے پیام عمل دینے لگے:

کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ
ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل یہ گھٹائیں
یہ گنبد افلاک یہ خاموش فضائیں

اقبال تصوف میں عشق وعرفان کی تحصیل کے لیے علائق دنیا سے علیحدگی اختیار کرنے کے قائل ہی نہیں بلکہ ان کا ماننا ہے

کہ معراج تصوف کا حصول بس انسان کو بحیثیت انسان ہی مقدر ہوسکتا ہے چنانچہ بڑی گہرائی و گیرائی سے اس معنی کو سمجھاتے ہیں:

مقام شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں
ان ہی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

خود جبرئیل کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:

نہ کر تقلید اے جبرئیل میرے جذب و مستی کی
تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ

لیکن حق مطلق تک رسائی کے لیے یہ نکتہ بھی منکشف کردیتے ہیں کہ یہاں دانش برہانی سے زیادہ دانش نورانی کی احتیاج ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

دل بینا بھی کر خدا سے طلب
کہ آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

اور اس بات کے لیے شکوہ کناں بھی ہیں:

اہل دانش عام ہیں کمیاب ہیں اہل نظر
کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ

علامہ اس امر کے بھی معترف ہیں کہ نگاہ انسانی تجلی رب کی محتمل نہیں:

عین وصال میں مجھے حوصلۂ نظر نہ تھا
گرچہ بہانہ جو رہی میری نگاہ بے ادب

اقبال نے تصوف کا یہ مقام اپنی علمی آگہی اور طلب علم سے پایا تھا۔ انھوں نے ماقبل علما کو پڑھا بھی اور ان کے افکار صحیحہ کی تقلید بھی کی۔ اقبال اپنے فن کے کمال کو حکمت رومی کے تتبع کا نتیجہ اور ثمرہ قرار دیا ہے کہتے ہیں:

اسی کشمکش میں گذریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی کبھی پیچ و تاب رازی

بحر اقبال میں جتنی غوطہ زنی کیجیے اتنے ہی موتی اور دُر نایاب ہاتھ آئیں گے لیکن وقت مختصر اور بحث طولانی کے مدنظر ہم یہیں پر قلم روک دیتے ہیں۔

دیگر اردو شعرا کی نگاہ میں تصوف:

اردو شاعری کے ان مرکزی ستونوں کے علاوہ بھی دیگر اکابر شعرا نے تصوف کو اپنے کلام میں جگہ دی ہے اکثر شعراء وحدت الوجود کے قائل تھے لہٰذا تصوف کے ذیل میں اکثریت نے سب سے پہلے اسی تصور کو موضوع سخن بنایا ہے۔ میر کہتے ہیں:

گرچہ تو ہی ہے سب جگہ لیکن
ہم کو تیری نہیں ہے جا معلوم

خواجہ میر درد کا قول ہے:

جگ میں آ کے ادھر ادھر دیکھا
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

جگر کا کہنا ہے:

ہر پردۂ ہستی میں جب تو متشکل ہے
حیراں ہوں میں جلوہ پھر کون سا باطل ہے

اکبر کہتے ہیں:

میری نظروں میں ہے اللہ ہی اللہ
دلیل ماسوا کیا جانیے کیا ہے

مومن خاں مومن کہتے ہیں:

مومن ہے اگرچہ سب اسی کا یہ ظہور
توحید وجودی کا نہ کرنا مذکور
یعنی کہ بنائے ہیں خدا نے بندے
بندہ کو خدا بنائے کس کا مقدور

اردو شاعری میں خواہ تصوف و طریقت کے حامی ہوں یا مخالفین سب نے ہی تصوف کے ذیلی موضوعات پر بحث ضروری کی ہے خصوصاً دنیا کی بے ثباتی، حسن کائنات اور عشق حقیقی سب ہی کلام کا موضوع رہے۔

میر کہتے ہیں:

کیا حقیقت کہوں کہ کیا ہے عشق
حق شناسوں کا ہاں خدا ہے عشق

درد اس طرح کہتے ہیں:

اذیت مصیبت ملامت بلائیں
ترے عشق میں ہم نے کیا کیا نہ دیکھا

خواہشات اور دنیا کی حرص سے بچنے کی تلقین ہمیں اکثر شعرا کے یہاں ملتی ہے لیکن میر اور درد دونوں کے یہاں اس میں مماثلت خوب نظر آتی ہے۔

میر کہتے ہیں:

حرص و ہوس سے باز رہے دل تو خوب ہے
ہے قہر اس کلی کے تئیں گر ہوا لگے

درد کے نزدیک:

حرص کرواتی ہے رو بہ زیاں سب ورنہ یاں
اپنے اپنے بوریے پر جو گدا تھا شیر تھا

اختتام: اردو شعرا کے مکمل صوفیانا کلام کو یکجا کر دنیا مشکل ترین امر ہے۔ چنانچہ ہم اسی اختصار پر اپنے مقالے کا اختتام کرتے ہیں کہ مذکورہ اشعار سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ فارسی شاعری کی طرح اردو زبان نے بھی فلسفہ تصوف کی خوب آبیاری کی ہے اور ہندوستان کی سرزمین میں اس پودے کی جڑوں کو گہرائی تک راسخ کر کے ان اولیا کرام اور صوفیا عظام کو خراج عقیدت پیش کیا ہے جنھوں نے ہندوستانیوں کو اسلامی تعلیمات سے بہرہ ور اور آراستہ و پیراستہ کیا تھا۔

حواشی

(1) فلسفہ تصوف اور شاعری، ڈاکٹر مرزا اصغر علی بیگ ص 91
(2) تاریخ دعوت وعزیمت، حصہ سوم سید ابوالحسن علی ندوی ص 22
(3) مرجع سابق ص 95
(4) امیر خسرو کی جمالیات، شکیل الرحمن ص 57
(5) اقبال اور تصوف، پروفیسر محمد فرمان، ص 114
(6) کلیات اقبال ص 10

کتب حوالہ جات

(1) فلسفہ تصوف اور شاعری، ڈاکٹر مرزا اصغر علی بیگ، الیاس ٹریڈرس، حیدرآباد، 1981
(2) تاریخ دعوت وعزیمت، سید ابوالحسن علی ندوی، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام لکھنؤ 1978
(3) مطالعہ تصوف قرآن وسنت کی روشنی میں ڈاکٹر غلام قادر لون، مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی، 1998
(4) خسرو شناسی، ابوالفیض سحر نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا نئی دہلی، 1996
(5) امیر خسرو کی جمالیات، شکیل الرحمن، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی 1996
(6) غالب اور تصوف، سید محمد مصطفی صابری، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، 1990
(7) اقبال اور تصوف، پروفیسر محمد فرمان، بزم اقبال، لاہور، 1958
(8) صوفی امیر خسرو، سید صباح الدین مطبع معارف، اعظم گڑھ 1980
(9) کلیات اقبال، پروفیسر شہرت بخاری، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور، 1990

Dr.Zar Nigar, Opp. Kohinoor Pustak Sadan, Shahabad Gate, Rampur, UP

اردو شعرا کے مکمل صوفیانا کلام کو یکجا کر دنیا مشکل ترین امر ہے۔ چنانچہ ہم اسی اختصار پر اپنے مقالے کا اختتام کرتے ہیں کہ مذکورہ اشعار سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ فارسی شاعری کی طرح اردو زبان نے بھی فلسفہ تصوف کی خوب آبیاری کی ہے اور ہندوستان کی سرزمین میں اس پودے کی جڑوں کو گہرائی تک راسخ کر کے ان اولیا کرام اور صوفیا عظام کو خراج عقیدت پیش کیا ہے

بلال احمد

گرمی دانے کا تدارک یونانی نقطہ نظر سے

تعارف

موسم گرما میں جہاں بہت ساری غیر جلدی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں جیسے کالرا، حمی ویروسی، حمی احتراقیہ وغیرہ، اسی طرح دھوپ کی شدت اور گرمی سے بہت سی جلدی بیماریاں بھی ظہور پذیر ہوا کرتی ہیں مثلاً چہرے پر جھائیوں اور سیاہ نشانات کا پایا جانا، Photodermaittis، جرب وحکہ اور گرمی دانے وغیرہ۔ ان سب امراض میں حصف یا گرمی دانے ایک نہایت ہی کثیر الوقوع مرض ہے اور اکثر و بیشتر افراد اس سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہ پاتے اور کبھی کبھی یہ کافی پریشانی کا سبب ہوجایا کرتے ہیں۔

دراصل یہ مرض ایک دفاعی میکانیہ کے طور پر وجود میں آتا ہے جو ہمارے جسم کے دوسرے حصوں کو گرمی کے برے اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے ظاہر ہوا کرتا ہے۔ ہمارا جسم خود اپنا ایک خاص درجہ حرارت رکھتا ہے اور اس حرارت کو برقرار رکھنے میں بدن کے اندر مختلف نظام مدد فراہم کرتے ہیں جس میں بدن کے مسامات سے پسینے کا اخراج نہایت اہم مقام رکھتا ہے۔ گرمیوں کے موسم میں جب بیرونی ماحول کا درجہ حرارت بدن کے درجہ حرارت سے زیادہ ہوجاتا ہے تو اس بڑھی ہوئی حرارت کے سبب جسم انسانی کے اندر Hydrosis ہوا کرتی ہے۔ Hydrosis ایک ایسا عمل ہے جو پسینے کے ذریعے بدن کی بڑھی ہوئی حرارت کو کم کرتا رہتا ہے اور اسی طرح ماحول کی گرمی میں جس قدر اضافہ ہوتا ہے ہمارے جسم سے اتنا ہی زیادہ پسینہ ایک مثبت اور مفید ردعمل کر طور پر خارج ہوتا ہے۔ لیکن زیادہ مقدار میں پسینے کا افراز اس وقت ایک مرضی کیفیت اختیار کر لیتا ہے جب بدن کے اس نظام کے اندر کہیں پر کوئی خلل واقع ہوجاتا ہے۔ بالخصوص یہ خلل اس وقت پیدا ہوتا ہے جب جلد کے اس اہم فعل کے Component میں سے Eccrine sweat Gland کی نالی میں رکاوٹ آجاتی ہے جس کے نتیجے میں پسینے کے تیز بہاؤ کا عمل پورے طور پر صادر نہیں ہوپاتا اور اس تسدد کے سبب پسینہ بدن سے خارج (Evaporate) نہ ہوکر تحت الجلد نلی کے محتبس حصے میں جمع ہونے لگتا ہے اور یہی رکے ہوئے مواد چھوٹے چھوٹے دانے اور Vesicles کی شکل میں جلد پر نمایاں ہونے لگتے ہیں۔

تشریحی و منافع الاعضائی مطالعہ

جسم کے اندر پسینے پیدا کرنے والے غدد کا تشریحی و منافع الاعضائی مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہ غدد پورے جسم

کے اندر پائے جاتے ہیں بطور اندازان کی تعداد پورے جسم کے اندر 30 لاکھ سے زیادہ ہوتی ہے۔ البتہ ہونٹ کے کنارے Nailbed، غلاف حشفہ، ہتھیلی، تلوؤں کی جلد میں بکثرت ہوتے ہیں یہ نالی دار، پر پیچ ہوتے ہیں اور ان کے منہ سطح جلد پر ترچھے کھلتے ہیں۔ ان غدد کا کنٹرول اور عصبی پرورش Hypothalmus کے عصب شرکی کے بہت سارے غیر ملفوف عصبی ریشوں سے ہوتی ہے۔ تلوے اور ہتھیلی کے غدد حرارت سے متاثر نہیں ہوتے ہیں بلکہ عصبی تحریکات کے زیر اثر یہ سیدھے دماغ سے تحریک پزیر ہوتے ہیں۔ جیسے خوف، غصہ، Depression، شدید درد کی صورت میں اس طرح کی Sweating آپ کو روزمرہ کی زندگی میں دیکھنے کو ملتی ہیں جسے Cold Sweating کہتے ہیں اس طرح کے پسینے کی پیدائش میں موسم گرما یا گرم ماحول کا کوئی اثر نہیں ہوتا لیکن اس کے برعکس جسم کے باقی حصوں میں ہونے والی پسینے کی زیادتی عموماً درجہ حرارت سے نسبت رکھتی ہے اور اسے ہم ThermalSweating کہتے ہیں۔

غدد عرقیہ (Sweat gland) جسم کے اندر دو طرح کے ہوتے ہیں۔

(الف) Eccrine Sweat gland

یہ اپنے سائیز میں چھوٹے ہوتے ہیں۔ یہ نالیوں دار جسامت کے حامل ہوتے ہیں اس کا غددی حصہ جلد کے اندر Coiled glandular شکل میں ہوتا ہے جبکہ یہ اوپر اور باہر کی جانب سیدھی نالی کے ذریعے سطح جلد پر آ کر کھلتا ہے اور چھوٹے چھوٹے Pores کے ذریعے پسینے (Hypotonic solution) کو مستقل باہر کی طرف Pump کرتا ہے۔ دراصل یہی غدد جسم کی Cooling کا کام انجام دیتے ہیں۔

(ب) Apocrine gland

یہ بھی Coiled gland کی شکل میں پائے جاتے ہیں اور یہ مخصوص قسم کی secretion کو پیدا کرتے ہیں۔ جو سیدھی نالیوں کے ذریعے بالوں کی جڑوں (Follicular cannal) میں کھلتے ہیں۔ ان کی تعداد زیادہ تر، بغل، پستان، ناف اور اعضا جنسیہ کے اردگرد ہوتے ہیں۔

اسی طرح غدد شحمیہ (Sebacious glands) پورے جلد میں پائے جاتے ہیں جن غدد سے شحمی مادے کا اخراج ہوا کرتا ہے جو دراصل جسم کے ذریعے ہونے والے پانی کی زیادتی کو روکتا ہے اس طرح یہ غدد بھی جسمانی درجہ حرارت کو برقرار رکھتے میں معاون ہوتا ہے ٹھنڈک میں اس شحمی مادہ کی وجہ سے جسمانی حرارت کا اخراج کم ہوتا ہے۔

اقسام: یہ مرض اپنی نوعیت اور ماہیت کے اعتبار سے مختلف اقسام کے ہوتے ہیں جو درج ذیل ہیں۔

(1) حصف قلمی: Crystallina Miliaria

Miliaria Rubra کے علاوہ اس System کی کچھ بیماریاں بھی ہیں جو اپنی ماہیت المرضی میں تنوع کی بنیاد پر دوسرے ناموں سے موسوم ہیں جیسے Miliria crystallina یہ نام اس وقت دیتے ہیں جب Eccrine sweat Gland کی نالی کے اندر رکاوٹ Stratum Corneum کے نیچے ہو اور اس کے نتیجے میں پسینے کا اجتماع Sub corneal space میں ہو۔ طبقہ قرنیہ میں پسینہ کے جمع ہونے سے سوئی کی نوک کے برابر سطحی قلمی، شکل کے شفاف قطرے ہوتے ہیں جو دیکھنے میں بکھرے ہوئے شفاف موتی کی طرح دکھائی دیتے ہیں لیکن یہ زیادہ پریشان کن اور دیرپا نہیں ہوا کرتے اگر انھیں تولیہ سے صاف کر دیں تو یہ بالکل ختم ہو جاتے ہیں۔

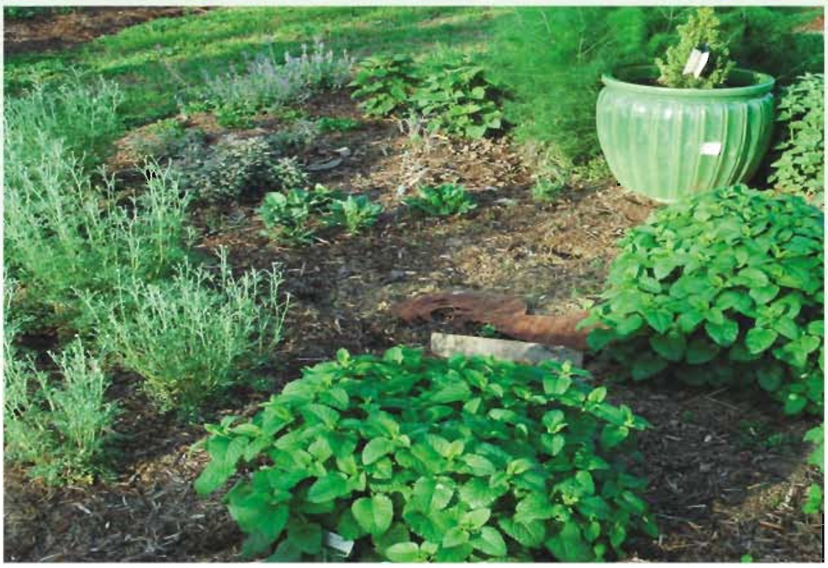

(2) حصف احمراری: Rubra Miliaria

اسی طرح Miliaria rubra میں Duct کے اندر کاوٹ epidrms کے اندر واقع ہوتی ہے اور پسینے کے اجتماع کی وجہ سے epidermal vesicle کا ظہور ہوتا ہے۔ یہ قسم اتنی زیادہ عام ہے کہ عام طور پر گرمی دانے کے لیے Miliaria rubra کا استعمال کیا جاتا ہے۔

(3) حصف نشیبی: (Profunda Miliaria)

اور اگر یہی تسدد Dermis کے اندر ہو اور Dermis کے اندر Sweat vesicle بنے تو Miliaria Profunda کے نام سے موسوم کیے جاتے ہیں۔ یہ دانے جلد کے اندر تک پیوست ہوتے ہیں باقی خصوصیات حصف احمراری کی طرح ہوتی ہے۔

(4) حصف سدیدی (Miliaria Pustulosa):

اوپر بیان کردہ اقسام اگر متعفن ہو جائے تو ان میں سدید پیدا ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں Pyoderma اور ایکزیما ہو سکتا ہے دراصل گرمی دانے کی یہ قسم اس وقت وقوع پذیر ہوا کرتی ہے جب اس کی وجہ سے متاثرہ جلد کے اندر تعدیہ اور secondery infection ہو جاتا ہے ایسا اس لیے ہوتا ہے کہ کثرت پسینہ کی بنا پر جلد کا protective barier ختم ہو جاتا ہے نتیجتاً ماحول میں موجود جراثیم آسانی سے جلد کے اندر نفوذ پذیر ہو کر اس بیماری کا سبب بنتے ہیں۔

علامات و نشانیاں

اس مرض میں بطور خاص پیشانی، گردن، سینے، پشت اور بغل وغیرہ متاثر ہوا کرتے ہیں۔ اس کی وجہ سے کھجلی، جلن اور چبھن جیسی علامات بدن کے متاثرہ حصے پر نمایاں طور پر ظاہر ہوا کرتی ہیں۔ جو لوگ دھوپ وغیرہ میں زیادہ رہتے ہیں وہ اس بیماری سے زیادہ متاثر ہوا کرتے ہیں یا پھر کوئی بھی ایسا عمل جس کی وجہ سے پسینے کے نکلنے کے عمل میں تحریک پیدا ہو اس بیماری کو پیدا کرنے کی موجب ہوا کرتی ہے۔ اس مرض کی اپنی انھیں مخصوص علامات کی بنیاد پر اس کا نام عربی میں 'بثور شوکیہ' رکھا گیا یعنی جس کے اندر کانٹے جیسی چبھن کا احساس ہو، انگریزی زبان میں بھی اسی نسبت سے اس کو Prickly heat کہتے ہیں جبکہ طب جدید میں بطور اصطلاح اس بیماری کو Miliria rubra کہتے ہیں جو دو لفظ سے مل کر بنا ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ اس میں Millet seed (باجرے) جیسے دانے نکلتے ہیں اور ان دانوں کے Base پر Erythema (سرخی) بھی پائی جاتی ہے۔

طب قدیم کی رو سے اس مرض کے اسباب میں کچھ چیزیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں جیسے خلط صفرا کا غلبہ ہونا اور وہ بھی رقیق صفرا کا۔ دراصل گرم مزاج کے لوگوں کے اندر صفرا کی زیادتی سے ان کے اندر حدت زیادہ ہوتی ہے اور پھر اگر

موسم بھی گرم ہو تو گویا ان کے جسم کے اندر مزید گرمی پیدا ہوجایا کرتی ہے اور نتیجتاً بدن کے اندر پسینے کا عمل تیز ہوجاتا ہے۔ لیکن پسینے کے اندر موجود مائی اجزا کے ساتھ ساتھ کچھ مادی چیزوں کی وجہ سے اس کی نلی میں رکاوٹ آجاتی ہے اور پھر گرمی دانے جلن اور کھجلی کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔

اس مرض کے دیگر اسباب کا اگر جائزہ لیں تو تقریباً تمام ہی اسباب ایسے ہیں جن سے پسینہ زیادہ مقدار میں افراز پاتا ہے اور پھر اس کے نتیجے میں مرضی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ جیسے:

- شدید گرمی
- تیز بخار (بخار بدن کی بڑھی ہوئی غیر طبعی حرارت کا نام ہے جو بدن کے نظام تعریق کے ذریعے اکثر کم ہوا کرتا ہے)
- پسینے کی کثرت (چاہے یہ پسینہ سخت گرمی اور مرطوب ماحول میں رہنے سے ہو یا تیز دھوپ میں کام کرنے سے)
- عدم صفائی (اگر جلد کی صفائی کا خیال نہ رکھا جائے تو پسینے میں شامل Fatty acid,triglyceride کی وجہ سے اور ماحول کے گرد و غبار سے مسامات بدن بند ہوجایا کرتے ہیں اور پھر Evaporation کا عمل متاثر ہوتا ہے اور نتیجتاً پسینے کا اجتماع تحت الجلد ہونے کی صورت میں vesicle نما دانے ظاہر ہوتے ہیں)
- گرم اشیا کا استعمال
- عام کمزوری اور قوت مدافعت کا کم ہونا۔
- موٹاپا (چونکہ یہ دانے اکثر و بیشتر بدن کے خمیدہ حصوں پر زیادہ نمایاں ہوتے ہیں اور موٹاپے میں ان حصوں سے پسینے کے بہاؤ میں رکاوٹ پیدا ہوتی ہے۔)
- Synthetic کپڑوں کے استعمال کی وجہ سے پسینے جذب نہیں ہو پاتے اور پھر یہ جلد میں رک کر مسامات کو بند کردیتے ہیں۔
- شدید معرق دوا کا استعمال۔
- کچھ بیماریاں جیسے ذیابیطس شکری اور Hypothyroidism وغیرہ۔

اصول علاج و علاج

گرمی دانے کا اصول علاج مرتب کرتے وقت کچھ چیزیں بطور خاص دھیان میں رکھی جانی چاہئیں:

1 چونکہ اس بیماری کا سبب پسینے کی زیادتی کے ساتھ ساتھ اس کے راستے میں رکاوٹ بھی ہے لہٰذا اس بات کا خیال رکھا جائے کہ پسینے کے عمل کو کم کیا جائے تاکہ راستے مسدود ہونے کی وجہ سے پسینہ تحت الجلد جمع ہو کر دانے کی شکل میں ظاہر نہ ہو سکے۔ چنانچہ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہی تدابیر اختیار کی جائیں۔

2 اس بات کا بھی خیال رکھا جائے کہ بہت زیادہ ٹھنڈے ماحول میں مریض کو منتقل نہ کریں اور نہ ہی ٹھنڈے پانی سے غسل دلائیں کیونکہ ایسا کرنے سے مسامات بدن کے اندر تنگی و سکڑن پیدا ہو سکتی ہے جو کہ پسینے کے اخراج میں مزید رکاوٹ کا سبب ہو سکتی ہے۔

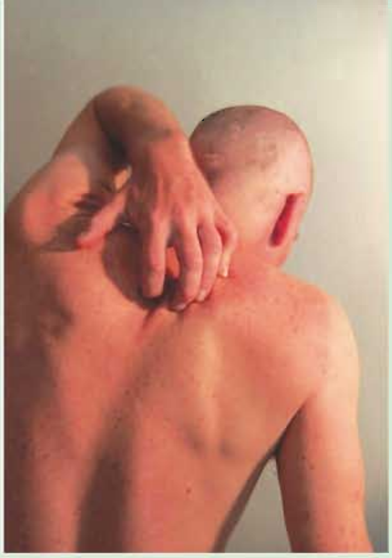

3 ہلکے گرم پانی سے غسل دیں تاکہ بدن کے مسامات کھل سکیں اور پسینے کے بہاؤ کے اندر کوئی رکاوٹ نہ ہو جو مرضی کیفیت کا سبب بنے۔

4 ضرورت پڑنے پر بابونہ، ناخونہ، سبوس گندم، کو پانی میں ملا کر غسل دیں۔

5 غسل دینے کے بعد سرکہ اور روغن گل ہم وزن آپس میں ملا کر بطور طلا استعمال کریں ضرورتاً اس میں عرق گلاب اور کافور کا بھی اضافہ کر سکتے ہیں۔

6 صندل، گل ملتانی، کافور کو لعاب اسپغول اور آب تربوز میں ملا کر بدن کے اوپر 30 منٹ کے لیے لگائے رکھیے پھر غسل کریں۔

7 داخلی طور پر گل نیلوفر 7 گرام، ہلیہ زرد 7 گرام، ہلیہ کابلی 7 گرام، عناب 5 عدد، آلو بخارا 5 عدد کا جوشاندہ بنا کر شربت عناب 20 ملی لیٹر اور عرق نیلوفر 40 ملی لیٹر کے ہمراہ صبح و شام استعمال کریں۔

8 گرم اشیا کو کھانے پینے کے طور پر استعمال کرنے سے گریز کریں جیسے انڈا، گوشت، مصالہ، چائے کافی وغیرہ۔

9 بدن کی صفائی ستھرائی کا خیال رکھیں روزانہ غسل کریں۔

10 ہلکے سوتی اور ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنیں کیونکہ تنگ اور چست کپڑے پہننے کی وجہ سے پسینے زیادہ ہوتے ہیں اور پسینے جلد سوکھتے نہیں جس کی وجہ سے پسینے زیادہ دیر تک بدن پر رکتے ہیں اور گرمی دانے جیسی پریشانیوں کا سبب بنتے ہیں۔

11 کھانے میں کوشش کریں کی ایسی غذا لیں جس میں رطوبت زیادہ ہو یعنی مرطوب اغذیہ کا بکثرت استعمال کریں۔

12 دھوپ میں جانے سے حتی الامکان گریز کریں کیونکہ اس سے پسینے کی کثرت ہوگی اور نتیجتاً پریشانی مزید بڑھ جائے گی۔

13 جسم پر سیدھے دھوپ نہ پڑے یعنی اگر دھوپ میں جانا پڑے تو ننگے بدن ہرگز نہ جائیں بلکہ بدن کو ڈھکے رکھیں۔

14 ٹھنڈے مشروبات کا استعمال کریں جیسے شربت صندل، شربت نیلوفر اور شربت اناناس وغیرہ۔

15 پھلوں کا بکثرت استعمال کریں جیسے تربوز، خربوز، سنگترہ، انگور وغیرہ۔

16 سبزیوں کا استعمال زیادہ بہتر ہے بطور خاص ہری سبزیاں، لوکی، ترئی، گاجر اور کھیرا کو گرمیوں میں زیادہ استعمال کریں۔

17 پانی کی بدن کے اندر کمی نہیں ہونی چاہیے اس لیے دن بھر میں 3 سے 2 لیٹر پانی ضرور پئیں۔

18 اگر پسینہ ہو تو اسے صاف سوتی کپڑے سے پوچھتے رہنا چاہیے۔

19 جس مکان یا کمرہ میں رہیں وہاں کی آب و ہوا میں رطوبت زیادہ نہیں ہونی چاہیے البتہ اسے ٹھنڈا اور ہوادار رکھیں۔

20 نہانے کے لیے ایسے صابن کا استعمال کریں جو بدن کو ٹھنڈک پہنچائے اور پسینے کی کثرت کو کم کر سکے اس کے لیے ملتانی مٹی کا استعمال کیا جا سکتا ہے جو بدن کے درجہ حرارت کو کم کر کے ٹھنڈا ٹھنڈا کول کول جیسا ماحول پیدا کر سکتی ہے۔

21 بدن پر صندل، ٹیلکم، کافور اور پودینہ کی شمولیت والے پاؤڈر کو چھڑکیں۔

■

Dr. Bilal Ahmad, Guest Faculty Amraz-e-Jild wa Zohrawiya, Ajmal Khan Tibbiya College, AMU, Aligarh

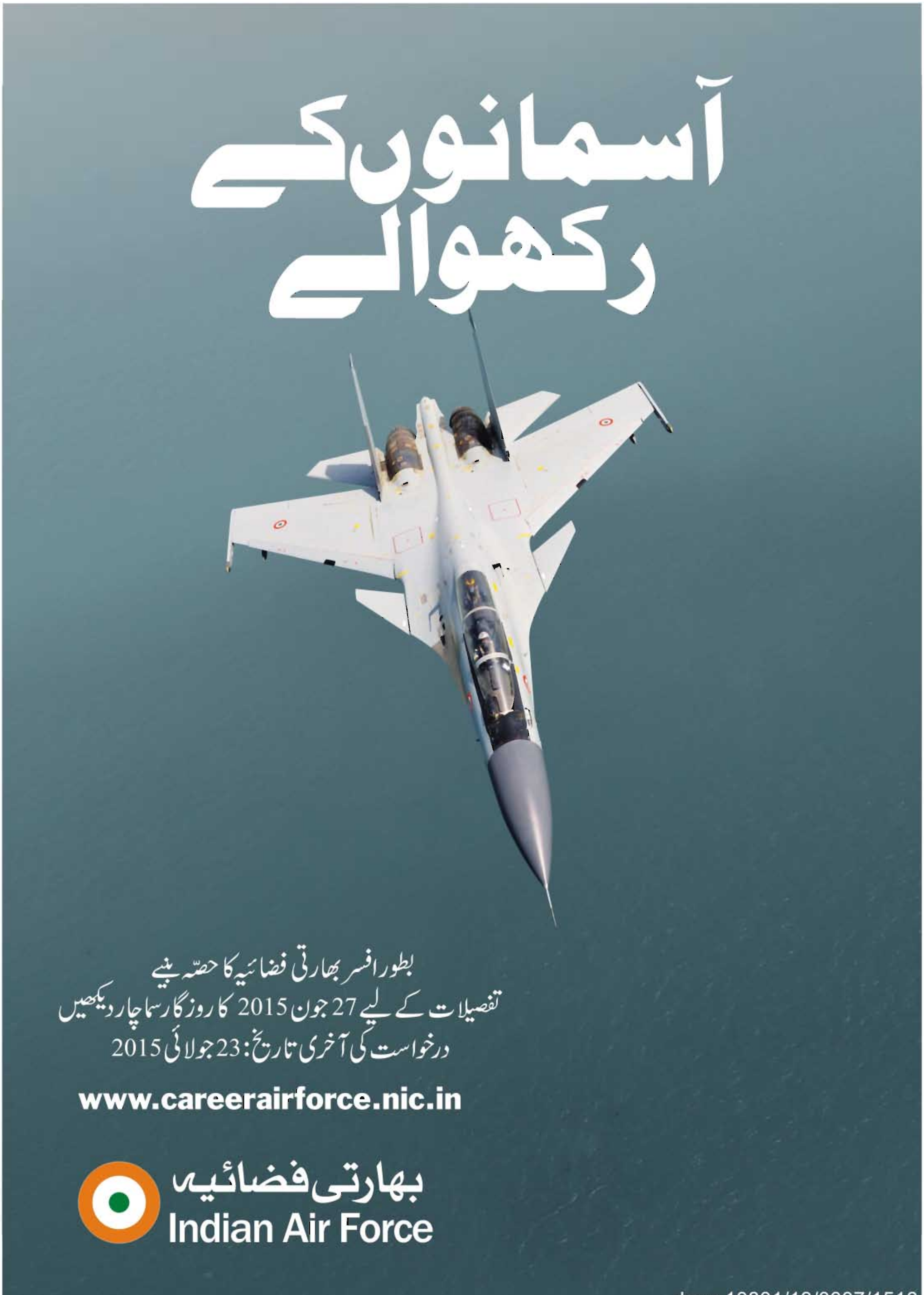
آسمانوں کے
رکھوالے
بطور افسر بھارتی فضائیہ کا حصّہ بنیے
تفصیلات کے لیے 27 جون 2015 کا روزگار سماچار دیکھیں
درخواست کی آخری تاریخ: 23 جولائی 2015
www.careerairforce.nic.in
بھارتی فضائیہ
Indian Air Force
davp 10801/13/0007/1516

تبصرہ و تعارف

اردو سافٹ ویئر

ادارہ

صفحات: 132، قیمت: 68 روپے، سنہ اشاعت: 2014

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

مبصر: جمال اختر 142 ستلج ہوسٹل، جے این یو، نئی دہلی

آج جب ہم عالمی درجہ رکھنے والی زبانوں کا جائزہ لیتے ہیں تو ان کی مقبولیت کا سبب یہ نظر آتا ہے کہ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے آنے کے ساتھ ہی ان زبانوں پر کام شروع ہو گئے تھے، لیکن اردو زبان کی طرف توجہ بعد میں دی گئی۔ پھر بھی خدا کا شکر ہے کہ کچھ تنظیموں اور حکومت کی طرف سے ادھر توجہ دی گئی جس کا نتیجہ ہے کہ آج اردو زبان سے متعلق بہت سے سافٹ ویئر تیار ہو چکے ہیں جن میں آسانی کے ساتھ ہم اردو کا کام کر سکتے ہیں۔ آج اردو زبان تیزی کے ساتھ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ سے جڑتی جا رہی ہے بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھتے ہوئے موبائل پر بھی اردو ٹائپنگ کا آغاز ہو چکا ہے، جس سے اردو زبان کے ترسیل و ابلاغ کا ایک سلسلہ چل نکلا ہے۔

اردو زبان کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے اس کے چاہنے والوں کے اندر یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اس زبان کو کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی مدد سے زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچایا جائے۔ کمپیوٹر میں اردو کے استعمال کی پہلی کوشش 1980 کے قریب ہوئی جب پاکستان میں مرزا جمیل احمد نے وہاں کے مشہور نیوز گروپ 'جنگ گروپ' کے روزنامہ 'جنگ' کے لیے لیزر کے ذریعے اردو نستعلیق کو کمپیوٹر سے روشناس کرایا۔ اس وقت یہ کافی حیرت زدہ کرنے والا کام تھا۔ اردو چونکہ پاکستان کی قومی زبان تھی اس لیے وہاں کے لوگوں نے اس کو کمپیوٹر ٹیکنالوجی سے روشناس کرکے اسے پوری طرح اس سے آراستہ کرنے کی کوشش کی۔ حالانکہ یہ ایک دشوار ترین عمل رہا اور اس میں کافی وقت بھی صرف ہوا لیکن لوگوں کی محنت رنگ لائی۔ ہندوستان میں اردو سافٹ ویئر سے متعلق کسی طرح کی پیش قدمی کے کوئی واضح نشانات نہیں ملتے، البتہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی کوششوں کو اس سلسلے میں کافی اہمیت حاصل ہے کہ اس نے ملک بھر میں کمپیوٹر ٹریننگ کے مراکز کھولے جس کی مدد سے اردو داں طبقے کو کمپیوٹر کی تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا اور ان مراکز کے تربیت یافتہ افراد آج اپنی روزی روٹی چلا رہے ہیں۔ ان مراکز پر کمپیوٹر کی تعلیم اردو زبان میں دی جا رہی ہے اور طلبا و طالبات کی سہولت کے لیے قومی کونسل نے 'اردو سافٹ ویئر' کے نام سے ایک کتاب شائع کی ہے، جو کہ اردو زبان میں کمپیوٹر کی تعلیم کے لیے شاید پہلی کتاب ہے۔

زیر تبصرہ کتاب 'اردو سافٹ ویئر' دو حصوں میں منقسم ہے، پہلے حصے میں کمپیوٹر کی تاریخ اور اس کی خصوصیات پر تفصیل کے ساتھ بحث کرنے کے بعد اردو سافٹ ویئر خصوصاً ان پیج کے استعمال سے اردو کا کام کرنے والے کو کون کون سی مدد حاصل ہو سکتی ہیں اور اسے کن مراحل سے گزرنا پڑے گا ان تمام تفصیلات کو بہت ہی واضح انداز میں تصویر کے ذریعے سمجھایا گیا ہے تاکہ کمپیوٹر سے دلچسپی رکھنے والا ایک معمولی شخص بھی اس کتاب کی مدد سے ان پرگرام کو چلا سکے۔ دوسرے حصے کو، کیسے؟ کے تحت کمپیوٹر میں اردو کا کام کرنے والے شخص کے ذہن میں جو سوالات ابھرتے ہیں ان کے جواب کمپیوٹر کی تصویر کی مدد سے دیے گئے ہیں۔ جیسے ہم کوئی مضمون لکھ رہے ہیں تو اس کی ہیڈنگ کیسے بنائیں گے؟ یا غزل ٹائپ کر رہے ہیں تو اس کو کیسے 'لے آوٹ' کریں گے؟ ایسے ہی حاشیہ کیسے تیار کریں گے؟، انڈیکسنگ کیسے کریں گے؟ یہ کتاب طلبا اور کمپیوٹر سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے نہایت ہی مفید ثابت ہوگی، اس کے ذریعے ہم گھر بیٹھے ہی کمپیوٹر چلانا آسانی سے سیکھ سکتے ہیں۔

جسم بے جان

مصنف: عبدالمعز شمس

صفحات: 198، قیمت: 90 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: عاقل زیاد، بہدورا، پوسٹ ہردیا (سنگھیا) ضلع سمستی پور، بہار

زیر تبصرہ کتاب 'جسم بے جان' ایک کتاب ہے، جس میں علم ممات سے متعلق مفروضوں اور معروضات کے درمیانی فاصلوں کو منطقی استدلال سے سر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دراصل زندگی اور موت ایک ایسے موضوع سے عبارت ہے جس پر مذہبی نظریات سے وابستہ تشریحات کو بعض حلقوں میں فرسودہ خیال تصور کیا جانے لگا ہے، اس لیے جناب شمس نے نئے زاویے سے اسے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ یقیناً ان کا زاویہ کوئی اپنی جانب سے تھوپی جانے والی بیجا تاویلیں نہیں یا کوئی غیر فہم فلسفہ نہیں ہے۔ بلکہ زندگی اور موت کے مختلف مراحل اور اس کے اسباب بیان کیا ہیں، اس موضوع پر سائنسی اور مذہبی دونوں ہی نظریات کی روشنی میں انھوں نے واضح تفصیل پیش کی ہے۔ اس کے لیے 'عبدالمعز شمس' مبارکباد کے مستحق ہیں جنھوں نے کمال مطالعہ اور نہایت ہی سہل انداز میں بار بار سمجھی جانے والی عبارت کو گویا نئے سرے سے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

کتاب کئی عنوانات پر مشتمل ہے اور ہر عنوان انسانی وجود کے مکمل سکوت سے متعلق تفصیلات پر مبنی ہے۔ مرسی کلنگ اور آنر کلنگ کا آج کل بہت شور ہے مگر بہت کم لوگ اس قسم کی اموات سے واقف ہیں۔ مرسی کلنگ یعنی ہمدردی کی بنا پر کسی کو زندگی کی قید سے آزاد کرانے کا عمل ہے، ظاہر ہے ایسا شخص کسی مہلک مرض میں مبتلا ہوتا ہے یا پھر اس کی حالت مردہ بدست زندہ ہوتی ہے۔ اس کی تکلیف ناقابل برداشت ہوتی ہے یا اس پر ہونے والے اخراجات تیمار دار کی وسعت سے باہر ہوتے ہیں۔ ایسے میں مرسی کلنگ کی اجازت ہے مگر اس کا قانونی جواز کیا ہو سکتا ہے یا پھر اخلاقی طور پر اسے کس حد تک قبول کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح آنر کلنگ یعنی نام و ناموس کی بنا پر کسی کو ہلاک کیا جانا بھی نئی طرز زندگی میں ایک رجحان بن رہا ہے۔ یقیناً اس کے

لیے انسانی یا مذہبی قانون میں کوئی گنجائش نہیں ہے، پھر بھی آئے دن ایسا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ موجودہ دور میں طفل کشی یا دختر کشی کی روایت بھی زور پکڑ رہی ہے۔ عام طور سے دختروں کے بارے میں یہی خیال کیا جاتا ہے کہ ان کی پیدائش سے لے کر پرورش اور نباہ تک ماں باپ پر گراں گزرتا ہے، اس لیے رحم مادر میں ہی دواؤں یا دوسرے طریقے سے حمل ضائع کرادیا جاتا ہے۔ اس زور پکڑتی جاری روایت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، تاہم کتاب کے مطالعے سے طفل کشی یا دختر کشی کے دیگر نفسیاتی اسباب بھی روشن ہوجاتے ہیں۔ 'مرسی کلنگ اور دور جدید' عنوان سے پہلے عبدالمعز شمس نے 'ایوتھینز یا' جو ایک یونانی اصطلاح ہے، کتاب میں تاریخی پہلو سے تو سمجھایا ہی گیا ہے ساتھ ہی اس کے مختلف اقسام پر دلائل کے ساتھ تفصیل پیش کی گئی ہے۔ اسی طرح انفعالی ایوتھینز یا کے بارے میں وہ بتاتے ہیں، 'اس میں مریض نباتاتی حالت میں پہنچ جاتا ہے اور مردہ بدست زندہ جیسا رہ جاتا ہے۔ یقیناً ایسی حالت میں لائف سپورٹ کی ضرورت ہوتی ہے جو کافی خرچیلا اور بہت زیادہ نگہہ داشت کی ضرورت ہوتی ہے، اگر لائف سپورٹ ہٹا لیا جائے تو مریض خود بخود مر جاتا ہے۔' مصنف نے ہر دو صورتوں سے سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ دنیا کی مختلف اقوام میں ایوتھینز یا کی کیا صورتیں ہیں اور اس کا اسلامی نقطہ نظر کیا ہے۔ اسلامک فقہ اکیڈمی کے جنرل سکریٹری مولانا خالد سیف اللہ رحمانی جن کا نام بڑے ادب سے لیا جاتا ہے اور جنھوں نے فقہ اسلامی پر کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں، انھوں نے اس کتاب کا بغور مطالعہ کیا ہے اور مصنف کی علمی استعداد کا اعتراف بھی کیا ہے۔ کتاب کے دیباچے میں انھوں نے لکھا ہے کہ مصنف نے موت کی علامات، موت کے بعد طاری ہونے والے اثرات، تدفین اور آخری رسومات کے سلسلے میں مختلف اقوام اور مذاہب کا طریقہ کار، کوما کی حقیقت اور اس کے درجات، دماغی موت، اعضا کی پیوندکاری، قتل کی مختلف صورتوں نیز اسقاط حمل، طفل کشی اور خودکشی وغیرہ پر تفصیل سے نئی معلومات پیش کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ مشہور معالج ڈاکٹر احمد عبدالحیٔ نے بھی مصنف کے بارے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ عبدالمعز شمس کے بارے میں اخلاص کے ساتھ کہتے ہیں کہ مصنف خود ماہر طب امراض چشم ہیں، سائنس داں ہیں اور قرآن فہمی کی سعادت سے فیضیاب ہیں، اسی لیے ان کی تحقیق دلچسپ ہے اور حقیقت سے قریب تر بھی ہے۔

اس سے انکار نہیں کہ اردو میں سائنس اور فکر و تحقیق سے متعلق کتابیں بہت کم شائع ہوتی ہیں بلکہ دور حاضر میں ہمارے دانشوروں نے گویا اس سے اپنا ناطہ ہی توڑ لیا ہے۔ ایسے میں اس کتاب کو دیکھ کر بڑی آسودگی محسوس ہوتی ہے کہ اس میں مضمون سے متعلق وضاحت سائنس اور دینیات ہر دو زاویے سے کی گئی ہے۔ دماغی موت اور اس کی پیچیدگیاں، اعضا کا عطیہ، اعضا کی منتقلی کے نئے پہلو، قتل، مادہ طفل کشی، خودکشی وغیرہ دیگر عنوانات بھی کافی معلوماتی ہیں اور تمام مضامین سائنسی علوم اور قرآن کی روشنی میں پیش کیے گئے ہیں۔ کتاب کے تمام مشمولات بڑے ہی معلوماتی اور پر مغز ہیں، اگر انھیں توجہ سے مطالعہ کیا جائے تو کوزے میں سمندر نظر آتا ہے۔ 'مردہ جسم کو ٹھکانے لگانے کے طریقے' میں مصنف نے مختلف قوموں اور خطوں میں مروجہ روایات اور اس کی جمالیات کا بڑی خوبی سے احاطہ کیا ہے۔ مصنف اس کے لیے واقعی مبارکباد کے مستحق ہیں جنھوں نے موضوع کی اہمیت کو سمجھنے والوں میں ممکنات کی حد تک تحریک پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

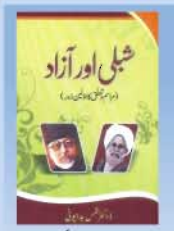

شبلی اور آزاد (مراسم و تعلق کا اوّلین دور)

مصنف: ڈاکٹر شمس بدایونی

صفحات: 80، قیمت: 120 روپے

ناشر: اپلائڈ بکس، 1739/10، پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی

مبصر: محمد رضوان خاں ایم ایم آئی، D-307، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی

(2014) کو شبلی صدی کے طور پر منایا گیا۔ جگہ جگہ سیمینار منعقد ہوئے۔ رسائل کے نمبر اور گوشے نکالے گئے۔ اس ہمہ ہمی کے باوصف ڈاکٹر شمس بدایونی کو ملال ہے کہ مولانا شبلی کی متنوع اور رنگارنگ شخصیت پر محققین نے نہ ماضی میں کوئی کام کیا اور نہ آج کر رہے ہیں۔ ان کے مطابق: "شبلی بڑے محققین کے التفات سے محروم رہے ہیں۔ ان پر محققین کے ذریعے اعلیٰ درجے کا کام تو سرے سے ہوا ہی نہیں۔ متوسط درجے کے تحقیقی کام کے لائق بھی انھیں نہیں گردانا گیا۔ ان کی حیات و خدمات کے بارے میں ماضی میں جو کچھ لکھا گیا بعد والوں نے اسی کو قبول کیا اور اختیار کرلیا، اس کو اپنے طور پر جانچنے، پرکھنے اور تصحیح و اضافہ کرنے کی سنجیدہ کوشش نہیں کی۔" (پیش گفتار، ص 7)

انھوں نے اسی ملال و تاثر کے ساتھ 2004 میں شبلی اور شبلیات کو موضوع بنایا تھا۔ دارالمصنفین، اعظم گڑھ نے شبلی پر ان کے تحقیقی مضامین سال گذشتہ 'شبلی کی ادبی و فکری جہات' کے نام سے شائع کیے (2013)۔ زیر تبصرہ کتاب اسی سلسلے کی دوسری کاوش ہے۔ کتاب تین مقالات پر مشتمل ہے: (1) ملاقاتِ شبلی اور آزاد کے زمانے کا تعین (2) شبلی اور آزاد: لسان الصدق کے حوالے سے (3) سوانحِ آزاد میں اذکارِ شبلی

تینوں مقالات اپنے اختیار کردہ عنوان سے پورا پورا انصاف کرتے ہیں۔ مصنف نے پہلے مقالے میں شبلی شناسوں کا اختیار کردہ سنہ 1905 اور آزاد شناسوں کا طے کردہ سنہ 1899 کا رد کرتے ہوئے مولانا آزاد کے بیان کردہ سنہ 1904 کو بعض داخلی اور خارجی شواہد کی بنیاد پر ملاقات کا صحیح سنہ قرار دیا ہے۔ یہ دلائل و شواہد اتنے مضبوط ہیں کہ ان کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ حیرت ہے کہ مولانا آزاد کی اپنی تحریروں میں مخفی ان شواہد تک شمس بدایونی سے پیشتر کسی کی نظر نہیں کی جاسکی۔

دوسرے مقالے میں شبلی سے متعلق تحریروں کو تین شقوں [(1) لسان الصدق میں مولانا شبلی کی تحریریں (2) شبلی کی زیر طبع یا زیر تصنیف کتابوں کی اطلاع (3) مولانا آزاد کی مختلف نوعیت کی تحریروں میں شبلی کا ذکر و اعتراف] کے تحت جمع کر کے اس دور میں دونوں کے مابین تعلقات کو ایک واضح صورت دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ معلومات بقول مصنف شبلیات کے ذخیرے میں نامعلوم کی حیثیت رکھتی تھیں۔

تیسرے مقالے میں ملیح آبادی کی مرتبہ آزاد کی کہانی سے 16 اقتباسات سلسلہ وار یکجا کیے گئے ہیں اور ان میں پیش کردہ شبلی سے متعلق معلومات کی تشریح و توضیح کی گئی ہے۔ ان عبارتوں اور جملوں میں چھپے مطالب اور مطالب کو ایک خاص ترتیب سے مرتب کر کے دور اوّل کے تعلقات کی حقیقی صورت کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ کوشش بعض صورتوں میں شبلی اور آزاد شناسوں کے آج تک کے کیے گئے کاموں میں اضافہ ہے۔

اس کتاب سے نہ صرف شبلی اور آزاد کے مراسم و تعلق کی صحیح تصویر واضح ہو کر سامنے آتی ہے بلکہ شخصیات سے متعلق مسائل پر تحقیق کس طرح کی جائے اور اختلافی مسائل میں اپنی بات کہنے اور اس پر اصرار کرنے کے لیے تحقیق کا کیا طریقہ کار ہونا چاہیے اس پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ پیش گفتار، اشاریہ اور کتابیات سے کتاب کی وقعت میں اضافہ ہوا ہے۔ کتاب خوبصورت چھپی ہے۔ اغلاطِ کتابت نظر نہیں آئیں۔ قیمت بھی مناسب ہے۔ امید ہے کہ علمی حلقے اس کا خیر مقدم کریں گے۔

تحقیقی، تنقیدی اور تعارفی مقالات

مصنف: پروفیسر مقصود احمد
صفحات: 256، قیمت: 250 روپے، اشاعت: مئی 2014
ناشر: حضرت پیر محمد شاہ لائبریری اینڈ ریسرچ سینٹر، احمد آباد، گجرات
مبصر: سمیہ محمدی، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

پروفیسر مقصود احمد کی اس سے پیشتر تصانیف 'تصوف کی حقیقت'، 'رفاقت کی خوشبو' (شعری مجموعہ) اور 'جدید عربی ادب سے متعلق تحقیقی اور معلوماتی مضامین' The Begning & Development of drama in Arabic جیسی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب 'تحقیقی، تنقیدی اور تعارفی مقالات' میں 17 مضامین ہیں جس میں چند کی نوعیت تعارفی ہے اور کچھ مضمون کی نوعیت تحقیقی اور تنقیدی ہے، اس کے علاوہ مصنف کا پیش لفظ بھی شامل ہے جس میں کتاب کے مشمولات پر گفتگو کی گئی ہے۔ کتاب چار عنوانات کے تحت منقسم ہے۔ اسلامیات، تاریخ اسلام، مطالعۂ انجیل اور عربی ادب۔ ابتدا میں 'تعارف نامہ بہ عنوان عرض داشت' کے نام سے دو مضامین شامل ہیں جن کا تعلق بالترتیب تحفۂ جعفری اور تحفۃ الطالبین مولفہ حضرت نذیر احمد نور اللہ سے ہے۔ مضمون 'سید امیر علی کی اسپرٹ آف اسلام کا تنقیدی مطالعہ' مصنف کے انگریزی مضمون A critical study of the sprit of Islam کا اردو ترجمہ ہے۔ 'حیات النبیؐ—ایک تعارف' ڈاکٹر محمد طاہر القادری کی تصنیف 'حیات النبیؐ' پر مبنی نہایت تفصیلی مقالہ ہے۔ اس مضمون میں مصنف نے کتاب 'حیات النبیؐ' میں شامل تمام موضوعات پر گفتگو کی ہے۔ طاہر القادری کی اس کتاب میں شامل تمام ابواب پر مصنف نے توجہ دیتے ہوئے وضاحت کے ساتھ کتاب کا تجزیہ کیا ہے۔ مصنف نے طاہر القادری کے بہت سے اقوال پر اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا ہے۔

'علامہ بدرالدین عینیؒ اور علم حدیث میں ان کا نقش دوام—ایک تعارف' مضمون دراصل عربی سے ترجمہ ہے۔ عربی میں بدرالدین عینی واثرہ فی علم الحدیث' کے عنوان سے مصنف نے خود تحریر کیا ہے۔ اس مضمون میں پروفیسر مقصود احمد نے علامہ عینیؒ کی حیات طیبہ اوران کی علمی وادبی خدمات پر مختصر مگر جامع گفتگو کی ہے۔

مضمون 'سید امیر علی اور تاریخ عرب' میں مصنف نے سید امیر علی کی ان تصانیف پر مختصر روشنی ڈالی ہے جن کا تعلق اسلامی تاریخ سے ہے۔ اس ضمن میں صاحب کتاب نے the ethics of Islam The spirit of Islamic women اور دوسری کتابوں کا تنقیدی مطالعہ پیش کیا ہے۔

مضمون 'عربی ادب میں داستان کی روایت' تحقیقی مضمون ہے۔ کتاب کے متعین عنوانات کے چوتھے حصے میں 'بغداد کی وجہ تسمیہ'، 'برامکہ تحقیق کی روشنی میں'، 'آزر تحقیق کی روشنی میں' اور 'عربی میں علم ہیئت کا ارتقا: عہد مامون تک' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ پروفیسر مقصود احمد خود چونکہ فارسی، عربی و اردو تینوں زبانوں پر دسترس رکھتے ہیں لہٰذا مختلف کتابوں خاص کر عربی زبان میں موجود کتابوں کی تفہیم وتعبیر میں انھیں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ پروفیسر مقصود احمد کی کتاب اسلامیات کے بعض اہم گوشوں اور عربی زبان وادب کی تاریخ کو سمجھنے میں بہت معاون ثابت ہوگی۔ تمام مقالات معلومات بخش ہیں۔ کتاب کی طباعت عمدہ ہے۔ 256 صفحات پر مشتمل یہ کتاب تحقیقی نوعیت کی عمدہ مثال ہے۔ امید کی جاسکتی ہے کہ ادبی دنیا کا ایک بڑا حلقہ اس کتاب سے مستفید ہوگا۔ طالب علموں کے لحاظ سے قیمت کچھ زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ بلاشبہ پروفیسر مقصود احمد اس تحقیقی وادبی کاوش کے لیے مبارک باد کے مستحق ہیں۔

ارتباط

شاعر: مدحت الاختر، مرتب: عبید حارث
صفحات: 144، قیمت: 70 روپے
ناشر: آئیڈیل پبلی کیشن ہاؤس، کامپٹی
مبصر: ڈاکٹر محبوب راہی، بارسی ٹاکلی (اکولہ)

اردو میں جدیدیت اور مدحت الاختر کی شاعری کا زمانۂ آغاز تقریباً ایک ہی ہے۔ مدحت نے اپنے تخلیقی سفر کی شروعات روایتی لب و لہجے اور کلاسیکی رنگ و آہنگ سے معمور شاعری سے ضرور کی لیکن اپنی جدت طراز افتادطبع کے زیر اثر جلد ہی اپنی فکرورجحان کے دھاروں کا رخ نوزائیدہ جدیدیت کی جانب موڑ لیا اور فطری ہم آہنگی اور طبعی مناسبت کی بنا پر دیکھتے ہی دیکھتے اپنے تازہ کار شعری لب و لہجے اور منفرد طرز اظہار کو اس نئے رجحان سے ہم رنگ و ہم آہنگ کرنے میں قابل لحاظ اور حیرت انگیز کامیابی حاصل کرلی۔

مدحت الاختر کی شاعری کا زمانۂ آغاز ڈاکٹر سروشہ نسرین کی مہیا کردہ معلومات کی روشنی میں 1962 ہے۔ اس کے اٹھارہ برس بعد 1980 میں موصوف کا اولین شعری مجموعہ 'منافقوں میں روز وشب' کا منظر عام پر آنا تخلیقی سفر میں ان کی آہستہ خرامی اور محتاط روی کا دستاویزی ثبوت فراہم کرتا ہے جس کی ارباب فکر وبصیرت اور صاحبان ذوق میں بے انتہا پسندیدگی اور مقبولیت کے باوجود مدحت کی میانہ روی میں شمّہ بھر فرق نہیں آیا جس کا ثبوت پورے چوبیس برسوں بعد 2004 میں ان کے دوسرے مجموعے 'میری گفتگو تجھ سے' کا منظر عام پر آنا اور راہ ادب پر اسی رفتار سے محوخرام رہتے ہوئے نو سال بعد گزشتہ دنوں زیر تبصرہ مجموعے ارتباط کا منصۂ شہود پر آنے کی صورت میں ثابت ہے۔

ارتباط کے 144 صفحات پر ہر مصرع نک سک سے درست، ہر شعر باعتبار رموز فن و معیارات فکر کامل و اکمل، 99 شاہکار و گہر بار غزلیات بشمول شناس نامہ مرتبہ محمد حفظ الرحمٰن۔ فہرست اور دیگر لوازمات اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے سرنامے کے تحت ابتدائی دو صفحات پر مدحت کے یہ دو شعر جوان کے تخلیقی مزاج کی شناخت نامے کے طور پر درج ہیں:

ہر تار نفس ہے متحرک متواتر   رخصت ہی مجھے نغمہ سرائی نہیں دیتی
وہ عجب شخص ہے جب اس سے ملاقات ہوئی   روح میں دھوپ کھلی، دھوپ میں برسات ہوئی

حمد ومناجات کے بابرکت آغاز سے از اول تا اختتام مدحت کی فکروفن سے آراستہ 99 غزلیات اور عصری حسیت سے معمور 54 منتخب اشعار کے سیر حاصل مطالعے کے بعد وہ بے شمار اشعار جن پر ہر قدم 'دامن دل می کشد کہ جا اینجاست' کی صورت حال درپیش آئی بطور نمونہ از مشتے خروارے چند شعر پیش کرنے پر اکتفا کررہا ہوں۔''

ہم خیر سے دنیا کو بناتے رہے جنت   اب غور سے دیکھا تو بنی اور ہی کچھ ہے
دنیا ہی سے ہے ہر کس و ناکس کو محبت   دنیا کو سروکار کسی سے بھی نہیں ہے
سجدہ کرآئے ہیں اس شوخ کے در پر شاید   جگمگاتی ہوئی یاروں کی جبیں دیکھی ہے
میری ہر بات مان لیتے ہیں   آپ انکار کیوں نہیں کرتے
سو طریقے ہیں بات کے لیکن   بات آتی نہیں غزل کی سی
سجاتے رہتے ہیں ہم اپنے شعر کو مدحت   یہی ہے فکر کہ یہ کھیل بے مزہ نہ لگے

نہایت سلیقے اور اہتمام کے ساتھ سجائے گئے اشعار کے لطف وانبساط کا ارتباط یہ شعری مجموعہ محض ستّر روپے میں مذکورہ بالا پتے سے حاصل کیا جاسکتا ہے کہ اس کی اشاعت میں اردو کونسل کی مالی اعانت شامل رہی ہے۔

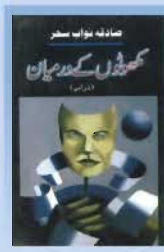

مکھوٹوں کے درمیان

مصنفہ: صادقہ نواب سحر
صفحات: 240، قیمت: 250 روپے
ناشر: تخلیق کار پبلشرز، دہلی
مبصر: ذاکر فیضی روم نمبر E-7، برہم پترا ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب ''مکھوٹوں کے درمیان'' ڈاکٹر صادقہ نواب سحر کے ڈراموں کا پہلا مجموعہ ہے۔ اردو ڈرامہ نگاری میں موصوفہ کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ اسٹیج ڈرامے سے خصوصی دلچسپی رکھتی ہیں اور اسٹیج کے ڈراموں سے بخوبی واقف ہیں۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی کے مطابق اردو کا پہلا ڈرامہ 'رادھا کنہیا کا قصہ' ہے۔ اس کے بعد امانت لکھنوی کی اندر سبھا اور مداری لال کی اندر سبھا اور دوسری اندر سبھائیں ہیں۔ مگر ان ڈراموں میں قصے طبع زاد نہیں بلکہ انسان اور پریوں کی محبت کی کہانیاں ہیں۔ اردو ڈرامے کو پھلنے پھولنے کا موقع پارسی تھیٹر کے ذریعے نصیب ہوا۔ پارسی تھیٹر کے ڈراموں کو ہم تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں پہلا دور احسن لکھنوی کا ہے، جس میں انگریزی ڈراموں کو ہندستانی روپ میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی۔ دوسرا دور طالب بنارسی اور نرائن پرساد بیتاب بنارسی کا دور تھا، جس میں پرانی روش یعنی انگریزی ڈراموں کو ہندستانی انداز میں پیش کرنے کے ساتھ پرانی ہندو روایات کے ڈراموں کو بھی اسٹیج کیا گیا۔

تیسرا دور آغا حشر کاشمیری کا دور تھا، جنھوں نے اردو ڈرامے کو منظوم کرنے کے بجائے انھیں گھن گرج کا انداز دیا اور جس کی زبان ادبی 'مقفّٰی' ہوتی تھی۔ اس کے بعد پروفیسر مجیب، پروفیسر عابدی، حبیب تنویر، پروفیسر محمد حسن، شمیم حنفی وغیرہ نے کامیاب ڈرامے تحریر کیے۔ جہاں تک اردو ڈرامے میں خواتین ڈرامہ نگاروں کی حصہ داری کی بات ہے تو زاہدہ زیدی، نادرہ ظہیر ببر اور بانو سرتاج کے بعد ڈاکٹر صادقہ نواب سحر کا نام آتا ہے۔ ان کے ڈراموں کا مطالعہ کر کے احساس ہوتا ہے کہ ان میں ایک بہترین ڈرامہ نگار بننے کی بھرپور صلاحیت موجود ہے۔

ڈاکٹر صادقہ نواب سحر اردو فکشن کا ایک ابھرتا ہوا نام ہے۔ ان کا ناول 'کہانی کوئی سناؤ متاشہ' 2008 میں شائع ہوا تھا۔ یہ ناول بہت مقبول ہوا تھا۔ اس ناول کو کئی ایوارڈ بھی مل چکے ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ 'انگاروں کا پھول' 1996 میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے بچوں کے لیے نظمیں بھی لکھی ہیں جو کہ 2003 میں کتابی شکل میں 'پھول سے پیارے جگنو' کے نام سے شائع ہو چکی ہیں۔

ڈراموں کے اس مجموعے میں دس ڈرامے شامل ہیں جو فنی اور تکنیکی اعتبار سے کامیاب ہیں۔ ان ڈراموں میں ہمارے سماج کے مسائل کو کرداروں کے ذریعے پیش کرنے کی کامیاب سعی کی گئی ہے۔ ڈرامہ نگار مکالموں کے ذریعے اپنی بات کہنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہیں۔ ان کرداروں کے مکالمے فطری اور حقیقی ہیں اور کردار و واقعات سے مطابقت رکھتے ہیں۔ جہاں تک ان کے مزاحیہ ڈراموں کا سوال ہے اس میں وہ بھی کامیاب ہیں حالانکہ کہیں کہیں لطائف کے ذریعے ہنسانے کی کوشش کرتی ہیں، جس سے مضحکہ خیزی جیسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں۔

کتاب کا پہلا ڈرامہ 'دیا جلے ساری رات' ایک کامیاب اور بہترین ڈرامہ ہے۔ اس کے مرکزی کرداروں میں باشا اور نوری ہیں۔ ڈاکٹر صادقہ نواب سحر اس ڈرامے میں بتانا چاہتی ہیں کہ کوئی بھی والدین اولاد کے دشمن ہرگز نہیں ہوتے ہیں، ان کی مجبوریاں اور پریشانیاں ہوتی ہیں اور یہ کہ کسی بھی الجھن، پریشانی یا تکلیف کا حل فرار حاصل کرنا نہیں ہوتا ہے۔

مزاحیہ ڈراموں میں ڈاکٹر کفن پھاڑ، تین دو پانچ، میرج بیورو، اور ڈسکو کالج ممبئی وغیرہ قاری کو بھرپور طریقے سے لطف اندوز ہونے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ جہاں 'ڈاکٹر کفن پھاڑ' میں جانوروں کا ڈاکٹر انسانوں کا علاج کرتا نظر آتا ہے، وہیں ڈرامہ 'تین دو پانچ' میں میاں بیوی کی دلچسپ اور مزیدار نونک جھونک ہے، جس میں لطیفوں کے ذریعے مزاح پیدا کیا گیا ہے۔ ڈرامہ 'میرج بیورو' میں ایک لڑکی اس الجھن کا شکار ہے کہ وہ شادی کے فارم میں اپنے باپ کا نام کیا بھرے کیونکہ اگر وہ اپنے باپ کا نام بھرتی ہے تو ماں ناراض ہو جائے گی اور اگر اپنے پتا (ماں کا دوسرا شوہر) کا نام بھرتی ہے تو اس کا باپ خفا ہوگا۔

ڈرامہ 'ظلم تو ظلم ہے' ایک ایسی انسانی نفسیات کو پیش کرتا ہے، جس میں انسان کا اعتبار انسان سے اُٹھ جاتا ہے اور وہ جانوروں پر بھروسہ کرنے لگتا ہے۔

ان کے علاوہ دیگر ڈراموں میں گھنگرو بجتے رہے، سلطان محمود غزنوی، باادب باملاحظہ ہوشیار، اور خودکشی وغیرہ بھی کامیاب اور دلچسپ ہیں۔

مطالعہ ابوالکلام آزاد اور وہاب قیصر

مصنف: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی
صفحات: 128، قیمت: 150 روپے
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: شاہد الرحمٰن 171 سابرمتی ہاسٹل، جے این یو نئی دہلی

پروفیسر وہاب قیصر اردو کے ان مصنّفین میں نمایاں مقام رکھتے ہیں جنھوں نے پچھلی دو دہائیوں میں آزاد کے سلسلے سے تحقیقی، تنقیدی اور تجزیاتی مضامین بڑی تعداد میں لکھے اور اردو اور انگریزی میں اس موضوع سے ان کی متعدد کتابیں منظر عام پر آئیں۔ ان میں سے کم و بیش ہر تحریر کو اردو کے علمی حلقے میں بہ نظر تحسین دیکھا گیا۔ ابوالکلام آزاد کے سلسلے سے گزشتہ نصف صدی سے زیادہ کے وقفے میں متعدد ماہرین سامنے آچکے ہین جن میں مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی، قاضی عبدالغفار، عتیق صدیقی، شورش کاشمیری، مالک رام، ریاض الرحمٰن شیروانی، ابوسلمان شاہجہاں پوری اور جمشید قمر کی بنیادی خدمات سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ وہاب قیصر اسی کڑی میں شامل ایک ایسے اہم محقق اور نقاد ہیں جنھوں نے آزاد کی تحریروں اور ان کے متعلقات کو نئے زاویے سے پرکھنے کی کوشش کی۔ خاص طور سے سائنس اور ٹیکنولوجی کے فروغ اور نئی ذہن سازی کے امور میں آزاد کے کارناموں پر غور و فکر کرنے کے لیے قیصر کو سب نے داد دی۔ انھوں نے غالب اور دوسرے موضوعات پر بھی مضامین اور کتابیں لکھیں لیکن ان کے کارناموں کی بنیادی پہچان آزاد کے سلسلے سے تحقیق اور تنقید ہی ہے۔ پروفیسر وہاب قیصر بنیادی طور پر فزکس کے پروفیسر ہیں جو اردو ادب کی نسبت بھی رغبت رکھتے ہیں۔ ان کی انفرادی شناخت سائنس اور ادب کا امتزاج برقرار رکھنے میں ہے۔

زیر نظر کتاب 'مطالعہ ابوالکلام آزاد اور وہاب قیصر' میں مصنف نے پروفیسر وہاب قیصر کی مولانا آزاد کے متعلق تمام تر تحریروں کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اور انھیں تفہیم عصر کا خطاب عطا کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کتاب 128 صفحات اور آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ کتاب کے آخری صفحے یعنی 128 پر مولانا ابوالکلام آزاد پر وہاب قیصر کی کتابوں کی فہرست درج ہے۔

وہاب قیصر نے سائنس اور ادب کے فروغ میں تین اہم امور کی بات کی ہے۔ یعنی مطالعہ، مشاہدہ اور تجربہ۔ مطالعے سے پتہ لگایا جاسکتا ہے کہ کسی بھی میدان میں کون کون سے اصول متعین کیے گئے ہیں، کون کون سے تجربات انجام دیے جا چکے ہیں اور ان سے کون کون سے نتائج اخذ کیے گئے ہیں؟ ترقی یافتہ زبانوں کا ادب اور سائنس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ تجربے سے تخلیق کے کینوس کو وسعت ملتی ہے اور مشاہدہ تحقیق کی اساس بنتا

ہے۔ انھی امور کے مدنظر انھوں نے سائنٹفک تنقید سے کام لیتے ہوئے مولانا آزاد کی تفہیم کے باب کو روشن کیا ہے۔

مولانا آزاد ہمہ جہت اور غیر معمولی شخصیت کے مالک، کئی حیثیتوں کے حامل تھے۔ بیک وقت وہ ادیب، شاعر، مبصر، مفکر، صحافی، مجاہد آزادی، شعلہ بیان مقرر، مفسر قرآن، قومی تعلیمی پالیسی کے پیش رو رہنما، منفرد سیاست داں اور ایک دردمند دل کے مالک تھے۔ بیسویں صدی میں ہندوستان کے معاشرتی، ثقافتی، سیاسی، ادبی، تہذیبی، مذہبی، سماجی اور صحافتی رجحانات کی تعمیر و تشکیل میں آزاد نے ایک ناقابل فراموش اور تاریخ ساز کردار ادا کیا۔

مولانا آزاد کی قومی سیاسی بصیرت بے مثل تھی اور ان کی ہی مجتہدانہ کاوشوں نے ملت کے سیاسی افکار میں نئی روح پھونکی۔ ملک آزاد ہوا تو انھوں نے وزارت تعلیم کا عہدہ سنبھالا اور جدید تعلیم کے معمار ثابت ہوئے۔ ملک کو جدید سائنسی تعلیم سے لیس کرنے کا اہم ترین فریضہ بھی منصوبہ بند طرز پر بخوبی انجام دیا۔ اس طرز پر انھوں نے خاصے لسانیاتی، سائنسی اور معلوماتی مضامین مثلاً زمانہ قدیم میں کبوتروں کی ڈاک، سنین، پنچ کیشن، دیسی اور ولایتی الفاظ، ایکس ریز، یورپ میں گونگوں کی تعلیم، اسپیکٹرا سکوپ، ریڈیم، ٹارپیڈو، وائرلیس ٹائپ رائٹر، الحیات، زمین پر کائنات حیات کا آغاز، برقی مچھلیاں، Mutation، نیند کی حقیقت وغیرہ تصنیف کی ہے۔ ان مضامین میں وہ جس طرح اور جس قدر سائنسی اصطلاحات پر بحث کرتے ہیں، ان کے تاروپود کو بیان کرتے ہیں، ان کا نظریہ جس قدر علمی ہے، احساس ہی نہیں ہوتا کہ مولانا آزاد کی کوئی Formal سائنسی تعلیم نہیں ہوئی۔ ایسا لگتا ہے کہ کوئی سائنس کا پروفیشنل اپنے بیانات حقائق کی روشنی میں درج کر رہا ہے۔ 'غبار خاطر' میں آزاد نے سائنسی خطوط پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ جس قدر وضاحت سے انھوں نے فلسفہ اور سائنسی اصطلاحات مثلاً انسانی زندگی، اس کے وجود کی حقیقت، Quantum Theory، رحم جبریت، نظریۂ ارتقا، تخلیقی اصل، کشش ثقل، کہکشاں، علم فلکیات، نظریۂ اضافت، کائنات، وقت، مادہ، پھول پودے، طہوریات، پلازما، الیکٹران، مادہ ضد مادہ، تاریک مادہ، قوتوں کے مرکز، توانائی کے میدان، سالمہ، طہوریات وغیرہ پر بحث کی ہے وہ حیرت انگیز ہے۔

پروفیسر وہاب قیصر نے مولانا آزاد کے تعجب خیز سائنسی پہلوؤں کو بہ خوبی اجاگر کرنے میں کامیابی پائی ہے۔ اس سے مولانا کی معنویت میں اضافہ ہوا ہے۔

مرحوم شعرائے بیگوسرائے

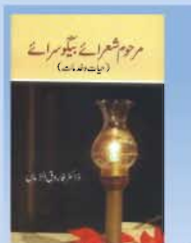

مصنف: ڈاکٹر فاروق الزماں
صفحات: 272، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2014
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: بی بی شفقت آرا، شاہین باغ، نئی دہلی

زیر تبصرہ کتاب 'مرحوم شعرائے بیگوسرائے' ڈاکٹر فاروق الزماں کے تحقیقی مقالے کا اصل مضمون ہے۔ اس کتاب کو موصوف نے محنت و لگن اور کدوکاوش کے ساتھ ترتیب دی ہے۔ وہ انتہائی ملنسار، منکسر المزاج اور بردبار ہیں۔ ہمیشہ سماجی کاموں میں غرق رہتے ہیں۔ انھوں نے پورنیہ میں اپنے قیام کے دوران سماجی کاموں میں خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان کا تعلق پڑھے لکھے گھرانے سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود پڑھائی لکھائی اور دیگر سماجی کاموں کے لیے بھی وقت نکالتے رہے ہیں۔ ان کی یہ کاوش جو کتابی شکل میں منظر عام پر آئی ہے، اسی محنت کا نتیجہ ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے ضلع بیگوسرائے کے 125 شعرا کی سوانح حیات اور نمونہ کلام کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ بہرحال زیر نظر کتاب 'مرحوم شعرائے بیگوسرائے (حیات و خدمات)' کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر قمرالزماں نے گویا سمندر کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی یہ کاوش لائق ستائش ہے۔ 125 عبقری شخصیات، مایہ ناز نثر نگار اور مشہور و معروف شعراء کی ایک طویل اور لمبی داستان کو صفحہ قرطاس پر لانے کی سعی کی ہے۔ یقیناً ان حضرات کی سوانح حیات اور کارنامے ہزارہا صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں، لیکن موصوف نے ان سب کا مطالعہ کر کے چند صفحات میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ سمندر سے موتیوں کو چننا کوئی آسان کام نہیں ہے، لیکن انھوں نے جس حسن اسلوبی اور روانی کے ساتھ اس کام کو انجام دیا ہے وہ یقیناً لائق تعریف ہے۔ کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ موصوف کی کاوش کی ستائش ضرور ہوگی۔ مصنف نے تین سو سال پر محیط علمی اور ادبی خدمات کو جمع کر کے یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسان جس کام کے لیے ٹھان لیتا ہے وہ اس کے لیے آسان ہو جاتا ہے۔

ضلع بیگوسرائے کے تذکرہ کا آغاز 1727 سے ہوتا ہے۔ ضلع کے سب سے پہلے شاعر گھنشیام عبداللہ ہیں جن کا تعلق شمالی بہار سے ہے۔ موصوف شمالی بہار کے اولین شاعر بھی قرار دیے گئے ہیں۔ یہ حضرت شیخ سلطان صدیقی نقشبندی علیہ الرحمہ ساکن لکھمنیاں ضلع بیگوسرائے کی شخصیت سے کافی متاثر تھے۔ انھوں نے ان کے ہاتھوں پر بیعت کیا اور مشرف بہ اسلام ہوئے۔ اس کے بعد شیخ نے ان کا نام عبداللہ رکھا۔ جناب گھنشیام شیخ عبداللہ پیشے سے تاجر تھے۔ ایک بار ان کی کشتی جس میں ان کا تجارت کا سامان بھرا ہوا تھا لکھمنیاں کے سامنے آکر ڈوب گئی تھی، لیکن حضرت شیخ سلطان کی دعا کی برکت سے وہ ڈوبی ہوئی کشتی دوبارہ سطح آب پر نظر آئی۔ شیخ کی اسی کرامت سے متاثر ہو کر گھنشیام نے مذہب اسلام قبول کر لیا۔

ان کے علاوہ سید شاہ مسیح الدین بخاری شطاری فارسی اور اردو دونوں ہی زبانوں کے مستند شاعر تھے۔ ان کا تخلص حسن تھا۔ تقریباً 70 سال تک علم و ادب کی خدمت کرتے رہے۔ جناب حسن بخاری شطاریؒ کی اردو شاعری اردو زبان کی قدیم ترین شاعری کا نمونہ ہے۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ تاریخ کے صفحات میں ان کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ تذکرہ نگاروں اور تاریخ نویسوں نے یہاں تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی۔

شاہ غلام قلندر جن کا تخلص قلندر تھا۔ ان کا قیام زیادہ تر دہلی میں رہتا تھا۔ یہ تیگھڑا ضلع بیگوسرائے کے باشندہ اور حضرت میر محمد اسلم علیہ الرحمہ کے مرید تھے۔

جناب مولوی سید زین العابدین جن کا تخلص حیرت باروی تھا، آپ ضلع بیگوسرائے کے موضع بارو میں 1846 میں پیدا ہوئے، آپ کا اصل گھر پٹنہ ضلع میں تھا۔ حکیم سید زین العابدین نہ صرف ایک نامور حکیم تھے بلکہ ایک صاحب دیوان شاعر بھی تھے۔ موصوف کے دیوان کا زیادہ تر حصہ غزلوں پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ اس دیوان میں حمد، نعت، قصیدہ، قطعہ، موضوعاتی نظمیں اور سہرا بھی موجود ہے۔

ارشد علی جن کا تخلص ساغر تھا۔ ضلع بیگوسرائے میں جس زمانے میں آپ نے شعور کی آنکھیں کھولیں اس وقت وہاں شاعری کا چرچا بہت عام تھا۔ کافی ذی علم اور نہایت ذہین تھے۔ یہ فی البدیہہ شاعری کیا کرتے تھے۔ انھوں نے بہت ساری غزلیں لکھیں، لیکن اپنے کلام کی حفاظت کا کبھی انھوں نے خیال نہ کیا۔ ان سب کے علاوہ بہت سے شعرا اور نثر نگار ہیں جن کی ایک طویل فہرست ہے، جن سب کا ذکر تبصرے میں لانا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ کتاب کی ترتیب و تزئین اور پیشکش بہت ہی عمدہ اور جاذب نظر ہے۔ مواد بہت ہی معیاری ہے۔ ہمیں امید ہے کہ فاروق الزماں کی یہ کاوش بہت مقبول عام ہوگی۔

ستاروں سے آگے

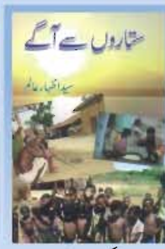

مصنف وناشر: سید اظہار عالم

صفحات: 171 قیمت: 500 سو روپے

مبصر: عمران عاکف خان 85، ڈیگ گیٹ،
گلپاڑہ، بھرتپور (راجستھان)

آج کل نہ جانے کیوں کتابیں لکھنے اور دھڑ ادھڑ چھپوانے کی ہوڑ سی لگی ہوئی ہے۔ جوں ہی کسی صاحب کو ذرا سی فرصت ملتی ہے وہ سب سے پہلے صاحب کتاب بننے اور اسے چھپوانے کی تگ ودو میں لگ جاتا ہے۔ زیر نظر کتاب ستاروں سے آگے' عجلت میں لکھی گئی تحریر کی عمدہ مثال ہے۔ پروف کی غلطیوں سے پُر یہ کتاب ناول یا ناولٹ کے معیار پر بھی پوری نہیں اترتی مگر اسے ناول کے انداز پر لکھا گیا ہے۔ اس میں پلاٹ بھی ہے اور کردار بھی، اسلوب بھی ہے اور طرز بھی۔ اسی طرح اس میں ہمارے اردو ناولوں کی اہم خاصیت یعنی گاؤں اور سماج کے مسائل بھی ہیں اور طبقاتی عدم مساوات بھی۔ بڑے لوگوں کے ہاتھوں غریب طبقات کا استحصال بھی اس میں دکھایا گیا ہے اور کمزور طبقات کی ناموس کی عصمت دری کے سانحے بھی اس میں ہیں۔ اسی طرح اس میں وقت کی تیز رفتاری اور مفاد پرستی کا بھی جا بجا ذکر ہے مگر ان تمام باتوں کے باوجود اس کتاب کو ناول یا ناولٹ کہنے کو دل نہیں مانتا۔ بحیثیت قاری میں اسے ایک طویل افسانۂ حیات ہی کہہ سکتا ہوں۔ تاہم اس کتاب کا سرورق اور پشت ورق بہت شاندار و معنی خیز ہیں جنھوں نے کتاب کے موضوع کا بہت حد تک دفاع کیا ہے۔ سرورق پر گاؤں کی تصویر ہے، کچے اور نیم پختہ مکانوں کا عکس، گاؤں کی معاشرت، کیچڑ میں لت پت اور نیم برہنہ بچوں کا غول، زندگی سے جنگ ہار کر بیٹھے بوڑھے۔ پشت ورق پر آسمانوں کی بے کراں وسعتوں میں جگمگاتے ستارے ہیں جنھیں پکڑنے کی ناکام کوشش کی جارہی ہے۔ تاکہ انھیں توڑ کر دنیا کے اندھیروں کو دور کیا جاسکے۔ مگر بھلا ایسا ممکن ہے؟

یہ دونوں اوراق گویا اپنی اپنی تصویروں کے ذریعے کہہ رہے ہیں کہ دیکھیے صاحب! ایک طرف تو زندگی کی یہ تصویریں ہیں اور دوسری جانب ہمارے ملک کی منگل یان اور دیگر ستاروں پر کمند پھینکنے کی جدوجہد ہے۔ آسمانوں کی اور بڑی بڑی باتیں کی جارہی ہیں جب کہ ہمارے زمینی حقائق ناقابل بیان حد تک خراب ہیں۔ ہمارا ملک منگل یان میں زندگی تلاش کررہا ہے جب کہ اس کی زمین میں زندگی کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ گاؤں کے غریبوں کی زمینوں اور املاک کو حکومتیں انڈسٹرائلزیشن کے نام پر ہڑپ کررہی ہیں اور اسے ترقی کا نام دیا جارہا ہے۔ غریبوں کے خون سے یہاں کی پیاسی زمینوں کو سیراب کیا جاتا ہے اور اسے 'وکاس' کا نام دیا جاتا ہے۔ بچے تعلیم سے محروم، عدم تغذیہ کے واقعات، ناکافی کپڑے پہن کر گزر بسر، عام گاؤں کا المیہ ہے مگر اس کی جانب حکومتوں اور رہنمائی کا دعوا کرنے والے اداروں نے توجہ دینا ہی چھوڑ دیا ہے۔ ان تمام المیوں کا ذمے دار کون ہے؟ سوال پیدا ہوتا ہے اور جواب ملتا ہے کوئی نہیں۔ بلکہ یہ تو سرے سے سوال ہی نہیں کیوں کہ حکومتوں اور اعلیٰ طبقات کا معیار الگ ہے اور غریب ہم تک کیوں پہنچیں گے۔

اس کتاب میں خصوصاً بہار کے سیمانچل علاقے کی تصویر کشی کی گئی ہے اور وہاں کے ناگفتہ بہ حالات اور وہاں کے باشندوں کا درد اس میں بیان کیا گیا ہے، نیز نوکر شاہوں اور غریب عوام کے درمیان بڑھتے فاصلوں کا بھی ذکر ہے۔ کس طرح نوکر شاہ معمولی معمولی روکاوٹیں پیش آنے پر کس طرح اپنے فرائض کی ادائیگی میں آنا کانی کرتے ہیں اور غریبوں کے کام کرنے میں کس طرح کاہلی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ جس سے عوام کو متعدد نقصانات اور پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس پہلو پر بھی کامیاب حد تک خامہ فرسائی کی گئی ہے۔

کاش اگر کتاب کو پروف کی غلطیوں سے پاک کر کے شائع کیا جاتا تو اس کا حسن اور دوبالا ہو جاتا اسی طرح اس کی تفہیم اور وسیع ہوتی، نیز اس میں غیر مانوس ناموں یا طرز تحریر سے اجتناب کیا جاتا۔

ممکن ہے مصنف یا ان کے بہی خواہوں کی جانب سے جواب آئے کہ صاحب کتاب چونکہ اردو کے آدمی نہیں ہیں، ایم ایس سی (ریاضی) اور بی ایل ہیں، انھوں نے اس کے باوجود اردو کی خدمت کی ہے۔ تو ان کی خدمت میں مؤدبانہ عرض ہے کہ ناتمام خدمت یا ناقص عمل بسا اوقات بگاڑ اور تباہی کا باعث ہوتا ہے۔ بہر حال مجھے امید ہے کہ اردو حلقوں میں سید اظہار عالم کی اس کاوش کی پذیرائی ہوگی۔

رحمۃ اللعالمین

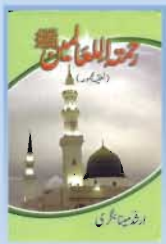

شاعر: ارشد مینا نگری

صفحات: 400، قیمت: 211، سنہ اشاعت: 2014

ناشر: ارشد مینا نگری، سروے نمبر 19 گھر نمبر 51 مالیگاؤں

مبصر: امیر حمزہ L-11/14 حاجی کالونی، غفار منزل، نئی دہلی

ارشد مینا نگری کا تعلق مالیگاؤں جیسے زرخیز علاقے سے ہے۔ اس علاقے میں ایک کہنہ مشق استاد اور زود گو شاعر کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ وہ صرف شاعر ہی نہیں بلکہ ادب اطفال کے ساتھ دیگر اصناف پر بھی طبع آزمائی کرتے چلے آرہے ہیں جس کی بدولت متعدد مضامین قارئین کی نظر سے گزر چکے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان پر یا اور ان کے خصوصی گوشوں پر تقریباً دس رسالے جو میری نظروں سے گزرے ہیں۔ باضابطہ دو کتابیں ان کی شخصیت اور فن پر تحریر کی جاچکی ہیں۔ ایک ڈاکٹر سیفی سرونجی کی کتاب بعنوان 'ارشد مینا نگری کی کتابوں کا تنقیدی جائزہ' اور دوسری ڈاکٹر محبوب راہی کے قلم سے 'ارشد مینا نگری ایک جامع الکمالات قلم کار (فکر وفن کے آئینہ میں)۔ یہ ایک باضابطہ تحقیقی اور تنقیدی کتاب ہے۔ مندرجہ بالا کتابوں اور رسالوں میں ان کی شخصیت اور فن سے متعلق سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ تقریباً 113 شعری اور نثری مجموعے ارشد مینا نگری کے زیر ترتیب بھی ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب ان کی شاعری کی عمدہ مثال ہے۔ جہاں نظم کی روانی، غزل کی چاشنی، رباعی کی حکمت اور گیت کی محبت سب یکجا نظر آتے ہیں۔ اس نعتیہ مجموعے میں انھوں نے ہندوستانی ہیئت کو فوقیت دی یعنی حمد ومناجات کے بعد گیت کے پیکر میں نعت کو پیش کیا ہے پھر نعتیہ نظم میں مثلث، مخمس، مسدس اور مسمط بھی شامل ہیں۔ اس کے بعد مختلف ہیئتوں میں نعتیں پیش کی گئیں ہیں۔

ارشد مینا نگری تمام نعتوں میں اپنی والہانہ وارفتگی، شوق، جذبہ اور حب رسول کو بڑے پر اثر اور خوبصورت انداز میں پیش کرتے ہیں۔ ان نعتوں کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے نعت نبیؐ میں زیادہ تر نبیؐ کے اوصاف بیان کیے ہیں۔ نبیؐ کی ذات تک ہی منحصر رہے ہیں مزید ان کی نعتوں میں اصلاحی اور تبلغی رجحان بھی نظر آتا ہے:

مئے پاکیزہ ملتی ہے نبیؐ کی چشم مستی سے
کسی ساقی سے ہم منت کش چھاگل نہیں ہوتے
جنھیں ہے ضبط کی طاقت انھیں کا عشق عالی ہے
جہاں میں قیس ولیلی کی طرح پاگل نہیں ہوتے

نعت میں بہت ہی زیادہ رطب ویابس کا خیال رکھا جاتا ہے، قدر ومنزلت کے ترازو کو ہمیشہ دھیان سے تھامے رکھنا پڑتا ہے اس معاملے میں ارشد مینا نگری نے خود کو بہت ہی سنبھالے رکھا ہے۔ نعت کہنے کے لیے کچھ صنعتوں سے شاعر خود کو محفوظ بھی رکھتا ہے۔

حقیقت بیانی کو ترجیح دینی پڑتی ہے جس کے لیے خصوصاً قرآن وحدیث کی جانب رجوع ہونا پڑتا ہے۔ معانی ومفاہیم کی وسعت سے شاعر کو مستفید ہونا پڑتا ہے خصوصاً اس محتاط صنف سخن میں جس قدر وسعت مفاہیم سے نعتیہ شاعری کو مزین کیا جاسکتا ہے ارشد مینانگری نے اس کو اپنی شاعری میں جابجا پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس اعتبار سے ان کی یہ نعتیہ شاعری اپنے اندر بہت ہی گیرائی اور گہرائی لیے ہوئے ہے۔

اس تبصرے میں ایک بات میں شاعر ارشد مینانگری سے خصوصاً اور ان کے معاونین سے عموماً کرنا چاہتا ہوں کہ کتاب کے نام کی تجویز بہت ہی عمدہ ہے لیکن اس کے املا میں چھوٹی سی صریح غلطی ہوئی ہے۔ کتاب کا نام 'رحمۃ اللعالمین' رکھا گیا ہے اس میں تائے مدورہ اور لام کے بیچ میں الف زائد ہے جو قرآن کریم کے رسم الخط سے مطابقت نہیں رکھتا ہے۔ قرآن پاک میں اس طرح لکھا ہوا ہے 'وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین' (سورۃ انبیاء، آیت نمبر 107)

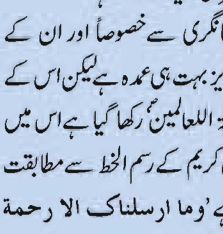

ریت میں گمشدہ لفظ

مصنف: محمود شاہد

صفحات: 128، قیمت: 150 روپے

ناشر: وسیلہ پبلی کیشنز، ایم آر اسٹریٹ، آندھرا پردیش

مبصر: جاوید حسن، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

پیش نظر کتاب 'ریت میں گمشدہ لفظ' محمود شاہد کے مضامین کا مجموعہ ہے جو آندھرا پردیش اردو اکادمی کے جزوی مالی تعاون سے شائع ہوئی ہے۔ 128 صفحات پر مشتمل اس کتاب میں مختلف عنوانات سے 18 متفرق مضامین شامل ہیں۔ کتاب کے آخری صفحے پر مصنف کی دیگر کتابوں کی فہرست ہے۔ کتاب کا انتساب دلچسپ اور شاعرانہ ہے: 'صحرا کی ان فضاؤں کے نام جو موسم گرما میں شعلہ بار ہوجاتی ہیں اور موسم سرما میں برف پوش!'

کتاب میں شامل مضامین کے بارے میں مصنف خود لکھتے ہیں کہ اس میں شامل مضامین ہندو پاک کے ان قلم کاروں کے ہیں جن سے ان کی ملاقات سعودی عرب میں قیام کے دوران مختلف ادبی محفلوں میں ہوئی تھی۔ یہ ایک طرح سے سعودی میں یا یوں کہیں کہ مشرق وسطیٰ میں مقیم اردو کے متعدد شاعروں، افسانہ نگاروں، ناقدوں اور صحافیوں کی زندگی اور ان کی ادبی خدمات کے بارے میں ہمیں معلومات فراہم کرتے ہیں بلکہ ان مضامین میں ان کی شخصیت کے چند نادر اور اہم گوشوں کو بھی اجاگر کرتے ہوئے مدلل گفتگو کی گئی ہے۔ یہ سارے تخلیق کار وادیٔ ادب میں نئے اور تازہ کار ہیں۔ ان مضامین کے مطالعے سے خاص طور پر خلیج میں سکونت پذیر ادباوشعراء، کے این واصف، فہیم جاوید، اقبال فرید میسوری، زین صدیقی، دلشاد نظمی، سہیل ثاقب، اقبال احمد قمر، سعید نظر، شفیق ندوی، پرویز اختر، طارق بٹ اور واحد محسن وغیرہ کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ان میں زیادہ تر افراد شاعر ہیں چنانچہ مصنف نے ان کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے اور ان حضرات کو بہ حسن وخوبی ادبی دنیا میں متعارف کرانے کی کوشش کی ہے۔ ان اصحاب کے بارے میں لکھتے ہوئے وہ ایسا عنوان قائم کرتے ہیں جس سے ان کے بارے میں پتہ چل جاتا ہے کہ وہ کون ہیں؟ یہ مصنف کی خوبی ہے۔ مثال کے طور پر کے این واصف کے بارے میں لکھتے ہیں: 'کے این واصف، ذہین عکاس، حساس صحافی، مخلص ادیب'۔ اسی طرح سے دوسرے بہت سے عنوانات اس کتاب میں ہیں جیسے:

'تخلیقی تربیت وتہذیب کا شاعر اقبال احمد قمر'، 'مانوس فضا، آشنا ماحول اور شناسا کیفیت کا شاعر پرویز اختر'۔

پیش لفظ کی جگہ 'پُرال ف اظ!' لکھا ہے جس میں مختصر مگر جامع طور پر مضامین کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ اسی حصے میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ: 'زیر نظر کتاب خصوصاً خلیج میں مقیم تارکین وطن قلم کاروں کے ادب کو اور مجموعی طور پر معاصر ادب کے جدید رجحانات کو سمجھنے میں معاون ثابت ہوگی'۔

ہندوستانی شعرا کے بارے میں انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار بے باکی سے کیا ہے اور یہ امید ظاہر کی ہے کہ ان کے اشعار کے اجالے سے اردو ادب میں نئی سحر کا آغاز ہوگا۔ مختلف مضامین میں فہیم جاوید، دلشاد نظمی، سعید نظر، شفیق ندوی، ثروت زیدی اور اقبال فرید میسوری وغیرہ کی شاعری پر قدرے اختصار اور جامعیت کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ مصنف نے ان مضامین میں ہندو پاک کے زیادہ تر شعرا کو عمدہ طریقے سے یا کہنا چاہیے کہ روایتی طریقے سے الگ ہٹ کر متعارف کرانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ ہندوستانی شعرا کے بعد پاکستانی شعرا میں زین صدیقی، طارق محمود، سہیل ثاقب، اقبال احمد قمر، پرویز اختر اور طارق بٹ وغیرہ کی شاعری پر گفتگو کی گئی ہے، جس سے مصنف کی ناقدانہ بصیرت اور تنقیدی شعور کا پتہ چلتا ہے۔

واحد محسن (ممبئی) کی شاعری پر مصنف نے ناقدانہ نظر ڈالی ہے اور ان کی شاعری کے بعض اہم پہلوؤں کو روشن کیا ہے۔ کتاب کے آخر میں 'کڑپہ میں اردو نثر' کے عنوان سے ایک مضمون اور 'اردو ڈرامے کے فروغ میں منجو قمر کا حصہ' کے عنوان سے ایک تبصرہ بھی شامل کتاب ہے۔ بحیثیت مجموعی لکھنے والوں کا ایک جامع تعارف اس میں پیش کیا گیا ہے اور آخر میں مضمون کی تیاری میں معاون کتابوں اور لوگوں کا شکریہ ہے۔ اپنے تبصرے میں محمود شاہد نے لکھا ہے کہ اردو میں ڈرامے کے فروغ میں منجو قمر کا کردار ناقابل فراموش ہے اور ان پر مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔ کتاب کے آخری صفحے پر ان کتابوں کا ذکر ہے جو مصنف اور ان کے اہل خانہ (والد محترم اور برادر عزیز) کی لکھی ہوئی ہیں جس کا عنوان ہے 'میرے گھر کی کتابیں'۔ اس فہرست میں مصنف کی ایک زیر ترتیب کتاب 'حرف ریزے' کا بھی ذکر ہے۔ مجموعی اعتبار سے محمود شاہد کے مضامین کا مجموعہ 'ریت میں گم شدہ لفظ' کئی اعتبار سے منفرد ہے۔ کتاب میں موجود سارے مضامین اُن کی جملہ صلاحیتوں کے غماز ہیں۔

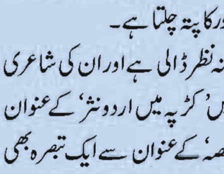

صدارت تمھاری مصیبت ہماری

مصنف: آصف سبحانی

صفحات: 120، قیمت: 150 روپے، سنہ اشاعت: 2014

مبصر: گلشن، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

اردو ادب کے طنز و مزاح کے جوہر دکھانے میں جن اہم تخلیق کاروں اور قلمکاروں نے طبع آزمائی کی ہے۔ ان میں ایک نام 'آصف سبحانی' کا ہے۔ وہ بیک وقت کاتب، انشائیہ نگار، صحافی اور ڈرامہ نگار بھی ہیں۔ انھوں نے طالب علمی ہی کے زمانے میں فن کتابت کو بطور ذریعہ معاش اختیار کیا اور اس کامیابی پر مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادمی کی جانب سے 1998 میں 'خوش نویسی اور تزئین کاری کا ایوارڈ' بھی ملا۔ پھر اسی دوران 'چورن' مینوفیکچرنگ کمپنی میں بحیثیت کاتب ان کی شمولیت ہوئی، جس میں طنز و مزاح کے جوہر مزید نکھرے۔ 'چورن' اخبار کے بند ہونے کے بعد ہفت روزہ 'پرنس' سے جڑ گئے اور ادارت کی ذمے داری سنبھالی۔ اور 'پرنس' کے کالم 'ہیلو شیطان اسپیکنگ' میں پابندی سے طنز و مزاح لکھتے رہے۔ ان کی پہلی تخلیق 'زبان توڑ بخار' ہے جو اسی اخبار میں شائع ہوئی۔ پھر یہ 'اردو ٹائمز، بمبئی' کے نامہ نگار نامزد ہوگئے۔ اس کے بعد بھی یہ سلسلہ یونہی جاری رہا اور پونا میں ہفت روزہ 'کاتب' میں بحیثیت مدیر لکھتے رہے۔ چنانچہ ان کا صحافتی دور بہت طویل

رہا۔ اس کے بعد ڈرامہ نگاری کی طرف توجہ کی۔ طالبِ علمی کے زمانے سے یہ ان کے پسندیدہ مشغلوں میں سے ایک تھا۔ انھوں نے بہت سے ڈرامے 'سٹی کالج' میں اسٹیج کیے جن کی اہم خصوصیت مزاحیہ ڈراموں پر مبنی ہے۔ انھیں بیشتر ڈراموں میں بیسٹ ایکٹر، ڈائریکٹر اور رائٹر کے اعزازات سے بھی نوازا گیا۔ یہ مشغلہ آج بھی جاری ہے۔ ان کے لکھے ہوئے وتیار کردہ ڈرامے اسکٹس ممکری، لافٹر شوز، لطائف، نقالی اور فینسی ڈریس وغیرہ شہر اور بیرون میں مختلف ثقافتی تقارب اور گیدرنگ کی نہ صرف زینت بنے بلکہ انھیں 'اسکس لائبریری' کی طرف سے 'مجتبیٰ حسین ایوارڈ' سے بھی نوازہ گیا۔

زیرِتبصرہ کتاب 'صدارت تمھاری مصیبت ہماری' آصف سبحانی کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے جو 'رفاہِ فارم' کے لیے مختلف اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں جن میں ماہنامہ شگوفہ (حیدرآباد)، بے باک (مالیگاؤں)، آج کل (دہلی)، اور گل بوٹے (ممبئی) وغیرہ شامل ہیں جو کتابی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ اس کتاب میں کل 15 مضامین ہیں جو مختلف موضوعات پر مبنی ہیں۔ مذکورہ کتاب میں پہلا مضمون 'اور ماموں جھینپ گئے' ہے۔ جس میں مصنف نے ایک ایسے شخص کا ذکر کیا ہے جو روزہ نہیں رکھتا، کیونکہ ان کا غصہ ان پر غالب رہتا ہے۔ دوسرا مضمون 'حجرت آپ کا ضوتا' ہے۔ کتاب میں شامل ایک مضمون 'لالچ بری بلا ہے (دوسرا حصہ)' ہے جس میں مصنف نے ایک بڑھیا کی مشہور کہانی پیش کی ہے جس نے ایک مرغی پال رکھی تھی جو روزانہ سونے کا انڈا دیتی تھی جسے بیچ کر بڑھیا گزر بسر کرتی تھی۔ سونے کا انڈا بیچ کر وہ حاجت مندوں کی مدد کرتی تھیں، مرغی کو غلط لوگوں سے بچانے کی لیے مرغی پر چاقو پھیر کر ان کے منصوبوں پر پانی پھیر دیا۔ ایک مضمون 'امورِ دنیاداری' ہے۔ جس میں مصنف نے ایک ایسے دسترخوان سے ہماری مہمان نوازی کی ہے جنھیں کھانے کے لیے نہ توروپوں کی ضرورت پیش آئے نہ پکانے کی زحمت اٹھانی پڑے گی، جیسے ہوا کھانا، قسم کھانا، کان کھانا، بھیجہ کھانا، چغلی کھانا، دھوکا کھانا، دھکا کھانا، گالی کھانا، لات کھانا، مار کھانا، ادھار کھانا وغیرہ جیسی مختلف ڈشیں موجود ہیں۔ جسے ہر انسان روزمرہ زندگی میں ضرور چکھتا ہی رہتا ہے۔ مضمون 'صدارت تمھاری مصیبت ہماری' طنز و مزاح نگاری پر مبنی ایک بہترین مضمون ہے جس میں مصنف نے ایک ایسے شخص کی داستان سنائی ہے جسے ایک اسکول میں صدارت کے لیے مدعو کیا جاتا ہے لیکن اسے صدارت نہیں آتی اور وہ مصنف سے مدد مانگتا ہے، اس کی لاعلمی کی وجہ سے مصنف کو بہت سی دشواریوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے، صدارت میں سات دن ہوتے ہیں لیکن وہ مصنف کے دن کا سکون اور رات کا چین سب چھین لیتا ہے، کبھی آفس آکر پریشان کرتا ہے، کبھی دیر رات دو بجے فون کرکے، یہاں تک کہ صدارتی خطبہ بھی لکھواتا ہے۔ اس مضمون کا نام عجیب تو ہے لیکن بالکل سچ ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنی صدارت کو دوسروں کے لیے مصیبت بنا دیتے ہیں۔ اس کتاب میں نہایت ہی دلچسپ مضمون 'مچھر کی ڈائری' جسے مصنف نے مچھّر کی زبانی پیش کیا ہے۔ جس میں مچھّروں کی خصوصیات اور ان کی محنت و مشقت کی نشاندہی کی گئی ہے۔ مصنف نے ان کے ذریعے روزمرہ زندگی کے مسائل اور ماحول کی برائیوں، اس کے معیار، اس میں رہنے والے لوگوں پر بھرپور طنز کیا ہے۔

مختصراً یہ کہ اردو میں مزاحیہ مضامین کے حوالے سے آصف سُبحانی کا ایک اہم نام ہے۔ اور ان کے کئی مضامین شائع ہوکر مقبولِ عام ہو چکے ہیں اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے اطراف و جوانب میں رونما ہونے والے واقعات کو کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہیں اور اس پر لکھتے بھی ہیں اور ان میں شگفتگی، سلاست و روانی، پُر لطف اور انوکھی تشبیہات، بامحاورہ مقفّیٰ و انگریزی الفاظ اور موقع و محل کے مطابق اشعار کے استعمال سے جو خوبصورتی اور چاشنی پیدا ہوتی ہے اس سے قاری کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ جاتی ہے۔

اردو درس و تدریس

مصنف/ ناشر: ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی
صفحات: 270، قیمت: 250، تیسرا ایڈیشن: 2014
مبصر: ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی، صدر شعبۂ اردو،
گورنمنٹ ڈگری کالج، کاروار (کرناٹک)

عصرِ حاضر میں اردو کا مسئلہ بنیادی طور پر لسانی و تعلیمی مسئلہ ہے، تعلیمی شعبے میں اس وقت اردو کو جو خطرات لاحق ہیں، ان پر لوگوں کی توجہ کم ہے اور ثانوی مسائل پر ہماری توانائیاں زیادہ صرف ہو رہی ہیں۔ ظاہر ہے بنیادی مسائل سے پہلو تہی اردو کے حال و مستقبل پر سوالیہ نشان لگاتی جارہی ہے۔ آج اردو کے تمام مسائل کا واحد اور بنیادی حل پرائمری اور سکنڈری اسکول کی سطح پر اردو درس و تدریس اور تعلیم و تربیت کا معیاری اور منصوبہ بند انداز میں انتظام ہے۔ موجودہ حالات میں اردو کے لیے سب سے بڑا چیلنج اس کی تعلیم و تدریس کا معیاری ہونا ہے۔ افسوس ہے کہ اردو کے بہی خواہ، دانشور اور سیاسی و سماجی رہنما اردو زبان کی بنیادی تعلیم کی طرف اس انداز سے متوجہ نہیں ہو رہے ہیں۔ جیسا کہ اردو کی بقا اور فروغ کے لیے ضروری ہے۔

اُردو کی موجودہ صورت حال پر گفتگو کرتے ہوئے عام طور سے اردو اساتذہ کو موردِ الزام ٹھہرایا جاتا ہے مگر اس سلسلے میں ان کی عملی دشواریوں کو دور کرنے یا بہ حیثیت سرپرست، بہ حیثیت انتظامیہ اور بہ حیثیت طالب علم اپنی اپنی ذمے داریاں ادا کرنے کی کوئی فکر نہیں کی جاتی۔ ڈاکٹر عزیز اللہ شیرانی یقیناً تمام محبان اردو کی جانب سے لائق تحسین و تبریک ہیں جنھوں نے اردو اساتذہ کی اس بنیادی ضرورت کی طرف توجہ دی اور ان کی تدریسی رہنمائی کے لیے ایک بہترین کتاب مرتب کرڈالی، جس میں بہت ہی پرکشش اور سہل اسلوب میں تدریسی نکتے بیان کیے گئے ہیں۔ مصنف کا تعلق ریاست راجستھان کے تاریخی شہر ٹونک سے ہے، جہاں وہ محکمہ ایڈلٹ ایجوکیشن میں لٹریسی ایجوکیشن آفیسر اور محکمہ تعلیم میں لکچرر اور پرنسپل کے عہدے پر فائز رہ کر اردو درس و تدریس اور اردو اساتذہ کو ٹریننگ دینے کا طویل تجربہ بھی رکھتے ہیں۔

ڈاکٹر عزیز اللہ قریشی کی اردو زبان و ادب کے حوالے سے سات کتابیں، ادراک ادب، راجستھان میں اردو تراجم، ادبیات راجستھان، تذکرہ معاصر شعرائے ٹونک، سنگ زر اور زخموں کے پھول کے نام سے دو افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ تعلیم بالغان کے مقصد سے 'آؤ ہم پڑھیں' چار جلدوں میں اور سکنڈری ایجوکیشن بورڈ راجستھان کے نویں سے بارہویں درجات کے لیے چھ کتابیں بھی تیار کی ہیں۔ اس طرح اردو زبان و ادب کی تعلیم و تدریس اور تصنیف و تالیف کا آپ کو طویل عملی تجربہ رہا ہے۔

زیرنظر کتاب 'اردو درس و تدریس' دراصل مصنف کی طویل تعلیمی خدمات اور پیشہ ورانہ عملی مہارت اور تجربات کا نچوڑ ہے۔ یہ کتاب بظاہر بی ایڈ اور ٹی سی ایچ کے ان طلبا کے لیے تحریر کی گئی ہے جو عنقریب اردو ٹیچر بننے والے ہیں۔ یقیناً اس کتاب کے ذریعے تعلیم کے طلبا اپنے امتحان میں کامیابی حاصل کریں گے، مگر میرے نزدیک یہ کتاب اردو معلمین کے ساتھ ساتھ بچوں کے سرپرستوں اور ان تمام لوگوں کے لیے بھی یکساں طور سے مفید ہے جو کسی نہ کسی حیثیت سے شعبۂ تعلیم سے منسلک ہیں اور اپنے بچوں کو فطری انداز سے اردو کی تعلیم دینا چاہتے ہیں۔

مصنف نے پوری کتاب کو پانچ یونٹ اور 36 مرکزی عنوانات کے تحت پیش کیا ہے جس میں اردو زبان کی تدریس کے مقاصد، زبان کی مہارتیں اور تدریسی نکات، اردو زبان کی تاریخ، دوسری زبانوں سے اس کا رشتہ، زبان کی ابتدا سے متعلق مختلف نظریات، مروجہ تعلیمی نظام، اردو تدریس کی اہمیت و نوعیت، اردو مدرس کے فرائض، ادب کی مختلف اصناف کی

تدریس کا طریقہ، اصناف شاعری کی تدریس، افسانوی ادب کی تدریس، تدریس کی معاون اشیا، تدریس کی صورتیں، تدریس بذریعہ سوالات، تدریس کے لیے منصوبہ بندی اور تدریس میں اندازۂ قدر وغیرہ جیسے موضوعات پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ اگر اردو اساتذہ ان مضامین کا بغور مطالعہ کریں اور عملی مشق میں ان نکات کو مشعل راہ بنائیں تو ان کے طریقۂ تدریس میں ایک انقلابی اور نتیجہ خیز تبدیلی محسوس کی جاسکتی ہے۔ اردو میں ایسی تکنیکی کتابیں بہت کم ملتی ہیں، لہٰذا کتاب اور مصنف کتاب کی جتنی بھی پذیرائی کی جائے کم ہے۔

اس کتاب میں ایک جگہ اصول تعلیم اور زبان اردو کے ذریعے اخلاقی اقدار کی ترسیل کے موضوع پر بھی مختصراً گفتگو کی گئی ہے۔ میرے خیال میں دو کتابیں اس سلسلے میں موضوع کی مناسبت اور کتاب کی اہمیت ونوعیت کے لحاظ سے بہت مفید ہیں اور بجا طور سے اردو دنیا میں بے حد معوف ومقبول ہیں۔ (1) خواجہ غلام السیدین کی کتاب 'اصول تعلیم' ناشر ترقی اردو بیورو، نئی دہلی (2) افضل حسین مرحوم کی کتاب 'بچوں کی تعلیم وتربیت' ناشر مرکزی مکتبہ اسلامی نئی دہلی۔ اگر مصنف کے پیش نظر آئندہ اس کتاب کی نظر ثانی کے وقت یہ دونوں کتابیں بھی رہیں تو کتاب اس پہلو سے بھی مزید مفید اور بامعنی ہوجائے گی۔

آخر میں اردو زبان کے امتحان میں اندازۂ قدر کے لیے معروضی سوالات کے سلسلے میں مجھے ایک بات عرض کرنی ہے کہ ان دنوں ابتدائی اور ثانوی درجات میں زبان کے پرچے میں معروضی سوالات (Objective type) میرے خیال میں قطعاً مفید نہیں۔ اعلیٰ درجات کے مقابلاتی امتحانات کے لیے تو یہ مناسب ومفید ہوسکتا ہے۔ لیکن چھوٹے بچوں خصوصاً زبان دانی میں یہ طریقہ امتحان کسی طرح مناسب نہیں۔ اس طرح سے بچے نمبر تو بہت زیادہ لاتے ہیں مگر انھیں صفحہ دو صفحہ اچھی اردو لکھنی نہیں آتی۔ یوں بھی چھوٹے بچوں کو اردو پڑھنے سے زیادہ اردو لکھنے کی مشق پر زور دینا چاہیے اور تحریری استعداد پیدا کرنے کے لیے امتحان میں معروضی سوالات دینے سے حتی الامکان پرہیز کرنے یا پھر اسے بہت محدود کرنے کی اشد ضرورت ہے۔

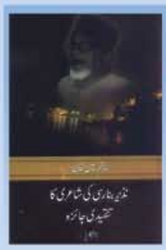

نذیر بنارسی کی شاعری کا تنقیدی جائزہ

مصنف: ناظر حسین خان

صفحات: 184، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2014

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی

مبصر: قرۃ العین (پی 112 بٹلہ ہاؤس نئی دہلی 25

زیر تبصرہ کتاب، نذیر احمد بنارسی کی شاعری کا تنقیدی جائزہ، ناظر حسین کی تصنیف ہے۔ اس کتاب میں نذیر بنارسی کی شخصیت، شاعری اور ان کے عہد سے متعلق باتیں کی گئی ہیں۔ نذیر بنارسی کا تعلق ایک ایسے شہر سے ہے جہاں کی صبح نرالی ہوتی ہے۔ جسے شاعروں اور تخلیق کاروں نے اپنی تخلیق اور شاعری کو جلا بخشی وہ شہر بنارس ہے۔ جو زمانۂ قدیم سے ہی ادیبوں اور فن کاروں کا مرکز توجہ رہا ہے۔ شاعری نثر تنقید وتحقیق کے میدان میں بنارس کے شاعروں اور ادیبوں نے قابل قدر کارنامے انجام دیے ہیں جنھیں بھلایا نہیں جاسکتا ہے۔ اردو اور ہندی دونوں زبانیں اس شہر میں ساتھ ساتھ پلی بڑھیں اور دونون ہی زبانوں کے علما نے اس شہر کے وقار کو بلند کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ اسی سلسلے کی کڑی نذیر بنارسی بھی ہیں۔ قومی شاعروں کی فہرست میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ جن کی مدت حیات 11 نومبر 1909 تا 23 مارچ 1996 پر محیط ہے۔ اس دوران انھوں نے بہت سی ادبی، سیاسی اور تہذیبی اتار چڑھاؤ دیکھا جس کا اثر ان کی شاعری میں بیشتر مقام پر دیکھا جاسکتا ہے۔ 184 صفحات پر مشتمل اس کتاب کو مصنف نے مفید تر بنانے کے اسے چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

پہلے حصے میں نذیر بنارسی کی شخصیت کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔ جن میں ان کے والدین آباواجداد کے پیشے، نذیر بنارسی کے بھائی، بہن، تعلیم وتربیت، بچپن کی شرارتیں اور گھر کا ماحول وغیرہ کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں قومی شاعری کی روایت کو پیش کیا گیا ہے۔ شاعروں کی فہرست میں امیر خسرو، قلی قطب شاہ، ولی، فائز، شاہ مبارک، آرزو، نظیر اکبرآبادی، بہادر شاہ ظفر، واجد علی شاہ، منیر شکوہ آبادی، داغ دہلوی، الطاف حسین حالی، اسماعیل میرٹھی، اکبر الہ آبادی، ظفر علی خاں، برج نارائن چکبست وغیرہ کی شاعری کا تنقیدی و تجزیاتی جائزہ لیتے ہوئے ان شعرا کے کلام میں حب الوطنی کے تلاش کی سعی کی گئی ہے۔ تیسرے حصے میں نذیر بنارسی کے ہم عصر شعرا میں محمد علی جوہر، حسرت موہانی، جگر مرادآبادی۔ فراق گورکھپوری، جوش ملیح آبادی، اسرار الحق مجاز، حفیظ جالندھری، مخدوم محی الدین، فیض احمد فیض، علی سردار جعفری، وامق جونپوری، جاں نثار اختر، جگن ناتھ آزاد، مجروح سلطان پوری اور سلام مچھلی شہری وغیرہ کی شاعری کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ جبکہ چوتھے حصے میں نذیر بنارسی کے شعری مجموعے، گنگ وجمن، جواہر سے لال تک، غلامی سے آزادی دل تک، کتاب غزل اور راشٹر کی امانت راشٹر کے حوالے وغیرہ کا تنقیدی وتجزیاتی مطالعے کی کوشش کی گئی ہے اور اس کے فنی وفکری خوبیوں اور خامیوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

پیش نظر کتاب کے مصنف مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایک ایسے گمنام شاعر پر قلم اٹھایا اور ان کو حیات جاوداں بخشنے کی کوشش کی۔ ابھی تک ایسا کوئی کام نہیں ہوا ہے جس کے ذریعہ اہل علم کو ان کی بیش بہا ادبی خدمات سے روشناس کرایا جاسکے۔ یہ کتاب اس لیے بھی اہم ہے کہ نذیر بنارسی پر کوئی قابل ذکر کتاب نہیں آئی جو ان کی ہمہ جہت شخصیت کا احاطہ کرسکے۔ یہ کتاب ایسی ہے جو علمی وادبی کام کرنے والوں کے لیے مفید ثابت ہوگی۔ امید ہے کہ ادبی حلقوں میں اس کی پذیرائی ہوگی۔

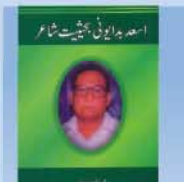

اسعد بدایونی بحیثیت شاعر

مصنف/ ناشر: محمد رضوان خان

صفحات: 171، قیمت: 150 روپے

مبصر: ڈاکٹر علاء الدین خان، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

1970 کے بعد جن شعرا نے اردو زبان وادب کی کلاسیکی روایت کا پاس رکھتے ہوئے نئے لب ولہجے کو اختیار کرکے اپنی شاعری کو نئی معنویت عطا کی ان میں اسعد بدایونی ایک اہم نام ہے۔ 'اسعد بدایونی بحیثیت شاعر' محمد رضوان خان کی پہلی ادبی کاوش ہے جس میں اسعد بدایونی کی شخصیت اور شاعری کے مختلف جہات اور ان کے معاصر غزل گو شعرا کا محاکمہ کیا گیا ہے۔ میری دانست میں اسعد بدایونی پر یہ پہلی باضابطہ کتاب ہے۔ یہ کتاب چار ابواب اور منتخب غزلوں پر مشتمل ہے۔

باب اول میں اسعد بدایونی کے حالات زندگی کے تحت، پیدائش، ماحول، تعلیم، تصانیف، وفات، ایوارڈ واعزاز وغیرہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے تاکہ اسعد بدایونی پر جب گفتگو کی جائے تو ایک ایسا خاکہ ذہن میں مرتب ہوجائے جن سے ان کی شاعری کو سمجھنے میں مدد مل سکے۔ اقتباس دیکھیے: ''اسعد بدایونی طبعاً بہت ہی خلیق اور خوش مزاج واقع ہوئے تھے۔ حق گو اور حق پسند انسان تھے، انسانیت نواز بھی تھے ان کو صحافت سے دلچسپی تھی اور ادب کی دنیا میں کچھ نیا کرگزرنے کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ افسوس کہ اس ہونہار سپوت سے وابستہ توقعات کو برآنے کا موقع نہ مل سکا۔ پینتالیس برس کی عمر میں وہ 5 مارچ 2003 کو مالک حقیقی سے جاملے۔'' (ص: 27)

باب دوم میں اسعد کی غزل گوئی کو موضوع بنایا گیا ہے اور انھیں قدیم وجدید کے امتزاج سے ایک نئے طرز کا بانی قرار دیا گیا ہے اور ان کی شاعری کو محسوسات کی شاعری

تصور کرتے ہوئے اس بات کا اظہار کیا گیا ہے کہ اسعد بدایونی الفاظ کو مسخر کرنے کا ہنر خوب جانتے تھے۔ نیز شہری زندگی نے انسان کو جس طرح خود غرض، سفاک اور مشینی بنا دیا ہے اس کا اظہار اسعد نے اپنے اشعار میں جس طرح کیا ہے ان پر تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔

اسعد بدایونی کی شاعری کی اہم خوبیاں جو انھیں دوسرے معاصر شعرا سے ممتاز کرتی ہیں وہ ان کی انا پسندی، جذبۂ عشق، تصور فنا اور داستانی غزل ہے، ان سبھی پر مصنف نے تفصیل سے گفتگو کی ہے اور اشعار کے حوالے سے اپنی بات کو مدلل بنانے کی کوشش کی ہے۔ اشعار دیکھیے:

مری انا مرے دشمن کو تازیانہ ہے   اسی چراغ سے روشن غریب خانہ ہے
کون لے جاتا ہے آنکھوں سے نظاروں کا جمال   بیٹھے بیٹھے ترکِ دنیا کا خیال آتا ہے کیوں
قصہ خوانی کا جنوں اب تک لہو میں زندہ ہے   داستانیں یاد آتی ہیں الاؤ دیکھ کر

باب سوم میں اسعد بدایونی کی نظم نگاری کا احاطہ کرتے ہوئے اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اگر چہ اسعد بدایونی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں لیکن انھوں نے نظمیں بھی کہی ہیں جن کی تعداد 22 ہے۔ یہ تمام نظمیں آزاد نظم کی ہیئت میں ہیں۔

دوسرے مجموعۂ کلام 'دھوپ کی سرحد' میں صرف غزلیں ہی غزلیں شامل ہیں۔ البتہ تیسرے مجموعۂ کلام 'خیمۂ خواب' جس میں 15 آزاد نظمیں ہیں جو 1984 میں منظر عام پر آیا۔ چوتھا مجموعۂ کلام 'جنوں کنارہ' 1992 میں شائع ہوا اس میں سات نظمیں ہیں۔ ان نظموں کا موضوع ذاتی تجربات اور مشاہدات پر مبنی ہے۔ چوتھے باب میں اسعد بدایونی کے معاصر شعرا شہپر رسول، عبدالاحد ساز، فرحت احساس، مہتاب حیدر نقوی، ارشد عبدالحمید وغیرہ کی شاعری کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے ان میں اسعد کی معنویت کو اجاگر کیا ہے۔

اسعد بدایونی کو جدید شعرا میں اہم مقام حاصل ہے اس کے باوجود ان پر آج تک نہ کوئی کتاب آئی اور نہ ہی کسی نے ایسے شاعر کو لائق اعتنا جانا۔ البتہ گاہے بہ گاہے کچھ مضامین ان کی شاعری کے حوالے سے لکھے گئے۔ اس لیے مصنف کی کوشش لائق تحسین ہے۔ اس کتاب سے اسعد بدایونی کی ایک ایسی تصویر ابھرتی ہے جو آنے والی نسلوں کو مزید تحریک عطا کرے گی کہ وہ اس شاعر پر کچھ نیا لکھنے کی طرف مائل ہوں۔

آخر میں ان کی منتخب 29 غزلیں شامل کی گئی ہیں تا کہ اس کی قرأت سے اسعد بدایونی کی شاعری کی جملہ خوبیاں اجاگر ہوسکیں۔ اور اسعد بدایونی کی تعیین قدر کی جا سکے۔ کتاب کے فلیپ پر شمس الرحمٰن فاروقی کی اسعد کی داستانی غزل کے حوالے سے بہت ہی اچھی آرا شامل ہیں اور کتاب کے بیک کور پر ڈاکٹر ابو بکر عباد نے نہایت ہی معتدل خیال کا اظہار کیا ہے جو قابل ستائش ہے۔

فیوضات وزیریه

مصنف: وجیہ الدین احمد
صفحات: 232، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: فروری 2014
ناشر: مکتبہ وزیریہ، رامپور (یوپی)
مبصر: محمد سیف اللہ قاسمی، استاذ مدرسہ اصلاح المسلمین سرکاڈیہہ، دھنباد

مولانا شاہ وجیہ الدین احمد یوں تو حدیث و تفسیر اسلامی عقائد و تعلیمات اور شعر و سخن کے موضوع پر ان کی بکثرت تصانیف ہیں لیکن ان میں سے ایک اہم تصنیف 'فیوضات وزیریہ' ہے، جو حلقۂ ارادت سے وابستگان کے لیے تعلیمات تصوف کے موضوع پر لکھی گئی ہے۔ مولف محترم کو اللہ تعالیٰ نے جملہ علوم و فنون کا جامع بنایا تھا اور وہ حدیث و تفسیر فقہ و ادب، معقولات و منقولات پر یکساں درک و کمال رکھتے تھے۔ فصاحت و بلاغت، طلاقت و سلاست کے ذریعے اپنے مریدوں اور بندگان خدا کی تشنگی دور کرنے اور ان کو راہ راست کی طرف راہنمائی کرنے کی وجہ سے مرجع خلائق بنے ہوئے تھے، انھوں نے علوم ظاہری کی تکمیل دارالعلوم دیوبند سے 28 رجب 1340ھ مطابق 28 مارچ 1922 میں حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی نگرانی میں کی۔

اور باطنی علوم کا اکتساب قبلۂ عالم حضرت مولانا شاہ وزیر محمد خان صاحب سے کیا اور باشارۃً و دلالۃً انھیں سے اور بصراحۃ اجازت بیعت مولانا شاہ ممتاز حسین قادری مجددیؒ سے حاصل ہوئی جو مولانا شاہ وزیر محمد خان صاحب کے صاحب سجادہ تھے۔

تصوف کے موضوع پر یہ کتاب یقیناً سالکین متوسّلین اور عوام و خواص کے لیے اسرار و معرفت کا خزینہ ہے سلاسل اربعہ کی توضیح و تشریح پھر سلسلہ عالیہ قادریہ کی وجہ ترجیح ولایت و تصوف کے اقسام اور دین و شریعت میں اس کا مقام وحدت الوجود اور وحدت الشہود وغیرہ کے عناوین سے مزین یہ رسالہ اپنے فن کی بہترین تصنیف اور مولف محترم کا اسلامی تصوف کے موضوع پر بہترین شاہکار ہے۔

چونکہ آج مسلمانوں کے دلوں سے علمائے کرام اور صوفیائے عظام کی عقیدت و محبت ختم ہونے لگی ہے اور جدید طبقہ مسجدوں بالخصوص خانقاہوں سے متنفر ہو رہا ہے نیز اپنی روشن خیالی کے زعم میں دین متین کے اس مضبوط قلعے کو رکیک شکوک و شبہات کے ذریعے کمزور کرنے بلکہ سرے سے ڈھا دینے کی سعی لا حاصل کر رہے ہیں انھیں کیا معلوم کے تصوف کی خاموش لہروں نے کفر و شرک کی بنیادوں کو ہلا کر کس طرح اس کی شب دیجور کو روشن کیا ہے اور لاکھوں گم کردہ راہوں کو منزل تک پہنچایا ہے یقیناً تصوف بقول مجدد الف ثانی ''اعتقاد، عمل اور اخلاص کے مجموعے کا نام ہے جو تعلیمات نبویہ کا خلاصہ اور نچوڑ ہے جب تک اس مجموعہ ثلاثہ پر عمل نہ ہو ایمان میں کمال حاصل نہیں ہوسکتا۔'' (فیوضات وزیریہ، ص 40)

اس اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تصوف ان تمام افعال مرضیہ کا نام ہے جو مختلف انبیا علیہ السلام کے لیے خصوصیت اور ما بہ الامتیاز کا درجہ رکھتے ہیں۔

ذات نبویؐ سے پھوٹنے والا علم نبوت کی دو قسمیں ہیں: (1) علوم ظاہریہ (2) علوم باطنیہ جو دراصل دعا خلیل علیہ السلام میں بعثت نبوی کا مقصد قرار دیا ہے، **ویعلمهم الکتاب والحکمة ویزکیهم** کتاب وحکمت کی تعلیم سے علوم ظاہریہ کی طرف اشارہ ہے اور 'ویزکیھم' سے یعنی تزکیہ سے علوم باطنیہ کی طرف اشارہ ہے۔

از روز اوّل تا امروز ان دونوں شعبوں کی آبیاری علمائے کرام اور صوفیائے عظام کرتے آئے ہیں اس لیے خانقاہوں کو تسبیح و تہلیل سے گرمائے رکھنا، مدارس کو قال اللہ اور قال الرسول کی صداؤں سے آباد رکھنا یہ ان حضرات کی ذمے داری ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ مؤلف مرحوم مغفور نے تزکیۂ نفس اور تصوف کے عنوان سے یہ رسالہ تصنیف فرما کر وقت کی اہم ضرورت کی تکمیل نیز اس کا انتساب اپنے شیخ کامل مولانا وزیر احمد خان صاحب کی طرف فرما کر اپنی عقیدت و نیازمندی کا ثبوت دیا ہے جیسا کہ خود فرماتے ہیں: ''میں نے بارہ سال شب و روز اپنے شیخ کامل حضرت قبلہ عالم کی خدمت کی اور صحبت اختیار کی ہے، صرف دوپہر کا کھانا کھانے کے واسطے اور شب کو کھانا کھانے اور سونے کے واسطے تو گھر آتا جاتا باقی سارا وقت حضرت شیخ کامل کی خدمت و صحبت بابرکت میں گزارتا اور یہ اسی صحبت دیرینہ اور ان کے خلوص کا توجہات و فیوضات و برکات کا ثمرہ ہے۔ (فیوضات وزیریہ، ص 25)

دل سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کتاب کو وابستگان حلقۂ ارادت اور دیگر عامۃ المسلمین کے لیے نافع اور مؤلف کے لیے ذریعہ آخرت بنائے۔

مختصر تبصرے

نصف سفر

مصنف: سید رونق رضا ٹسوائی

صفحات: 144، قیمت: 300 روپے، ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی

رونق رضا کا دوسرا شعری مجموعہ 'نصف سفر' ان کے انتقال کے پچیس سال بعد منظر عام پر آیا۔ ان کی اہلیہ سیدہ شان معراج نے منتشر کلام کو بڑی تلاش و جستجو سے یکجا کر کے 2015 میں اس مجموعہ کو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع کروایا۔ رونق رضا کا ایک کار حادثے سے 1989 میں انتقال ہو گیا تھا۔ اس مجموعے سے قبل ان کی زندگی میں پہلا مجموعہ 'آئینے اکیلے ہیں' 1983 میں مشتہر ہو کر ارباب علم و ادب سے پذیرائی حاصل کر چکا تھا۔

زیر تبصرہ شعری مجموعہ رونق رضا کے فکر و فن کا عمدہ نمونہ ہے۔ یہ مجموعہ 144 صفحات پر مشتمل حمد، غزل، نظم اور متفرق اشعار کو محیط ہے۔ اس کے ابتدائی پچیس اوراق تقریظ اور روداد سفر کے لیے مختص ہیں۔ انیس اشفاق، علی احمد فاطمی اور ابوالکلام قاسمی کی والہانہ محبت کا اظہار بھی شامل مجموعہ ہے۔ بنیادی طور پر رونق رضا غزل کے شاعر ہیں۔ اس مجموعے کے مطالعے سے واضح ہے کہ وہ اپنے عہد کے ایک منفرد لہجہ کے شاعر ہیں۔ انھوں نے مختلف بحروں میں نئے موضوعات اور نئی لفظیات کے گل ہائے سخن کھلائے ہیں۔ ان کی شاعری کا بنیادی وصف تازہ کاری، لالہ کاری ہے۔ غزلوں میں ایک خاص قسم کی سنجیدگی اور بالیدگی پائی جاتی ہے۔ ایک طرف ان کی شاعری میں روایتی شیرنیت ملتی ہے، تو دوسری طرف ان کے عہد کے مسائل اور میلانات کی گھلاوٹ۔ بطور نمونہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

وسعتوں میں جستجوئے راز تھک کر سوگئی　　پر سلامت ہیں مگر پرواز تھک کر سوگئی
کوئی ٹوٹی ہوئی دیوار بزرگوں کی طرح　　ہاتھ رکھ دیتی ہے سر پر مرے اکثر اپنا
اجنبی تھی کل ترے کوچے کی ویرانی بہت　　ہاں مگر گزرے ہوئے لمحے صدا دیتے رہے
کتنی بے معنٰی رفاقت ابر کے ٹکڑوں میں تھی　　دیکھ کر میرا گھروندا برق و باراں ہوگئی

محولہ بالا اشعار کی قرات اس بات کا بین ثبوت ہے کہ رونق رضا کی شاعری تجربات و مشاہدات کا بہترین شعری گلدستہ ہے، جس میں ایک مخصوص فکر بھی ہے اور فن بھی۔ امید ہے کہ اس شعری مجموعے سے صاحب نظر محظوظ بھی ہوں گے اور مسرور بھی۔

نقش نشتر

مصنف: نریندر ناتھ نشتر

صفحات: 132، قیمت: 200 روپے، ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی

نریندر ناتھ نشتر ان شعرا میں ہیں جنھوں نے اردو شاعری کے ذریعے گنگا جمنی تہذیب اور قومی یکجہتی کو اپنے تخلیقی جہد سے قائم رکھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اردو ادب کے وسیع میدان میں ہندو ادبا اور شعرا نے کار ہائے نمایاں انجام دے کر ادب کے فکر و فن کو مزید وسعت بخشی۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی نشتر ہیں۔ تیرہ سال کی عمر میں سیالکوٹ کے ایک گاؤں سے نقل مکانی کر کے دہلی کے قریب گوڑ گاؤں میں سکونت پذیری اختیار کی۔ حصول علم و فن کے بعد درس و تدریس کے مشغلہ میں منہمک ہو گئے۔ انھیں اثنا میں دیا شنکر حیرت، کشمیری لال ذاکر، ڈاکٹر کنور مہندر سنگھ بیدی سحر اور ڈاکٹر کندن اراولی کی کسب صحبت سے اردو شاعری پر طبع آزمائی کرنے لگے۔ ان کی شعری کاوشوں کا نتیجہ بعد مرگ 'نقش نشتر' کے نام سے منظر عام پر آیا۔ نشتر کے پراگندہ کلام کو ڈاکٹر کندن اراولی نے ان کی بیٹی سنیہہ لتا شرما اور بیٹے ودھو سیما شرما کی معاونت سے تہذیب و ترتیب دے کر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے 2014 میں شائع کروایا۔

زیر تبصرہ شعری مجموعہ 132 صفحات کو محیط ہے۔ تقریظ، تعارف، تراسی غزلیں، دو نظمیں اور ایک مثنوی (67 اشعار پر مشتمل) شامل مجموعہ ہے۔ کلام نشتر کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے براہ راست گفتگو کی ہے۔ سادہ اور عام فہم لہجے میں اپنے خیالات کو شاعرانہ رنگ عطا کیا، عوامی زبان و بیان سے اپنی شاعری کو متصف کیا۔ بطور خاص ان کی مثنوی 'ہاتھ نامہ' نظیر اکبر آبادی کی نظموں کی یاد دلاتی ہے۔ بطور مثال مثنوی سے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہاتھ کیا ہے؟ کبھی یہ سوچا ہے　　انگلیاں چار اک انگوٹھا ہے
انہی کے بیچ اک ہتھیلی ہے　　یہ نہ سمجھو کہ یہ اکیلی ہے
اس ہتھیلی میں ہیں لکیریں چند　　ان لکیروں میں ہے مقدر بند
ہاتھ ہی ہیں کمال علم و عمل　　ہاتھ ہی ہیں زوال علم و عمل

نشتر کی شاعری میں ہندی کاویہ کی جھلک نمایاں ہے انھوں نے بعض غزل اور خاص کر نظم میں دوہا اور چھند کی ہیئت اپنائی ہے۔ انھوں نے ہندی الفاظ کو بھی بڑے سلیقے سے برتا ہے۔ ان کی شاعری میں معنوی خوبی سے زیادہ صوری خوبی نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری یک سطحی اور بیشتر کلام نیم پختہ ہونے کے باوجود بھی مستحسن معلوم ہوتا ہے، کیونکہ انھوں نے اپنی شاعری میں جس خلوص اور صداقت کا مظاہرہ کیا وہ مثال آپ ہے۔ امید ہے کہ ادبی حلقے میں اس شعری مجموعے کی پذیرائی ہوگی۔

تیسری آنکھ

مصنف: وقار قادری

صفحات: 152، قیمت: 200 روپے، ناشر: رنگ پبلی کیشنز، بچو ادھنباد

وقار قادری کی 'تیسری آنکھ' مجازی معنوں میں ایک شعری مجموعہ ہے۔ جبکہ حقیقی معنوں میں یہ ایک استعارہ ہے 'دل' کا۔ دل وہ طاقت ہے جس میں روحانیت کے زیر اثر تمام غیر مرئی اشیا نمو پذیر ہوتی ہیں۔ شاعر بھی ایک حساس طبیعت کا مالک ہوتا ہے۔ اس میں بصیرت اور آگہی اس درجہ ہوتی ہے کہ مطالعہ کائنات کی منتشر اور خام خیالی کو قوت تخیل کے تصرف سے با معنی بنا دیتا ہے۔ وقار قادری بھی انھیں میں سے ایک شاعر ہیں جنھوں نے اپنے مشاہدات اور تجربات کو شاعرانہ قالب میں ڈھال کر وفور جذبات کا ہدیۂ تشکر 'تیسری آنکھ' کی شکل میں آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔ یہ مجموعہ ایک سو باون صفحات پر مشتمل دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں وقار قادری کے فن و شخصیت کے لیے ستاون صفحات صرف کیے گئے ہیں۔

دوسرا حصہ حمد، نعت، منقبت، غزل، رباعی، قطعات، نذرانۂ شعر اور متفرق اشعار کے لیے مختص ہے۔ وقار قادری نے تنقیدی اور صحافتی خدمات بھی انجام دی ہیں، لیکن ان کی شناخت بنیادی طور پر شاعری سے ہے۔ غزل اور رباعی ان کا خاص میدان شاعری ہے۔ جبکہ انھوں نے مختلف اصناف شعر مثلاً نظم، مثنوی، سلام اور سہرا پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے یہاں شاعری میں انسانی جذبات و احساسات کی ترجمانی زیادہ ملتی ہے۔ بطور نمونہ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

جب سے ہیں بے نیاز غم بیکراں سے ہم　　بڑھتے گئے ہیں سرحد کون و مکاں سے ہم
شاید یہی ہے گردش تقدیر ہم نشیں　　طوفاں بلا کا اٹھا ہے گزرے جہاں سے ہم
صحرا صحرا مارے مارے پھرتے ہیں دیوانے ہم　　پاؤں میں زنجیر پڑی ہے منزل کی بھی ٹھانی ہے

بہر کیف وقار قادری نے مختلف النوع موضوعات کو بڑے سلیقے سے برتا ہے۔ یہ الگ مسئلہ ہے کہ کثرت موضوع اور عقیدت موضوع کے باعث شاید کہ وقار قادری کو اپنے کلام کے فن پر غور و خوض کرنے کا موقع ہاتھ نہیں آیا۔ اس لیے ان کی شاعری مقصدیت کے غلبے کی وجہ سے فن پر حاوی نظر آتی ہے۔ اس کے باوجود بھی ان کی شاعری خیال کی بلندی، مضامین کی تازگی میں اپنا ایک علاحدہ مقام رکھتی ہیں۔

رنگ نگر

مصنف: محمد شریف قریشی

صفحات: 208، قیمت: 116 روپے

محمد شریف قریشی کا تعارف ادبی دنیا میں کسی طرح کا محتاج بیان نہیں کیونکہ ان کے اب تک متعدد شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ 'نقش دوام' (1990)، دوسرا 'الہام' (1991)، تیسرا 'ندی کنارے پیاس' (1993)، چوتھا 'آثار' (1994)، پانچواں 'چاند پھر نکلا' (2014) اور تازہ ترین چھٹا شعری مجموعہ 'رنگ نگر'' 2015 میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی اشتراک سے شائع ہوا۔ مزید برآں موصوف نے آئندہ آنے والے ساتویں شعری مجموعے 'طلوع' کی خوش خبری سنائی ہے۔

زیر تبصرہ شعری مجموعہ 'رنگ نگر' تریسٹھ غزلوں پر مشتمل ہے۔ حروف تہجی کے اعتبار سے غزلوں کو مرتب کیا گیا ہے۔ اس میں مختلف طرح کی غزلیں شامل ہیں بعض غزلیں طویل ہیں اور بعض مختصر۔ شروع ہی میں مصنف نے اپنا تعارف، عندیہ شاعری اور تخاطب کلام کو بڑے فاتحانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ شریف قریشی کی غزلوں کے موضوعات اور مضامین عمدہ اور شائستہ ہیں۔ اشعار کی ترتیب و تنظیم ایک مخصوص سنجیدگی اور ہنرمندی کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

رقص کرنے کے بھی آداب ہوا کرتے ہیں   سب کی بانہوں میں مچلنا نہیں اچھا ہوتا
اس کا جمال مرکز حسن خیال ہے   فکر و نظر کی دیدہ وری جائے کس طرح

'رنگ نگر' کی بیشتر غزلیں بلند درجے کی ہیں لیکن بعض غزلیں پست بھی ہیں جن میں نہ کوئی خاص مضمون ہے اور نہ ہی کوئی تازگی نہ کوئی ندرت۔ بہرکیف بحیثیت مجموعی شریف قریشی کی غزلوں میں سادگی کے ساتھ ایک خاص قسم کی چاشنی بھی ملتی ہے، جس میں تحرک بھی ہے اور ترنم بھی۔ مصنف کی کاوش اور جانفشانی کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اتنی قلیل مدت میں مسلسل اور متواتر تخلیقی سفر 'مشغلۂ سخن زیست' کا مصداق بن کر ارتقا پذیر ہے۔

تازہ ہوا

مصنف: عبدالحئی پیام انصاری

صفحات: 128، قیمت: 125

عبدالحئی پیام انصاری کی شاعری کا سفر چار دہائیوں کو محیط ہے۔ اس دور کی انتشار پذیر زندگی میں ان کی شاعری تازہ ہوا کا جھونکا بن کر ظاہر ہوئی ہے۔ ان کا تیسرا مجموعۂ کلام 'تازہ ہوا' غزلیات پر مشتمل ہے۔ اس سے پہلے ان کے دو شعری مجموعے 'شعور تخیل' اور 'شعور احساس' ادبی حلقوں میں داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ پیام کے یہاں بات کرنے کا سلیقہ مہذب ہے۔ ان کے اشعار نشتر نہیں چبھوتے بلکہ سماعت سے ٹکرا کر گزر جاتے ہیں۔ کچھ اشعار ملاحظہ کریں:

حیوان بنا دیتی ہے انسان کو نفرت   انسان کو انساں بنا دیتی ہے محبت
قرآن رکھ کے طاق میں کمرہ سجا دیا   انگریز اپنے بچوں کو ہم نے بنا دیا
اس کے بچے کئی دنوں سے بھوکے تھے   جس دن اس نے تن کا کاروبار کیا
اک ترے بزم میں نہ آنے سے   رنگ پھیکا ہے آج مجلس کا

پیام کے یہاں پیار و محبت کو بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے، وہ ہمیشہ اس کا درس دیتے رہے ہیں۔ وہ اس کو نہ صرف اپنی شاعری بلکہ لوگوں کی زندگی میں بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔

مجموعے کے آخر میں چند غزلیں سہل ممتنع میں کہی گئی ہیں وہاں وہ عمدہ طور پر شعر کہنے میں کامیاب ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ گویا میر پھر سے غزل سرا ہیں:

عاشقی تو فقط تصوف ہے   تم گنہ سمجھو تو تاسف ہے
پیار چھلکے ہے اس کے غصے میں   مہربانی عتاب کی سی ہے

پیام کا تتبع میر 'گفتگو عوام سے ہے' ان کی شاعری کے مرتبے کو بلند کرتا ہے۔ مشاہیر ادب نے پیام کی آواز کو نئی آواز قرار دیا ہے بہرحال یہ ان کی اپنی رائے ہے مگر میرے نزدیک پیام کی آواز شاعری کی روایتی آواز ہے، جس میں اتباع بھی ہے اور اختراع بھی، جو انھیں ادب میں ایک منفرد مقام دلاتی ہے۔

چل مدینے کی طرف

مصنف: ہنر رسول پوری

صفحات: 128، قیمت: 150 روپے، ناشر: نیوز ٹاؤن، یوپی

ہنر رسول پوری کا زیر تبصرہ شعری مجموعہ 'چل مدینے کی طرف' نعتیہ کلام پر مبنی ہے۔ اس مجموعے میں حمد، نعت، منقبت اور قطعات شامل ہیں۔ ہنر رسول پوری کی نعتیہ شاعری پڑھ کر دل کی خشک کلیوں میں ایک نئی بہار اور ایک نئی تازگی پیدا ہوتی ہے۔ ان کا کلام محبوب سے محبت کے اظہار کا عمدہ نمونہ ہیں۔ ان کے خلوص اور صداقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ان کا تعلق رسول اللہ اور نواسہ رسول حسینؓ کے ساتھ بہت ہی زیادہ راسخ ہے۔ شاعر کو ان کے در پہ پڑے رہنے کی شدید آرزو ہے۔ وہ اپنے محبوب یعنی رسول اکرمؐ کی یاد میں راتوں کو اٹھ کر روتے ہیں اور اپنے داغوں کو اشکوں سے دھوتے ہیں۔ ذکر احمدؐ سے انھوں نے اپنے رنج و غم کو دور کیا ہے۔ ان کی شاعری کا حاصل ہی عشق نبیؐ ہے۔ مثال کے لیے محض چند اشعار اور اشارات پیش کیے جاتے ہیں:

پسینہ مشک عنبر ہے تو ہے   مرا محبوب بہتر ہے تو ہے
خدا کی راہ میں نکلے ہیں گھر سے   ادھر لاکھوں کا لشکر ہے تو ہے
روک سکتا ہی نہیں ظالم بھی مجھے   جو ہے پیغام محمدؐ وہ سناتے جائیں گے
مصطفیؐ کی آل سے سیکھا ہے میں نے یہ ہنر   در پر بھی نعت احمد گنگناتے جائیں گے

سیرت پاک ایک لامتناہی موضوع ہے۔ جس کو ہنر رسول پوری ہنرمندی سے نبھا نہیں سکے، بلکہ وہ تنگ دامانی کا شکار ہوگئے ہیں۔ ان کے اس مجموعے کے بعض اشعار پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ مستند کتب سیرت تک رسائی حاصل نہیں کر سکے جس کی وجہ سے غیر مستند مضامین اور مبالغہ آمیز بیانات نظم ہوگئے ہیں، جن کا سیرت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس طرح بعض اشعار کے مضامین محض ردیف و قوافی کی مدد سے بندھتے چلے گئے ہیں۔

بحیثیت مجموعی ہنر رسول پوری کا شعری مجموعہ اس لحاظ سے لائق اعتنا ہے کہ اس اضطراب و انتشار اور گئے گزرے دور میں انھوں نے مدینہ کا رخ کیا، اور اپنی مذہبی فکر کو کسی حد تک فن کے قالب میں منتقل کر کے اہالیان ادب کی توجہ اس طرف مرکوز کرائی۔ لہٰذا تمام نقائص کے باوجود امید کی جاتی ہے کہ مصنف کا یہ نعتیہ مجموعہ بھی علم و ادب کی محفل میں ضیا کا باعث ہوگا۔

مبصر: شاکر علی صدیقی، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

■

عالمی اردو نامہ

نیوزی لینڈ کی ادبی تقریبات

آکلینڈ: موسلا دھار بارش، تیز رفتار آندھی بھی اردو زبان کی شیرینی اور لطافت کے آگے پھیکی پڑ گئی۔ اردو کا جادو دیارِ غیر نیوزی لینڈ میں سر چڑھ کر بولنے لگا۔ یورپ کے کسی بھی ملک میں اردو زبان کا اتنا پرہجوم مشاعرہ شاذ و نادر دیکھا جاتا ہے۔ اس پرہجوم مشاعرہ کا ناخوشگوار موسم کے باوجود کامیابی کا سہرا بے شک اردو زبان کی سحر انگیز شاعری اس زبان کی شیرینی اور لطافت کے سر بندھتا ہے۔ ہر سال کی طرح اس سال بھی اردو ہندی کلچرل ایسوسی ایشن نیوزی لینڈ کے زیر اہتمام ایسوسی ایشن کے ترجمان 'دھنک' سالانہ کے رسم اجرا کے موقعے پر اردو کا کلام ساز پر 'شام غزل' کے زیر عنوان پیش کیا گیا اور اردو مشاعرہ اور ہندی کوی سمیلن منعقد ہوا۔ یہ تقریب 23 مئی شام 6 بجے فری میسن ڈے کمیونٹی ہال آکلینڈ میں شروع ہوئی۔ صدر ایسوسی ایشن نفیس اختر نے سامعین اور شعرا کا خیر مقدم کیا۔ رسالہ 'دھنک' کا اجرا رکن پارلیمنٹ نیوزی لینڈ جناب کنول جیت سنگھ بخشی نے انجام دیا۔ مشاعرہ کی صدارت آسٹریلیا کے ممتاز شاعر ادیب اور نقاد جناب رضا عباسی علوی نے کی، نظامت کی ذمے داری محمد توقیر خان کے ذمے تھی۔ شعرا میں پاکستان سے عطاء الرحمٰن قریشی، غوث مجید، فرح علوی، سید مجیب حیدر آبادی (نیوزی لینڈ) نے اپنا کلام پیش کیا۔ پاکستان سے پروفیسر رئیس علوی نے ٹیلیفون پر مبارکباد پیش کی اور اپنا کلام سنایا۔ ہندی کوی سمیلن میں سومناتھ گپتا، ڈاکٹر مونا ورما، سمن کپور، بال مدن، شیو بھاگیرت نے اپنی کویتائیں پیش کیں۔ پریتا ویاس نے کوی سمیلن کی نظامت کی۔ عزت مآب رکن پارلیمنٹ کنول جیت سنگھ بخشی نے اپنے خطاب میں اس شاندار پروگرام کے انعقاد پر ایسوسی ایشن کے معتمد عمومی سید مجیب کو تہنیت پیش کی اور کہا کہ اس یوروپی ملک میں اردو زبان و تمدن کا تشخص برقرار رکھنا اور اس کا فروغ جوئے شیر لانے سے کم کوئی کارنامہ نہیں۔ انھوں نے اسسٹنٹ پروفیسر اردو انوار العلوم کالج ایم اے لطیف خان کا جو نیوزی لینڈ کے نجی دورہ پر آئے ہوئے تھے تعارف کروایا۔ پروگرام 6 بجے سے 9 بجے تک مقرر تھا لیکن سامعین پروگرام سے اتنے زیادہ متاثر تھے کہ پروگرام کے وقت میں دو گھنٹے کی توسیع کرنی پڑی اور 9 بجے کے بجائے 11 بجے شب تک پروگرام جاری رہا۔ سامعین میں ہندو اور سکھ حضرات کی تعداد مسلم حضرات سے زیادہ تھی۔ زبردست بارش اور تیز آندھی بھی شائقین کو جلسہ گاہ تک پہنچنے سے نہ روک سکی۔ اس طرح اردو ہندی کلچرل ایسوسی ایشن کی یہ یادگار چوتھی سالانہ تقریب یورپ کی تاریخ میں اپنا ایک سنگ میل قائم کر کے نصف شب کے قریب اختتام پذیر ہوئی۔

روزنامہ 'ندیم' بھوپال، 25 جون 2015

ڈاکٹر تقی عابدی کی لائبریری میں محفل اقبال

ٹورنٹو: عالمی مجلسِ اقبال (International Iqbal Society) کی جانب سے ایک خوبصورت محفل ڈاکٹر تقی عابدی کی لائبریری واقع نیو مارکٹ ٹورنٹو میں منعقد ہوئی۔ اس ادبی محفل کا عنوان سلسلۃ الذہب یعنی گولڈن چین غالب سے اقبال (The Golden Chain From Ghalib to Iqbal) تھا۔ اس محفل کی خصوصیت اور اہمیت یہ بھی تھی کہ اس میں پاکستان کے قونصل جنرل اصغر علی گولو نے صدارت اور ہندوستان کے قونصل جنرل اکلیش مِشر اصاحب نے بحیثیت مہمانِ خصوصی شرکت کی اور اپنے خیالات سے لوگوں کو آگاہ کیا۔ اس محفل میں ہندوستان سے تشریف لائے اقلیتی زبانوں کے کمشنر، پروفیسر پدم شری اختر الواسع نے شرکت کی اور گولڈن چین۔ غالب سے اقبال تک پر توسیعی لیکچر دیا۔ پروفیسر واسع نے تفصیل سے اس سلسلۃ الذہب کا جائزہ لیا اور غالب، سر سید، حالی، شبلی اور اقبال پر عمدہ نکات پیش کیے۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے اس سنہری سلسلے سے مولانا الطاف حسین حالی کو منتخب کرتے ہوئے ان کی قومی خدمات، عورتوں کے حقوق اور ان کی تعلیم کی ضرورت کی بابت معاشرے کو بیدار کرنے کے لیے مدّ و جزرِ اسلام (مسدسِ حالی) اور تعمیری منظومات میں ترقی پسندی کے نکات کو خوب صورت انداز میں پیش کیا۔ ڈاکٹر ستیہ پال آنند نے علامہ محمد اقبال کی قومی و آفاقی شاعری کا جائزہ لیا۔ محفل میں سنہا ٹھاکر نے جو حقوق زنان کی اہم رائٹر ہیں اور اپنی خدمات کے صلے میں کئی ایوارڈ حاصل کر چکی ہیں، ہندی زبان میں اپنی خوب صورت نظم اور گفتگو سے سامعین کو محظوظ کیا۔ محفل کے مہمانِ خصوصی قونصل جنرل مِشرا صاحب نے اردو زبان کے ان عظیم شاعروں کے ذکر کے ساتھ غالب کے اشعار سے محفل کو رونق بخشی۔ محفل کے دوران عالمی مجلسِ اقبال (International Iqbal Society) کے روحِ رواں نعمان بخاری نے بتایا کہ فکرِ اقبال کی ترویج کے لیے سوشل میڈیا پر بنائے گئے پیج کی تعداد اس وقت 58 لاکھ سے زائد ہے جہاں لوگ فکرِ اقبال سے مستفید ہوتے ہیں۔ محفل کا باقاعدہ آغاز ابراہیم بخاری (نعمان بخاری کے بیٹے) کی قرأت سے ہوا۔ محفل کے اختتام پر صدارتی خطبے میں اصغر علی گولو نے کہا کہ اس سلسلۃ الذہب کی آخری کڑی جو علامہ اقبال کی ذات ہے، حقیقت میں ہمارے دور کی انسانی اقدار کا دروازہ ہے۔ انھوں نے اقبال کی کردار سازی اور خودی کی ترقی پر خوب صورت بات چیت کی۔

پریس ریلیز: سید تقی عابدی، کناڈا، 27 مئی 2015

جشن علامہ اقبال کا دوسرا عالمی مشاعرہ

ریاض: ادارہ 'ہدف' جو فکرِ اقبال کی اساس پر شخصیت سازی کا ادارہ ہے اس کے زیر اہتمام بعنوان 'شاعر انسانیت و دانائے راز جشن علامہ اقبال کا دوسرا عالمی مشاعرہ' سعودی عرب کے منطقہ شرقیہ جو خلیج عرب کے کنارے شہر الخبر میں واقع ہے منعقد ہوا، جس کی صدارت انور مسعود و نظامت نعیم جاوید نے کی۔ نائب صدر جاوید مسعود نے پرکشش زبان میں خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ اس کے بعد صفی حیدر جو گورننگ کونسل کے ممبر ہیں انھوں نے معاونین مہم اور شعرا کو انور مسعود کے ہاتھوں فرداً فرداً اعزازات دیے جو صدر مشاعرہ بھی تھے۔ نعیم جاوید قائد تحریک ہدف نے صدر مشاعرہ انور مسعود کے ہاتھوں یادگار مجلّہ 'سوغاتِ حجاز' کا اجرا کروایا۔ شعرائے کرام میں انور مسعود (پاکستان)، ساگر تریاٹھی (ممبئی)، ڈاکٹر حنیف شباب (بھٹکل)، ڈاکٹر نوشہ اسرار (امریکہ)، سہیل ثاقب (پاکستان) صادق کرمانی، عبدالقدیر توپچی (گلبرگہ)، نعیم جاوید (حیدر آباد) وغیرہ موجود تھے۔ مشاعرہ رات کے آخری پہر تک انور مسعود کی مزاحیہ شاعری سے قہقہہ افروز رہا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 مئی 2015

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں
خبرنامہ

اردو صرف اور صرف ہندوستان کی زبان ہے: پدم شری مظفر حسین
اردو کونسل زبان کے فروغ پر توجہ دے گی: پروفیسر ارتضیٰ کریم

قومی اردو کونسل میں نئے ڈائرکٹر کو استقبالیہ

نئی دہلی: قومی اردو کونسل میں ایک استقبالیہ اور الوداعیہ تقریب کا انعقاد کیا گیا۔قومی اردو کونسل کے صدر دفتر فروغ اردو بھون میں منعقدہ اس تقریب کی صدارت کونسل کے وائس چیئرمین پدم شری مظفر حسین نے کی۔ کا استقبال کیا۔اس موقع پر وائس چیئرمین نے کونسل کے سابق ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین کے کام کاج کی تعریف کرتے ہوئے نئے ڈائرکٹر سے ان کے کاموں کو مزید آگے بڑھانے کی درخواست کی اور کہا کہ مجھے نے کونسل کے سابق ڈائرکٹر کو شال پیش کرتے ہوئے کہا کہ کونسل کو جب بھی ضرورت ہوگی ہم آپ کے تجربات سے مستفید ہونے کی کوشش کریں گے۔ اس موقع پر کونسل کے سابق ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے

دائیں سے کونسل کے وائس چیئرمین پدم شری مظفر حسین، کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم، سابق ڈائرکٹر پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین، پرنسپل پبلی کیشن آفیسر ڈاکٹر شمس اقبال اور اسسٹنٹ ڈائرکٹر کمل سنگھ

اسسٹنٹ ڈائرکٹر انتظامیہ کمل سنگھ نے سبھی حاضرین کا استقبال کرتے ہوئے اپنے تجربات بتائے اور کہا کہ پرانے ڈائرکٹر کے ساتھ ہمارا بہت اچھا وقت گذرا ہے اور آج پروفیسر ارتضیٰ کریم نے نئے ڈائرکٹر کا عہدہ سنبھالا ہے۔ ہمارے لیے یہ خوشی کا موقع ہے۔ ان کے آنے سے کونسل کا کام بہتر ڈھنگ سے انجام پائے گا۔ میں کونسل کی جانب سے ان کا استقبال کرتا ہوں۔کونسل کے وائس چیئرمین پدم شری مظفر حسین نے گلدستہ دے کر ان امید ہے کہ نئے ڈائرکٹر کونسل کو مزید اونچائیوں سے ہمکنار کرائیں گے۔انھوں نے سابق ڈائرکٹر کے کاموں کی ستائش کی۔انھوں نے کونسل کے نئے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ ہم سب مل کر کونسل کو آگے لے جائیں گے اور اردو زبان وادب کے فروغ کی نئی تاریخ رقم کریں گے۔اردو صرف اور صرف ہندوستان کی زبان ہے اور ہمیں اسے زیادہ سے زیادہ مضبوط کرنے کی ضرورت ہے۔کونسل کے وائس چیئرمین وائس چیئرمین کی باتوں کو سند کا درجہ دیتے ہوئے کہا کہ ہمارے کاموں کی جس طرح سے وائس چیئرمین نے پذیرائی کی ہے وہی میرا صلہ ہے، کونسل نے جو بھی مقام حاصل کیا ہے اس میں کونسل کے تمام اسٹاف شامل رہے ہیں اور کونسل کی کامیابی کا سہرا یہاں کے اسٹاف کے سر جاتا ہے۔کونسل کے تمام اسٹاف نے نوکری یا ملازمت سے اوپر اٹھ کر جذباتی انداز میں کام کیا ہے اور رات دن محنت کی ہے۔انھوں نے نئے ڈائرکٹر کا خیر مقدم کرتے

ہوئے کہا کہ ہمیں امید ہے کہ ان کے آنے سے کونسل کو نیا عروج عطا ہوگا۔ اس موقعے پر کونسل کے نئے ڈائرکٹر پروفیسر ارتضیٰ کریم نے وائس چیئرمین پدم شری مظفر حسین کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ گزشتہ چھ مہینوں سے انھوں نے کونسل کی بہتری کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ میں اردو کا خادم ہوں اور اردو کے فروغ کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ اصل میں اس دفتر کا واضح نام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ہے۔ مگر ہم نے پچھلے دنوں ادب کے فروغ پر زیادہ توجہ دی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اصل مقصد سے دور ہوتے چلے گئے اور ہماری زبان سمٹتی چلی گئی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم زبان کے فروغ پر 80 فیصد اور ادب کے ارتقا کے لیے 20 فیصد کا تناسب قائم کریں چونکہ جب زبان ہی نہ ہوگی تو ہمارے ادیب کو قاری کہاں سے ملے گا۔ اس لیے کونسل زبان کے فروغ کو ترجیح دے گی۔ انھوں نے مزید کہا کہ کونسل کے چار ریجنل مراکز کی تجویز وزارت کو سونپی جائے گی تاکہ کونسل کے دائرہ کار کو پورے ملک میں وسعت اور رفتار دی جائے۔ پی ایچ ڈی اور ایم فل کے 50 ریسرچ اسکالرز کو وظائف دینے کا بھی منصوبہ ہے تاکہ اردو میں تحقیق کو بڑھاوا دیا جائے۔ انھوں نے کونسل کے سابق ڈائرکٹر ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ کی بھی کونسل کی کامیابی کے لیے ستائش کی اور کہا کہ آج کونسل جس مقام پر ہے اس کے لیے ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ کی کوششوں سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس تقریب میں کونسل کے تمام ملازمین کے ساتھ ساتھ میڈیا اور اخبارات کے نمائندے بھی موجود تھے۔ تقریب کا اختتام راشٹر گان پر ہوا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 4 جون 2015

کونسل کے مالی تعاون سے

اردو اور ہندی کا باہمی رشتہ

لکھنؤ: مسیحا اردو سوسائٹی کے تحت قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے تعاون سے 'اردو اور ہندی کا باہمی رشتہ' موضوع پر ایک سیمینار جے شنکر پرساد ہال قیصر باغ میں ہوا۔ پروگرام کی صدارت پروفیسر آصفہ زمانی نے کی۔ مہمان خصوصی کے طور پر لکھنؤ کے میئر ڈاکٹر دنیش شرما موجود تھے جبکہ مہمان ذی وقار کی حیثیت سے نعمان اعظمی، پروفیسر اوشا سنہا اور اطہر نبی وغیرہ نے شرکت کی۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر عباس رضا نیر اور ڈاکٹر شوبھا ترپاٹھی نے مشترکہ طور پر کی۔ اس موقع پر پروفیسر آصفہ زمانی نے کہا کہ اردو اور ہندی دونوں شیریں زبان ہیں۔ دونوں زبان والوں کو چاہیے کہ ہر زبان والے کو آنے دیں تاکہ زبانوں کا دامن وسیع ہوسکے۔ ڈاکٹر دنیش شرما نے کہا کہ اس موقعے پر ڈاکٹر مسیح الدین خاں کی کتاب 'بچن کی باتیں' (ہری ونش رائے بچن) اس بات کا ثبوت ہے کہ زبان جتنی سہل استعمال کی جائے گی اتنی ہی کامیاب ہوگی۔ پروفیسر اوشا سنہا سابق صدر شعبہ علوم لسانیات لکھنؤ یونیورسٹی نے اس سیمینار میں بہت سارے الفاظ بتائے جو ہندی اور اردو دونوں میں مستعمل ہیں اور بولنے والے کے سمجھ میں یہ کبھی بھی نہیں آیا کہ الفاظ اردو کے ہیں یا ہندی کے ہے۔ پروگرام کے مہمان ذی وقار علامہ شبلی نعمانی ہیلپ لائن کے چیئرمین نعمان اعظمی نے اس خصوصی موقع پر ڈاکٹر مسیح الدین خان کو اس سیمینار کے لیے اور کتاب کے لیے مبارکباد پیش کی۔ سوسائٹی کے بانی ڈاکٹر مسیح الدین خان نے پروفیسر دنیش شرما کے بدست سوسائٹی کی طرف سے نعمان اعظمی صاحب کو ایک یادگاری نشان

پیش کیا۔ اس موقع پر چودھری شرف الدین، اطہر نبی ایڈوکیٹ، ڈاکٹر عبدالرحیم، ڈاکٹر حنا افشاں کانپور یونیورسٹی، ڈاکٹر محمد آل احمد علی گڑھ یونیورسٹی، ڈاکٹر نکنج مشرا نے اپنے مقالے پیش کیے۔ اس موقع پر ڈاکٹر مسیح الدین خاں کی کتاب 'بچن کی باتیں' (ہری ونش رائے بچن) کا اجرا لکھنؤ کے میئر ڈاکٹر دنیش شرما کے ہاتھوں عمل میں آیا۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر مسیح الدین خاں مسیح لکھنؤ، 31 مئی 2015

اردو ادب کے سکھ افسانہ نگار

مالیر کوٹلہ: افسانہ کلب مالیر کوٹلہ، پنجاب کی طرف سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے دو روزہ قومی سیمینار مورخہ 9 اور 10 مئی کو منعقد کیا گیا۔ سیمینار میں حصہ لینے کے لیے ملک کے دور دراز علاقوں سے اردو کے نقاد، افسانہ نگار اور صحافی تشریف لائے جو بلاشبہ اردو ادب کی عظمت مانے جاتے ہیں۔ اس موقعے پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پروفیسر صغیر افراہیم، دلی یونیورسٹی سے ڈاکٹر ابوبکر عباد، چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ کے صدر شعبہ اردو ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، دہلی سے معروف اردو صحافی و نقاد حقانی القاسمی، دہلی سے ڈاکٹر نگار عظیم، جموں سے مشتاق احمد وانی، گورونانک دیو یونیورسٹی امرتسر سے ڈاکٹر عزیز عباسی، پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ سے ڈاکٹر رحمٰن اختر اور ڈاکٹر محمد جمیل شامل ہوئے۔ پہلے اجلاس کی صدارت مالیر کوٹلہ کے مشہور صنعت کار اور سوشل ورکر امجد علی چیئرمین سہراب گروپ آف کمپنیز نے فرمائی۔ مہمان خصوصی کے طور پر لندن سے ایس ایس گریوال تشریف لائے۔ مہمان ذی وقار کے طور پر پروفیسر صغیر افراہیم، نریندر پال سنگھ سابق صدر نگر کونسل نے اسٹیج کو رونق بخشی۔ اسلم جمشید پوری سرپرست اور کلب کے صدر محمد بشیر مالیر کوٹلوی بھی اسٹیج پر موجود تھے۔ نظامت کے فرائض نوجوان افسانہ نگار جناب ناصر آزاد سکریٹری افسانہ کلب نے ادا کیے۔ کلب کے روح رواں بشیر مالیر کوٹلوی نے ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کی بے لوث خدمت کی بنیاد پر سال 2015 کے لیے منٹو ایوارڈ جو ایک شال اور

خوبصورت اور منقش مومنٹو پر مشتمل تھا نوازا۔ بشیر مالیرکوٹلوی نے واضح کیا کہ اس سے پہلے افسانہ کلب نے یہ ایوارڈ شرون کمار ورما (مرحوم) کو ان کی حیات میں دیا تھا۔ دوسرا ایوارڈ 'محافظ اردو ادب' مدیر پروگرام ادب پٹیالہ جناب اشرف محمود نندن صاحب کی نذر کیا گیا۔ ایوارڈ کی تقسیم کے بعد افسانہ کلب کے سرگرم ممبر ڈاکٹر محمد اسلم کی کتاب 'مشرقی پنجاب کا ادبی سفرنامہ' کا اجرا ہوا۔ اس موقعے پر پروفیسر صغیر افراہیم کی ادارت میں شائع ہونے والے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا معروف مجلّہ 'تہذیب الاخلاق' کے نئے شمارے کی رسم اجرا کی گئی جو مالیرکوٹلہ کے لیے باعث فخر بات تھی۔ ان رسوم کے بعد ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے اپنی تقریر میں سکھ افسانہ نگاروں کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی۔ اس اجلاس کے روح رواں ڈاکٹر صغیر افراہیم نے پنجاب اور پنجابیت کے حوالے سے اپنی تقریر کی۔ خطبہ صدارت سے پہلے مہمانان گرامی کو یادگاری ٹرافیاں پیش کی گئیں۔ تقریب کے صدر امجد علی نے پنجاب میں اردو افسانے کے حوالے سے افسانہ کلب کے کاموں کو سراہا۔ اس طرح یہ استقبالیہ سیشن اختتام پذیر ہوا۔ دوسرے سیشن کی صدارت ڈاکٹر ابوبکر عباد نے کی۔ نظامت سالک جمیل براڑ نے کی۔ مقالہ نگاروں نے اپنے مقالات پیش کیے۔ نظامت سکریٹری کلب ناصر آزاد نے سنبھالی۔ اس موقعے پر افسانوی مجموعہ 'خواب خواب زندگی' کا اجرا ہوا۔ دوسرے دن بھاشا وبھاگ (پنجاب) کے ڈائرکٹر سردار چیتن سنگھ سیمینار میں شرکت کی غرض سے خاص طور پر پٹیالہ سے تشریف لائے۔ چیتن سنگھ خود بھی افسانچہ نگار ہیں اور افسانہ میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ تیسرے سیشن کی صدارت چیتن سنگھ، ڈاکٹر صغیر افراہیم اور ڈاکٹر نگار عظیم نے فرمائی۔ اختتام پر صدر کلب جناب محمد بشیر مالیرکوٹلوی نے باہر سے آئے ہوئے مہمانوں اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ اس طرح یہ دوروزہ قومی سیمینار اختتام پذیر ہوا۔

رپورٹ: محمد بشیر مالیرکوٹلوی، مالیرکوٹلہ، 30 مئی 2015

اردو صحافت: قومی یکجہتی آثار ونقوش

دربھنگہ: سچ بولنے والی صحافت ہو ورغلانے والی صحافت نہ ہو۔ ہمیں قوم کی یکجہتی کے لیے قربانی دینی ہوگی۔ ان خیالات کا اظہار ادبی مرکز احاطے میں این سی پی یو ایل کے تعاون سے 'بہار میں اردو صحافت قومی یکجہتی آثار ونقوش' کے موضوع پر سیمینار میں صدارتی کلمات کے دوران کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر طیب صدیقی نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ صحافت کا یہ کام ہے کہ قوم کو جوڑا جائے۔ اس موقعے پر ملت کالج کے پرنسپل ڈاکٹر رحمت اللہ، شعبہ ہندی کے سابق صدر پروفیسر پربھاکر پاٹھک، ملت کالج کے سابق پرنسپل پروفیسر چودھری محمود عالم نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی۔ اپنے خطاب میں عبدالمتین قاسمی نے کہا کہ بہار کا پہلا اردو اخبار 1853 میں آرا ضلع سے شائع ہوا تھا۔ پروفیسر پربھاکر پاٹھک نے صحافت کو ملک کا چوتھا ستون بتایا اور قومی یکجہتی کے حوالے سے ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا۔ اس موقعے پر مولانا فضل اللہ سلفی انصاری، ڈاکٹر چودھری محمود عالم نے بھی خطاب کرتے ہوئے بچوں کو اردو پڑھانے پر زور دیا اور کہا کہ اگر ہماری اردو زبان زندہ نہیں رہے گی تو صحافت بھی زندہ نہیں رہ پائے گی۔ مہمان اعزازی کے طور پر مدرسہ بورڈ کے سابق چیئرمین مولانا اعجاز احمد، صحافی فردوس علی اور محمد بدر عالم سابق وارڈ کاؤنسلر نے شرکت کی۔ اس کانفرنس کی روح رواں رضا کار تنظیم سوشل سروسز ٹرسٹ رہی۔ پروگرام میں مولانا عالم قاسمی کے ششماہی رسالہ الامام کا اجرا بھی ہوا۔ تکنیکی سیشن کی احتشام الحق نے نظامت کی۔ اس موقعے پر کئی اہم مقالے پڑھے گئے۔ اپنے صدارتی خطبے میں مولانا عالم قاسمی نے کہا کہ آزادی کے بعد دربھنگہ وہ جگہ ہے جہاں سے منظر امام اور منظر شہاب کی ادارت میں بہار کے پہلے اردو رسالے ماہانہ 'نئی کرن' کی اشاعت ہوئی اور بہار کے دوسرے رسالے 'صبح زندگی' بھی محمد ہاشم کی ادارت میں دربھنگہ سے ہی شائع ہوا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 19 مئی 2015

اردو میں مابعد جدید تنقید: اساسی اور اطلاقی تنقید

کشمیر: نظامتِ فاصلاتی تعلیم کشمیر یونیورسٹی کے کانفرنس ہال میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی

دہلی کی مالی معاونت سے دوروزہ قومی سیمینار بعنوان 'اردو میں مابعد جدید تنقید: اساسی اور اطلاقی جہات' کی افتتاحی نشست کا انعقاد 27 مئی کو ہوا۔ نشست کی صدارت اردو کے مشہور و ممتاز استاد اور نظریہ ساز نقاد پروفیسر حامدی کاشمیری نے کی۔ اس موقعے پر جامعہ کشمیر کے تعلیمی امور کے سربراہ پروفیسر محمد اشرف وانی کے علاوہ پروفیسر ظہورالدین، پروفیسر قدوس جاوید، پروفیسر شہزاد انجم، پروفیسر تسکینہ فاضل، اور ناظمہ نظامتِ فاصلاتی تعلیم پروفیسر نیلوفر خان، ڈاکٹر شفق سوپوری، ڈاکٹر نذیر آزاد، ڈاکٹر محی الدین زور اور دیگر اساتذہ و ریسرچ اسکالرس اور طلبا و طالبات کی ایک کہکشاں موجود تھی۔ نشست کی نظامت ڈاکٹر عرفان عالم نے کی۔ سیمینار کے آغاز میں ناظمہ پروفیسر نیلوفر خان نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا۔ انھوں نے قومی اردو کونسل کا شکریہ ادا کیا۔ ڈاکٹر الطاف انجم نے سیمینار کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر نظامت فاصلاتی تعلیم سے شائع ہو رہے سالانہ بین الاقوامی ادبی و تنقیدی مجلّہ 'ترسیل' کے بارہویں شمارے کی رسم رونمائی بھی انجام دی گئی جس پر ڈاکٹر محی الدین زور کاشمیری نے ایک مبسوط تبصرہ پیش کیا۔ اور پروفیسر ظہورالدین نے تمہیدی کلمات پیش کیے جبکہ سیمینار کے موضوع کے حوالے سے پروفیسر قدوس جاوید نے 'مابعد جدید تنقید: پس منظر و پیش منظر' کے عنوان سے بصیرت آموز کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے مابعد جدیدیت اور مابعد جدید تنقید کے مختلف پہلوؤں پر فکر انگیز بحث کی۔ جامعہ کشمیر کے تعلیمی امور کے سربراہ پروفیسر محمد اشرف وانی نے، جو کہ مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شریک مجلس تھے، نے افتتاحی خطبہ پیش کیا۔ پدم شری پروفیسر حامدی کاشمیری نے صدارتی کلمات پیش کیے۔ انھوں نے اردو کی موجودہ صورت حال کے حوالے سے چند غور طلب نکات بھی پیش کیے۔ افتتاحی نشست کے اختتام پر ڈاکٹر الطاف انجم نے شکریے کی تحریک پیش کی۔ سیمینار کی دوسری نشست پروفیسر ظہورالدین اور ڈاکٹر معروف شاہ کی صدارت میں منعقد ہوئی جس کی نظامت ریسرچ اسکالر عاشق حسین نے کی۔ اس میں دو مقالے پیش کیے گئے۔ پروفیسر شہزاد انجم نے 'مابعد جدید تنقید اور متن

نجمی اکادمی کٹک کی سالانہ تقریب کا منظر

کی معنی آفرینی: شاعری کے حوالے سے' جبکہ محمد اشرف لون نے 'اردو کے مابعد جدید ناقدین کی خدمات: نمائندہ ناقدین کے حوالے سے' مقالہ پیش کیا۔ مقالات کے اختتام پر بحث وتمحیص بھی ہوئی اور پروفیسر ظہورالدین کے صدارتی کلمات کے ساتھ دوسری نشست بھی بحسن وخوبی اختتام کو پہنچی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 مئی 2015

جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں خصوصی مشاعرہ

نئی دھلی: جواہر لعل نہرو یونیورسٹی میں اردو پریس کلب نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے مشاعرہ منعقد کیا جو کہ نئی نسل کے لیے مخصوص تھا۔ اس مشاعرے میں اردو کے اہم شاعروں کے علاوہ مہمان خصوصی کے طور پر سابق گورنر سید سبط رضی، ڈی آئی جی واجد علی، اے کے لعل، جوائنٹ سکریٹری گورنمنٹ آف انڈیا اور ملیشیا میں اردو کے نمائندے محسن ارشد نے شرکت کی، صدارت جے این یو کے پروفیسر اور ادیب وافسانہ نگار معین الدین جینا بڑے نے کی جبکہ نظامت حفیظ الرحمن نے کی۔ اس موقعے پر سید سبط رضی نے نئی شاعری کے لیے اردو پریس کلب کی اس مہم پر طارق فیضی کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ انھوں نے بہت اہم قدم اٹھایا ہے۔ سید سبط رضی نے نئی نسل کی شاعری کو پسند کیا اور اسے مشورہ دیا کہ وہ عوامی زندگی کے مسائل ومعاملات کو سمجھنے کی جانب بھی اپنی تخلیقی قوت کو آگے بڑھائے۔ ڈی آئی جی واجد علی نے بھی نئی نسل کی شاعری کو ایک توانا شعری اظہار سے تعبیر کیا۔ محسن ارشد نے بھی نئی شاعری کی تعریف کی۔ پروگرام میں بطور صدر شریک ہوئے معین الدین جینا بڑے نے بھی نئے شاعروں کو بہت دلچسپی سے سنا اور انھوں نے اس بات کا اعتراف کیا کہ غزل میں نئی جہات فکر کی دریافت کا کام ابھی بند نہیں ہوا ہے۔ طارق فیضی نے اس پروگرام کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو پریس کلب نئی شاعری اور نئی نسل دونوں کی اہمیت کو بخوبی سمجھتا ہے اور اسی لیے وہ مشاعروں کے ذریعے نئی نسل کی نمائندگی کرنے پر ہمیشہ کمربستہ رہتا ہے۔ اس مشاعرے میں شریک اہم شعرا میں پروفیسر مولا بخش اسیر، عمر فاروق، اسلم محمود، راشد انور راشد، معید رشیدی، تصنیف حیدر، پراگ اگروال، وپل کمار اور ہادی سرمدی وغیرہ شامل تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 7 مئی 2015

نجمی اکادمی کٹک کی سالانہ تقریب

کٹک: امسال نجمی اکادمی کٹک کے زیر اہتمام شاندار سیمینار، مشاعرہ اور تقسیم اسناد وایوارڈ کا پروگرام وائی ڈبلیو سی اے ہال میں مورخہ 10 مئی کو انجام دیا گیا۔ اس کا موضوع 'اردو اور ہماری ذمہ داریاں' تھا۔ پروفیسر کرامت علی کرامت کی صدارت میں مشاہیر قلمکاروں اور محبانِ اردو نے اپنے افکار وتاثرات کے ساتھ ساتھ اڑیسہ میں اردو زبان و ادب کے لیے اپنے خیالات پیش کیے۔ یہ سیمینار نجمی اکادمی اور این سی پی یو ایل کے باہمی اشتراک سے عمل میں آیا۔ جن حضرات نے اس سیمینار میں حصہ لیا ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں: میر علاء الدین، پروفیسر کرامت علی کرامت، مولانا محمد مطیع اللہ نازش، ڈاکٹر شیخ مبین اللہ وغیرہ۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی پروفیسر محمد قمر الدین خاں، سابق وائس چانسلر برہمپور یونیورسٹی نے نجمی اکادمی کی اس کوشش کو سراہتے ہوئے کہا کہ ہمیں ایسی اکادمی کی ضرورت ہے جو اردو کی بقا اور تحفظ کے لیے اس قسم کے سیمینار منعقد کر کے یہ احساس دلاتی ہے کہ ہمیں اردو جو کہ ہماری مادری زبان ہے اس کا کیسے تحفظ کیا جائے۔ مہمانِ اعزازی ڈاکٹر حسین ربی گاندھی، سابق صدر اڑیسہ ساہتیہ اکادمی نے نجمی اکادمی کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ جو کام اردو کے دانشوروں اور اردو اکادمی کو کرنا چاہیے اس کام کو نجمی اکادمی کر رہی ہے۔ اس سیمینار کی نظامت پروفیسر کرامت علی کرامت نے کی۔

دوسرے دور کا آغاز دوپہر 3 بجے مشاعرے سے کیا گیا جس کی صدارت عبدالمجید فیضی اور نقابت سمیع اللہ شاکر نے کی۔ تیسرا اور آخری دور شام 6:30 بجے شروع ہوا جس کی صدارت برداپرسن پٹنائیک نے کی جو ادارے کے صدر بھی ہیں۔ ادارے کے سکریٹری جناب سلیم اختر نے اکادمی کا رپورٹ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ادارے کی آئندہ سرگرمیوں کا اجمالی خاکہ پیش کیا۔ امسال یعنی سال 2013 اور سال 2014 کے لیے جن شخصیات کو نجمی ایوارڈ سے نوازا گیا ان کے نام حسب ذیل ہیں: سال 2013 کے لیے جناب یوسف جمال، ڈاکٹر اختر حسین شانی، جناب عبدالمجید فیضی، جناب رادھا ناتھ پردھان، مرحومہ نسیمہ بیگم، جناب سید شفیق الرحمٰن عاجز۔ سال 2014 کے لیے جن شخصیات کو نجمی ایوارڈ سے نوازا گیا ان میں جناب سید منظور احمد قاسمی، جناب سید نفیس دسنوی، جناب شیخ شمس الحق شمس، جناب میر علاء الدین، جناب الطاف نادر اور جناب ناظم قمر کے نام شامل ہیں۔ ان تمام شخصیات کو مہمانِ خصوصی جسٹس چودھری پرتاپ کیسری مشرا کے دستِ مبارک سے اسناد وایوارڈ پیش کیے گئے۔ مہمانِ خصوصی جسٹس مشرا نے نجمی اکادمی کی ستائش کی۔ اس موقعے پر اڑیسہ اردو اکادمی کے سکریٹری جناب داؤد الرحمٰن نے سال 2013 اور سال 2014 کے دوران طلبہ و طالبات نے میٹرک کے امتحان میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والے طلبا کو میڈل اور سرٹیفکٹ سے نوازا۔ آخر میں نجمی اکادمی کے صدر جناب برداپرسن پٹنائیک نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: سلیم اختر، جنرل سکریٹری، نجم اکادمی، کٹک، 15 مئی 2015

کیفی اعظمی حیات وخدمات

لکھنؤ: ووکیشنل انڈسٹریل ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی، لکھنؤ کے زیر اہتمام اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

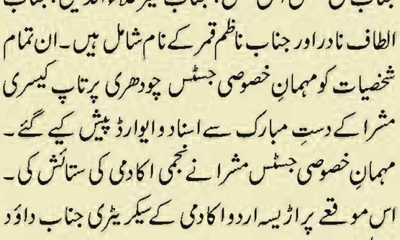

کے اشتراک سے 'کیفی اعظمی کی حیات و خدمات' کے موضوع پر سیمینار جے شنکر پرساد ہال، قیصر باغ میں اردو کے نامور ادیب وشاعر پروفیسر ملک زادہ منظور احمد کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے زرینہ عثمانی شریک ہوئیں۔ مہمان ذی وقار کی حیثیت سے ڈاکٹر انیس انصاری، ناہید لاری خان اور پروفیسر آصفہ زمانی نے سیمینار میں شرکت فرما کر پروگرام کو رونق بخشی۔ پروگرام کی نظامت مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی،

لکھنؤ کیمپس کے لکچرار ڈاکٹر عمیر منظر نے انجام دی۔ استقبالیہ کلمات ادا کرتے ہوئے کمیٹی کے جنرل سکریٹری اور پروگرام کے کنوینر عبدالنعیم نے کہا کہ محبان اردو کی کثیر تعداد میں موجودگی اس بات کی علامت ہے کہ کیفی اعظمی آج بھی ہم لوگوں کے دلوں میں زندہ ہیں، کیفی اعظمی کے سیمینار میں ادبا و شعرا کی کثرت ان کو سچی خراج تحسین ہے۔ صدارتی خطاب میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے معروف ادیب وشاعر پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے کہا کہ کیفی اعظمی کو میں ترقی پسند تحریک کی سب سے قدآور شخصیت سمجھتا ہوں، کیونکہ ترقی پسندی کے بنیادی عناصر کے تقاضے غزل پورے نہیں کرسکتی تھی، اس کے لیے نظم کی وسعت چاہیے تھی اور کیفی کی گرفت نظم پر بہت مضبوط تھی، غزل اپنی روایتوں سے انحراف کررہی تھی۔ مہمان خصوصی زرینہ عثمانی نے اپنے خطاب میں کہا کہ کیفی ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے ان کا دل انسان کے دکھ درد سے بنا تھا وہ ایک انقلابی شاعر تھے اور سماج میں جو کچھ بھی غیر صحت مند ہے اسے سماجی زندگی سے نکال پھینکنا چاہتے تھے۔ مہمانان اعزازی انیس انصاری، ناہید لاری خان اور پروفیسر آصفہ زمانی نے بالترتیب اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کیفی اعظمی کی خدمات اردو شاعری کے حوالے سے ترقی پسند تحریک اور اردو ادب کے لیے بے پناہ ہیں جس کا اندازہ ان کی کلیات سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ کیفی اعظمی کی نظموں کا مجموعہ 'جھنکار' 1943 میں شائع ہوا۔ دوسرا مجموعہ 'آخر شب' 1947 میں شائع ہوا اور تیسرا مجموعہ 'آوارہ سجدے' مکتبہ جامعہ دہلی نے شائع کیا۔ سیمینار میں شہر کی ممتاز شخصیتوں نے بھی شرکت کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 30 مئی 2015

کرشن چندر: بحیثیت طنز ومزاح نگار

سنبھل: زبیدہ خاتون ایجوکیشنل اینڈ سوشل ویلفیئر سوسائٹی میاں سرائے سنبھل کی جانب سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے مالی تعاون سے ایک روزہ قومی سیمینار بعنوان 'کرشن چندر: بحیثیت طنز ومزاح نگار' مدر پبلک اسکول میاں سرائے میں منعقد ہوا۔ معروف شاعر انجینئر انور کیفی کی صدارت اور ڈاکٹر رضاء الرحمٰن عاکف سنبھلی کی نظامت میں ہوئے۔ سیمینار کا افتتاح نوید اکرام ایڈوکیٹ نے شمع روشن کرکے کیا۔ سوسائٹی کے منیجر فرقان علی خاں نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے سیمینار کے موضوع کی اہمیت اور ضرورت پر روشنی ڈالی۔ سیمینار کے مہمانِ خصوصی میڈیا پوسٹ دہلی کے ایڈیٹر ڈاکٹر شیخ نگینوی نے کہا کہ کرشن چندر اردو کا سب سے مکمل فکشن نگار ہے۔ منشی پریم چند کے بعد اردو میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ادیب بھی کرشن چندر ہی ہے۔ انجینئر کیفی نے اپنے صدارتی خطبہ میں کہا کہ کرشن چندر ترقی پسند تحریک کے اوّلین تخلیق کاروں میں سے ہیں۔ کرشن چندر ناول نگاروں میں امام کی حیثیت رکھتے ہیں اور انھوں نے بچوں کے لیے بھی ناول لکھے ہیں۔ ستاروں کی سیر، الٹا درخت اور بچوں کی الف لیلہ ان کی تصانیف لاثانی ہیں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے پروجیکٹ اسسٹنٹ ڈاکٹر وسیم اقبال نے مقالے میں کرشن چندر کے طنز ومزاح کا جائزہ لیا۔ سید حسین افسر، ڈاکٹر زیبا ناز، غفران اسد، راشد حمیدی دھامپوری کے علاوہ ڈاکٹر رضاء الرحمٰن وغیرہ نے بھی مقالے پڑھے۔

پریس ریلیز: فرقان علی، سنبھل، 3 جون 2015

ہلال سیوہاروی: طنز ومزاح کا شاعر

نگینہ: نے ٹی ایجوکیشنل ویلفیئر سوسائٹی کے زیر اہتمام قومی اردو کونسل کے مالی تعاون سے 'ہلال سیوہاروی: طنز ومزاح

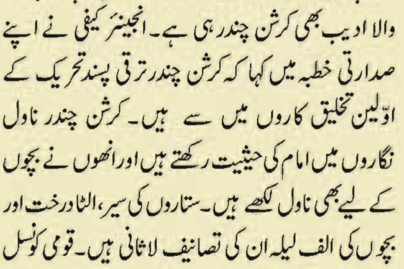

کا شاعر' کے موضوع پر ایک روزہ قومی سیمینار کا انعقاد عمل میں آیا۔ سیمینار کی صدارت انجینئر سمیع الدین نے کی اور نظامت کے فرائض شیخ نگینوی نے انجام دیے۔ سیمینار کے مہمان خصوصی سابق ریاستی وزیر منوج پارس نے اپنے خطاب میں کہا کہ ہلال سیوہاروی بین الاقوامی شہرت کے حامل شاعر تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے ضلع بجنور کا نام روشن کیا نئی نسل کو ان سے ترغیب لینی چاہیے تاکہ ادب بالخصوص طنز ومزاح کی صنف کو آگے بڑھا سکیں، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر محمد فرقان سنبھلی نے اپنے مقالے میں ہلال سیوہاروی کی شاعری پر سیر حاصل گفتگو کی۔ قومی اردو کونسل، نئی دہلی میں پروجیکٹ اسسٹنٹ ڈاکٹر وسیم اقبال نے اپنے مقالے میں ہلال سیوہاروی کی شاعری پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی امروہوی نے ہلال سیوہاروی کی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کی انفرادیت کو اجاگر کیا۔ ان کے علاوہ امن تیاگی، عمران ساغر، مفتی و امام شہر اویس اکرم، ڈاکٹر زیبا ناز وغیرہ نے بھی خطاب کیا۔ سوسائٹی کے صدر آفتاب احمد نے مہمان اور شرکا کا استقبال کیا۔ شکریے کی رسم سوسائٹی کے سکریٹری جناب معراج احمد نے انجام دی۔

پریس ریلیز: آفتاب احمد، نے ٹی ایجوکیشنل ویلفیئر سوسائٹی، نگینہ، بجنور، 2 جون 2015

'مولانا ابوالکلام آزاد کی قومی یکجہتی اور تعلیمی خدمات' پر منعقدہ سیمینار کا منظر

مولانا ابوالکلام آزاد کی قومی یکجہتی اور تعلیمی خدمات

رانچی: مرکز ادب وسائنس تعلیمی وفلاحی رجسٹرڈ ٹرسٹ رانچی کے زیر اہتمام، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے مالی تعاون سے کانٹا ٹولی واقع وائی ایم سی اے آڈیٹوریم میں 'مولانا ابوالکلام آزاد کی قومی یکجہتی اور تعلیمی خدمات ملک وملت کے حال و مستقبل کے لیے ایک مینار نور' کے موضوع پر رانچی یونیورسٹی کے سابق ڈین فیکلٹی آف ہومنیٹیز، پروفیسر قیصر ضحیٰ عالم کی صدارت میں ایک سیمینار کا انعقاد 31 مئی 2015 کو کیا گیا۔ اس موقعے پر تقریب کے مہمان خصوصی پروفیسر رمیش کمار پانڈے وائس چانسلر رانچی یونیورسٹی نے سرسید احمد خاں، پنڈت مدن موہن مالویہ اور مولانا آزاد کی گراں قدر تعلیمی خدمات اور قومی یکجہتی کے لیے ان کے بیش بہا کارناموں کا تفصیلی تذکرہ کرتے ہوئے مرکز ادب و سائنس کی تعلیمی و تہذیبی خدمات کے لیے ستائش کی۔ رانچی یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر انوار احمد خاں، مہمان اعزازی نے بصیرت افروز باتیں کیں۔ ٹرسٹ کے فاؤنڈر چیرمین پروفیسر احمد سجاد نے اپنے افتتاحی خطبے میں مولانا آزاد کی

تین نمایاں خوبیوں میں ان کی (1) عبقریت (2) ہشت پہلو شخصیت اور (3) فرقہ وارانہ ہم آہنگی پر یقین کامل کا بطور خاص تذکرہ کرتے ہوئے اس امر پر زور دیا کہ اگر مولانا کے ہندو مسلم معاصرین اور سیاست داں اور احباب مولانا کی طرح غیر منقسم ہندوستان پر اٹل رہ کر ان کا ساتھ دیتے تو نہ صرف برصغیر ہند بلکہ دکنی ایشیا اور دنیا کی موجودہ سیاسی وسماجی زندگی زیادہ پر امن اور خوشحال ہوتی۔ شری سی، ایس، جھا سی ایم ڈی ایسٹرن کول فیلڈ لمیٹڈ، معروف دانشور نے مولانا آزاد کے حوالے سے نئی نسل کی اخلاقی قدروں کی بنیاد پر تعلیم وتربیت کی ضرورت واہمیت پر بطور خاص زور دیا۔ سیمینار کے مہمان اعزازی بشپ چارلس سوریںج ایس، جے نے اختصار کے ساتھ فرمایا کہ مولانا مذہبی تنگ نظری سے کوسوں دور تھے۔

مقالہ نگاروں میں ڈاکٹر منظر حسین، ڈاکٹر سید حسن مثنیٰ رضوی، ڈاکٹر جمشید قمر، مولانا محمد طلحہٰ ندوی، محمد عالمگیر انصاری، ڈاکٹر تسلیم عارف، غزالہ پروین، محمد حذیفہ، نسیمہ خاتون، ریسرچ اسکالر رفعت عالیہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ٹرسٹ کے سکریٹری ڈاکٹر (انجینئر) طارق سجاد نے ٹرسٹ کی ایک مختصر رپورٹ پیش کی۔ یہ سیمینار ڈاکٹر رفعت آرا، چیر پرسن ٹرسٹ کی رسم شکریہ کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔

پریس ریلیز: ارشاد احمد میڈیا انچارج، مرکز ادب وسائنس، رانچی 5 جون 2015

جنگ آزادی میں اردو فنکاروں کا رول

جلگاؤں: سرسید احمد خاں لائبریری، مہروں اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے اشتراک سے 10 مئی کو جلگاؤں میں جنگ آزادی میں اردو فنکاروں کے رول پر ایک عظیم الشان سیمینار منعقد کیا گیا جس میں شہر کی معزز شخصیات نے شرکت کی۔ لائبریری کے صدر امین الدین شیخ نے سرسید احمد خاں لائبریری کا تعارف اور اس کی خدمات تفصیلی طور پر پیش کیں۔ سیمینار کا باقاعدہ آغاز جلگاؤں شہر کے ہر دل عزیز ایم ایل اے راجو ماما بھوڑے کے دست مبارک سے شمع روشن کرکے کیا گیا۔ مقالہ نگار ڈاکٹر اسرار انصاری (کھنڈوا) نے اپنے تحقیقی اور تفصیلی مطالعے میں انگریز سامراجیوں کی بالادستی کے خلاف 1857 کی جنگ آزادی سے لے کر آزادی کی دوسری لڑائی کی خوش کن لہر تک کے فنکاروں کی گویا ایک فہرست پیش کردی۔ ڈاکٹر شکیل برہانپور سیوا سدن کالج کے پروفیسر نے جنگ آزادی میں خاندیش کے شعرا کے حصے پر مقالہ پڑھا۔ مقالہ نگار ڈاکٹر ساجد قادری نے اردو شعری ادب میں جذبہ حب الوطنی پر مقالہ پیش کیا۔ جلگاؤں کے معروف شاعر افسانہ نگار اور مقالہ نگار عبدالقیوم اثر نے 'جذبہ آزادی اور اردو شعرا کا کردار' کے عنوان پر اپنا فکر انگیز مقالہ پیش کیا۔ سیمینار کے صدر ڈاکٹر عبدالکریم سالار نے اپنی صدارتی تقریر میں تمام فنکاروں کے فن کی داد دی اور پڑھے گئے مقالوں کی اہمیت کا اعتراف کیا۔ مہمان خصوصی کے طور پر بی جے پی کے ضلع سکریٹری نلیش جھوپے موجود تھے۔ مسلم اقلیتی سنگھ کے صدر جہانگیر خان، کارپوریٹر اقبال الدین پیرزادے، ڈاکٹر التمش، بھساول سے حاجی انصار، رشید قاسمی، مشتاق کریمی اور مشتاق سر وغیرہ نے بھی سیمینار میں شرکت کی۔ صابر مصطفیٰ آبادی نے نظامت کے فرائض انجام دیے جبکہ آخر میں سرسید احمد خاں لائبریری کے سکریٹری اور سیمینار کے روح رواں محمد رؤف عبدالغنی نے شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ اردو ایکشن' بھوپال، 26 مئی 2015

کونسل کا خطاطی اور گرافک ڈیزائن کا مرکز

حیدر آباد: قومی اردو کونسل کے تعاون سے چلائے جانے والے دو سالہ، ڈپلومہ کورس برائے فن خطاطی و گرافک ڈیزائن 'ادارۂ ادبیات اردو' 'ایوان اردو' ملک کا قدیم ترین تربیتی مرکز کہلاتا ہے۔ یہ 1942 سے فنِ خطاطی کے تحفظ وفروغ کی خاطر ہمہ وقت جدوجہد میں لگا ہوا ہے۔ اسی کو مدنظر رکھتے ہوئے 1979 سے قومی اردو کونسل جو پہلے ترقی اردو بیورو کے نام سے جانا جاتا تھا، کے تعاون سے یہ کورس جاری ہے۔ قومی اردو کونسل نے زمانے کی رفتار اور مارکیٹ کی مانگ کو مدنظر رکھتے ہوئے کاتبوں کو روزگار سے جوڑنے کی غرض سے نصاب میں گرافک ڈیزائن اور مختلف خطوط کو شامل کیا۔ اس کورس میں 2000 تک صرف بنیادی خطاطی کی تربیت دی جاتی تھی جس کے تحت خطِ نستعلیق کی ہی تعلیم دی جاتی رہی۔ قومی اردو کونسل نے اساتذہ فن کو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی بلوا کر گرافک ڈیزائن کی تربیت دے کر یہ نیا کورس خطاطی وگرافک ڈیزائن متعارف کیا ہے جو قابل تعریف ہے۔ تربیتی مرکز خطاطی وگرافک ڈیزائن ادارۂ ادبیاتِ اردو کے طلبا و طالبات کے تیار کردہ فن پاروں کی نمائش کا اہتمام ہر سال تربیتی مرکز کے 'ایوانِ اردو' میں 12 تا 15 دنوں کے لیے کیا جاتا ہے۔ مزید تفصیلات کے لیے مرکز سے رجوع کیا جاسکتا ہے۔

پریس ریلیز: محمد عبدالغفار، سنٹر انچارج واستاذ خطاط، حیدر آباد، 3 جون 2015

قومی اردو کونسل کے سینٹر میں جلسہ تقسیم اسناد

سیتاپور: تعلیم ترقی کی راہ کی بنیاد ہے اور کتابیں ہماری زندگی کا بیش قیمتی خزانہ ہیں۔ انسان کو اگر کسی بھی شعبہ میں بلندی تک پہنچنا ہے تو اُسے تعلیم کی سیڑھی کا استعمال کرنا پڑے گا۔ مذکورہ خیالات کا اظہار مقامی مسلم جونیئر

ہائی اسکول کے احاطہ میں قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ذریعہ قائم شدہ کمپیوٹر سینٹر سے فارغ طلبا کو اسناد کی تقسیم کاری کے دوران جلسہ تقسیم اسناد کی صدارت کرتے ہوئے ممتاز شاعر، صحافی اور صدر جمہوریہ ہند سے اعزاز یافتہ استاد مست حفیظ رحمانی نے کیا۔ جلسہ میں مہمان خصوصی کے طور پر شرکت کرتے ہوئے محکمہ ہند کے این آئی سی کے سائنسداں سنیل سریواستوا نے کمپیوٹر کی تعلیم کو انسانی زندگی کی سب سے بڑی ضرورت قرار دیا۔ جلسہ میں مہمان اعزازی محمد اشرف سعید نے بھی درسی تعلیم کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی۔

اس موقعے پر قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ذریعہ قائم شدہ مسلم جونیئر ہائی اسکول کے کمپیوٹر سینٹر سے فارغ ہوئے 26 طلبہ وطالبات کو اسناد کی تقسیم کی گئی۔ سینٹر کی سالانہ رپورٹ سینئر فیکلٹی محمد اویس نے پیش کی جبکہ نظامت کے فرائض نوجوان شاعر، صحافی اور استاد خوشتر رحمانی نے بحسن وخوبی انجام دیتے ہوئے تعلیم کی اہمیت پر بھی روشنی ڈالی۔ سینٹر انچارج حاجی محمد سلیم انصاری نے جلسہ میں آئے تمام مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: خوشتر رحمٰن خاں، سیتاپور، 1 جون 2015

'خبرنامہ' اور 'عالمی اردو نامہ' کے تحت ملک کے مختلف اردو اخبارات میں اردو کے تعلق سے شائع ہونے والی خبروں کا ڈائجسٹ ہر ماہ اس لیے پیش کیا جاتا ھے تاکہ پورے ملک میں اردو سرگرمیوں کی مجموعی صورتِ حال سامنے آسکے۔ خبروں میں دیے گئے تمام حقائق اور تبصروں کے لیے متعلقہ اخبارات ذمے دار ھیں۔ (ادارہ)

اردو سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی:

ہونہار مسلم خواتین کا اعزازی پروگرام

نئی دہلی: کوئی بھی ملک ترقی تبھی کرسکتا ہے جب اس کے شہریوں کو ترقی کے یکساں مواقع ملیں۔ وزارت

اقلیتی امور ملک کی سبھی اقلیتوں کو یکساں مواقع کے دینے کی سمت میں کام کررہی ہے اور مستقبل میں بہتر نتائج سامنے آئیں گے۔ ان خیالات کا اظہار مرکزی وزیر اقلیتی امور ڈاکٹر نجمہ ہپت اللہ نے سشکت ناری پریشد اور مسلم راشٹریہ منچ کے زیر اہتمام ماؤلنکر ہال میں 'ہونہار مسلم خواتین کا اعزازی پروگرام 2015' کے موقعے پر منعقد تقریب میں کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ مسلمانوں کی پسماندگی کی صحیح تصویر سچر کمیٹی پہلے ہی پیش کرچکی ہے۔ سچر کمیٹی کی رپورٹ سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ مسلمان اقتصادی ہی نہیں بلکہ تعلیمی اعتبار سے بھی پچھڑے ہوئے ہیں اور انھیں نوکریاں تک میسر نہیں ہیں۔ مسلم راشٹریہ منچ کے سرپرست اندریش کمار نے کہا کہ مسلمانوں کو ایمانداری کے ساتھ اپنے مذہب پر عمل کرنا چاہیے اور ہندوؤں کو اپنے مذہب پر۔ انھوں نے کہا کہ اگر سب لوگ اپنے اپنے مذاہب پر عمل کریں تو یہ دنیا جنت بن جائے گی۔ انھوں نے مزید کہا کہ لوگ ایک دوسرے سے محبت کریں اور ایک دوسرے کو انسان سمجھیں تو کوئی مسئلہ ہی نہیں پیدا ہوگا۔ انھوں نے قرآن اور احادیث کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اسلام امن کا مذہب ہے۔ انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے صدر سراج الدین قریشی نے اس موقعے پر ایوارڈ یافتگان کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ صلاحیت پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہے اور اگر مسلم بچوں اور خاص طور پر غریب و کمزور بچوں کو صرف مناسب رہنمائی مل جائے تو وہ بہتر مظاہرہ کرسکتے ہیں۔ انھوں نے زور دے کر کہا کہ فراخ دلی کا مظاہرہ بڑے بھائی کو کرنا ہوگا اور اس ملک کے مسلمان ہندوؤں کے چھوٹے بھائی ہیں۔ انھوں نے مزید کہا ہے اگر سخت گیر عناصر کی گرفت نہ کی گئی تو آئین کی پاسداری کا دعویٰ بے معنی ہوگا۔ ممبر پارلیمنٹ میناکشی لیکھی نے مختلف شعبوں میں نمایاں کردار نبھانے والی خواتین کو ایوارڈ سے نوازے جانے پر خوشی کا اظہار کیا۔ سشکت ناری پریشد کی قومی صدر دیپا نے کہا کہ ہندوستان ہی واحد ملک ہے جہاں گنگا جمنی تہذیب پروان چڑھ رہی ہے جہاں ہر مذہب اور ذات کے لوگ آپس میں مل جل کر رہتے ہیں۔ مسلم راشٹریہ منچ ہریانہ کے کنوینر خورشید راجکا نے 12 سال قبل تشکیل ہوئے منچ کے اغراض و مقاصد بیان کیے۔ اس موقع پر آل انڈیا امامس آرگنائزیشن کے صدر مولانا عمیر احمد الیاسی خاص طور پر موجود تھے۔ اس موقعے پر مختلف میدان عمل سے تعلق رکھنے والی خواتین کو ایوارڈ سے نوازا گیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 3 جون 2015

فخرالدین علی احمد کا 110واں یوم پیدائش

نئی دہلی: ملک کے سابق صدر جمہوریہ فخرالدین علی احمد کے 110 ویں یوم پیدائش کے موقعے پر ان کے مزار واقع

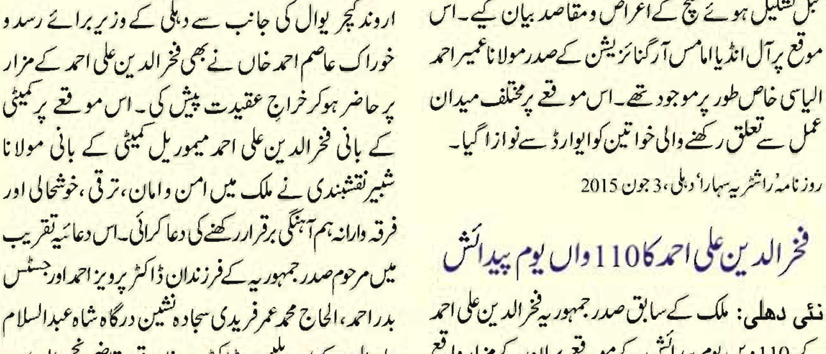

نئی دہلی جامع مسجد عقب پارلیمنٹ ہاؤس میں ایک دعائیہ تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ اس دوران صدر جمہوریہ ہند پرنب مکھرجی نے اپنے ملٹری سکریٹری کے ہاتھوں پھولوں کی چادر بھیجی اور اپنے تحریری پیغام میں کہا کہ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی سابق صدر جمہوریہ فخرالدین علی احمد کے 110 ویں یوم پیدائش کے موقعے پر 40واں قومی یوم استحکام منا رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ فخرالدین علی احمد ہندوستان کے عظیم فرزند تھے جنھوں نے ہماری روایت اور تہذیب کی سب سے بہتر نمائندگی کی۔ وہ قومی جذبہ سے سرشار اور قابل ایڈمنسٹریٹر تھے۔ نائب صدر جمہوریہ حامد انصاری نے اپنے سکریٹری محمد سلیم کے ہاتھوں پھولوں کی چادر پیش کی۔ سابق وزیراعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ نے فخرالدین علی احمد کے مزار پر چادر پوشی کی اور کہا کہ انھوں نے اپنی زندگی کی آخری سانس تک ملک کی خدمت کی اور وہ حب الوطنی کی جیتی جاگتی مثال تھے۔ ڈاکٹر منموہن سنگھ نے مولانا شبیر نقشبندی کی 40 سالہ خدمات کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ بہت کم لوگ ہیں جو اپنے بزرگوں کی یاد کو نئی نسل تک پہنچاتے ہیں۔ کانگریس کی صدر سونیا گاندھی نے بھی اپنا خراج عقیدت پیش کیا۔ دہلی کے وزیر اعلیٰ اروند کیجریوال کی جانب سے دہلی کے وزیر برائے رسد و خوراک عاصم احمد خاں نے بھی فخرالدین علی احمد کے مزار پر حاضر ہوکر خراج عقیدت پیش کی۔ اس موقعے پر کمیٹی کے بانی فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے بانی مولانا شبیر نقشبندی نے ملک میں امن و امان، ترقی، خوشحالی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی برقرار رکھنے کی دعا کرائی۔ اس دعائیہ تقریب میں مرحوم صدر جمہوریہ کے فرزندان ڈاکٹر پرویز احمد اور جسٹس بدر احمد، الحاج محمد عمر فریدی سجادہ نشین درگاہ شاہ عبدالسلام علیہ الرحمہ کناٹ پلیس، ڈاکٹر سید فاروق، قاضی نجم الدین، خواجہ شرف الدین سمیت بڑی تعداد میں لوگ شامل تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 مئی 2015

جامعہ ملیہ اسلامیہ، میں حکیم اجمل خاں انسٹی ٹیوٹ فور میڈیکل سمپوزیم کا منظر

حیدر آباد میں دو روزہ قومی سیمینار

حیدر آباد: تلنگانہ کے نائب وزیر اعلیٰ محمد محمود علی نے سالار ملت آڈیٹوریم 'اردو مسکن' خلوت حیدر آباد میں دو روزہ قومی سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے اعلان کیا ہے کہ ریاستی حکومت اردو زبان اور مسلمانوں کی ترقی کے لیے تمام ممکن اقدامات کرے گی، نصاب تعلیم میں قطب شاہی اور آصف جاہی حکمرانوں کی تاریخ کو شامل کیا جائے گا، اور تمام سرکاری، پرائیویٹ اور کارپوریٹ اسکولوں میں اردو کی تعلیم کو لازمی قرار دیا جائے گا اور جہاں کہیں دس بچے ہوں وہاں اردو کی تعلیم کا انتظام کیا جائے گا۔ انھوں نے وزیر اعلیٰ تلنگانہ کے چندر شیکھر راؤ کی قیادت میں حکومت تلنگانہ کے ترقیاتی پروگراموں اور پالیسیوں کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے اردو اکادمی کی تجویز پیش کی کہ وہ معمر اردو صحافیوں اور ادیبوں کی آسرا اسکیم کے خطوط پر ماہانہ پنشن جاری کرنے پر غور کرے۔ انھوں نے اردو مسکن کو ایئر کنڈیشنڈ بنانے کا بھی اعلان کیا اور کہا کہ حکومت نے اقلیتوں کی ترقی کے لیے جو بجٹ مختص کیا ہے اس کو مکمل طور پر خرچ کیا جائے گا۔ دو روزہ قومی سیمینار ریاست تلنگانہ کے یوم تاسیس کی مسرت میں محکمہ اقلیتی بہبود کی جانب سے چار روزہ تہذیبی و ادبی پروگراموں کے ضمن میں منعقد ہوا۔ ڈائریکٹر سکریٹری اردو اکادمی پرفیسر ایس اے شکور نے خیر مقدم کرتے ہوئے اردو زبان کو فروغ دینے اور اردو تعلیم کو ترقی دینے کے لیے اردو اکادمی کی کاوشوں کی تفصیلات بیان کیں اور کہا کہ اردو کا معیار تعلیم گھٹتا جا رہا ہے، اس میں بہتری کے لیے اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ملک بھر میں سب سے بڑا بجٹ تلنگانہ کی اردو اکادمی کا ہے، اکادمی کی کئی اسکیمات ہیں جن سے عوام کو روشناس کروانے اور شعور بیدار کرنے کے لیے بھی کئی پروگرام چلائے جا رہے ہیں اور اردو اکادمی کی جتنی بھی اسکیمیں ہیں ان میں ہر اسکیم پر صد فیصد عمل کیا جائے گا۔ پروفیسر عبدالستار دلوی (ممبئی) نے افتتاحی اجلاس کی صدارت کی۔ انھوں نے کہا کہ تلنگانہ اردو اکادمی انتہائی فعال ہے اور ملک بھر میں اس کا رول انتہائی اہم ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو مشترکہ تہذیبی ورثہ ہے اور آج کا دور بچوں کی اردو میں تربیت اور ذہن سازی کا ہے۔ پروفیسر اشرف رفیع نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے قطب شاہی دور سے لے کر آج تک اردو پر تفصیلی روشنی ڈالی اور کہا کہ آصف جاہی دور اردو کی ترقی کا سنہرا دور رہا ہے۔ موجودہ وزیر اعلیٰ کے چندر شیکھر راؤ اردو دوست ہیں اور توقع ہے کہ ان کی سرپرستی میں اردو کے سنہرے دور کا احیا ہوگا۔ پروفیسر بیگ احساس نے کارروائی چلائی اور شکریہ ادا کیا۔ سیمینار کا پہلا اجلاس دوپہر میں پروفیسر عبدالستار دلوی کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں ڈاکٹر فضل اللہ مکرم، پروفیسر نسیم الدین فریس، ڈاکٹر حبیب نثار اور پروفیسر فاطمہ پروین نے مقالے پیش کیے۔ ڈاکٹر بی بی رضا خاتون نے نظامت کی۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 5 جون 2015

جامعہ میں حکیم اجمل خاں انسٹی ٹیوٹ فار میڈیکل کا قیام

نئی دهلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ میں حکیم اجمل خاں انسٹی ٹیوٹ فار میڈیکل اینڈ ہسٹوریکل ریسرچ ان یونانی میڈیسن کا قیام عمل میں آ گیا۔ ان خیالات کا اظہار جامعہ میں حکیم اجمل خاں انسٹی ٹیوٹ فار میڈیکل اینڈ ہسٹوریکل ریسرچ ان یونانی میڈیسن کے زیر اہتمام حکیم اجمل خان کی یاد میں منعقد سمپوزیم کے دوران وائس چانسلر پروفیسر طلعت احمد نے کیا۔ پروفیسر طلعت احمد نے کہا کہ ہم حکومت کی 'کوشلیا' نام کی اسکیم کے تحت جامعہ میں سی سی آر یو ایم کے اشتراک سے یونانی طب کے تعلق سے ڈپلومہ کورس بھی شروع کر سکتے ہیں۔ ساتھ ہی اس بات کی بھی گنجائش ہے کہ یونانی طب کے محققین اور جامعہ کے بایو سائنس اور بایوٹیک شعبوں کے ریسرچ اسکالرس تحقیق میں تعاون کریں۔ انھوں نے کہا کہ ہماری کوشش ہے کہ جامعہ میں ایک میڈیکل کالج قائم ہو اور اس کے ساتھ ساتھ ایک یونانی طبیہ کالج بھی قائم ہو۔ انھوں نے مزید کہا کہ انصاری ہیلتھ سینٹر میں طب یونانی کی او پی ڈی بھی جلد شروع کی جائے گی۔ اے ایم یو اولڈ بوائز ایسوسی ایشن دہلی کے صدر ارشاد احمد نے کہا کہ جامعہ کے احاطہ میں سینٹرل کونسل ریسرچ ان یونانی میڈیسن اور جامعہ کے اشتراک سے حکیم اجمل خاں انسٹی ٹیوٹ اور میڈیکل اینڈ ہسٹوریکل ریسرچ ان یونانی میڈیسن کا قیام ایک تاریخی کام ہے اور حکیم اجمل خان کو ایک سچا خراج عقیدت ہے۔ خصوصی مقرر پروفیسر عبدالحق نے کہا کہ حکیم اجمل خاں کا یونانی طب کے فروغ میں بہت اہم رول رہا ہے اور اس سے اردو زبان و ادب کا بھی بہت فروغ ہوا ہے۔ مہمان خصوصی پروفیسر رئیس الرحمٰن نے کہا کہ حکیم اجمل خان نے یونانی طب کو غیر معمولی فروغ دیا اور حکومت ہند بھی یونانی طب کے فروغ پر دھیان دے رہی ہے اور غازی آباد میں آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن قائم کرنے کی تیاری ہے۔ اس موقعے پر ایک یونانی ڈرگس آف منرل اوریجن نامی کتاب کا بھی اجرا ہوا۔ اسی موقعے پر ڈاکٹر احمد سعید نے شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ سمپوزیم میں کل چار مقالے پیش کیے گئے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 20 مئی 2015

آل انڈیا ریڈیو اردو سروس کا نیا ایپ

نئی دهلی: آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس نے جدید ٹیکنالوجی سے مکمل طور پر استفادہ کرتے ہوئے ایک اور قدم آگے بڑھایا ہے اور اردو سروس کا نیا 'ایپ' شروع کیا ہے جس سے اب اس کے سامعین دنیا کے کسی بھی گوشے میں بھی اس کے تمام پروگرام اینڈرائیڈ کے ذریعے بآسانی سن سکتے ہیں۔ ایک بیان کے مطابق آل انڈیا ریڈیو کی ایکسٹرنل سروس ڈویژن بہت جلد اپنی ملٹی میڈیا ویب سائٹ بھی شروع کرنے والی ہے جس پر ریڈیو آن ڈیمانڈ کے ساتھ ٹیکسٹ، فوٹو، آڈیو، ویڈیو اور بھی بہت کچھ دستیاب ہوگا اور اس کے ذریعے اردو سروس کے سامعین جب چاہیں اپنی پسند کے پروگرام سن سکتے ہیں۔ اینڈرائیڈ پر اردو سروس کا نیا ایپ درج ذیل ایڈریس پر دستیاب ہے۔ خیال رہے کہ آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس گزشتہ پچاس برسوں سے نہ صرف اردو زبان کی ترویج کو فروغ دے رہی ہے بلکہ حالاتِ حاضرہ سے لے کر پردہ سیمیں تک تقریباً ہر طرح کے موضوعات سے متعلق معیاری پروگرام اپنی سامعین کی خدمت میں پیش کر رہی ہے۔ اس سال آل انڈیا ریڈیو کی ایکسٹرنل سروسز ڈویژن نے جہاں اپنے پچھتر کامیاب سال مکمل کیے وہیں اردو سروس نے بھی سنہرے پچاس سال پورے کیے ہیں۔ آل انڈیا

ریڈیو کی اردو سروس نے 24 اکتوبر 2014 کو غیرملکی سامعین کی فلمی نغموں کی فرمائش کو شامل کرنے کے لیے دیوالی کے موقعے پر واٹس ایپ خدمات شروع کیں جس کی وجہ سے بیرونِ ملک کے سامعین بھی اب اپنی فرمائشیں بآسانی اور بڑی تعداد میں بھیج رہے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اردو سروس نے نومبر 2014 سے لے کر اب تک اردو ادب اور فلمی دنیا کی لگ بھگ 40 سے زائد معتبر اور معروف ترین شخصیات پر دستاویزی پروگرام پیش کیے۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 9 مئی 2014

یونس آمرے کے نام سے منسوب لائبریری کے افتتاح کا منظر

علامہ اقبال کی حیات و خدمات پر بین الاقوامی سیمینار

کولکاتہ: اس دلیل کے ساتھ کہ تخلیقی صلاحیت سے عاری قومیں دنیا کے نقشے سے فنا ہو جاتی ہیں، علامہ اقبال حیات و خدمات کے عنوان سے بین الاقوامی سیمینار کا افتتاح کرتے ہوئے علامہ اقبال کے پوتے ولید اقبال نے کہا کہ علامہ نے اپنی شاعری کے ذریعے مسلمانوں میں تخلیقی صلاحیت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس لیے ہمیں تقلید چھوڑ کر تخلیقی قوت پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ مغربی بنگال اردو اکادمی کے زیراہتمام منعقد ہونے والے سہ روزہ اقبال کے پیغام پر تفصیلی گفتگو کی۔ جشن اقبال کے دوسرے دن 'بین الاقوامی سیمینار' سے خطاب کرتے ہوئے ولید اقبال نے مغربی بنگال اردو اکادمی کی سنٹرل لائبریری میں 'گوشۂ اقبال' کا بھی انھوں نے افتتاح کیا۔ ولید اقبال نے ہندوستان کی میزبانی اور اہل کلکتہ کے علامہ اقبال سے لگاؤ اور عقیدت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ رشتہ دونوں ملکوں کے عوام کو قریب لانے میں معاون و مددگار ثابت ہوگا۔ اس سے قبل مغربی بنگال اردو اکادمی کے زیراہتمام منعقدہ سہ روزہ 'جشن اقبال' کی افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے ولید اقبال نے مغربی بنگال کی وزیراعلیٰ ممتا بنرجی کی موجودگی میں کہا کہ ہندوستان اور پاکستان کے عوام کے مسائل و مشکلات مشترک ہیں، اس لیے اب وقت آگیا ہے کہ ہمیں ماضی کے تلخ تجربات اور یادوں سے آگے بڑھ کر دونوں ملکوں کے عوام کے بنیادی مسائل کو حل کرنے کی طرف توجہ دینی چاہیے۔

مغربی بنگال اردو اکادمی کی جانب سے علامہ اقبال کو 'بعد از مرگ ترانہ ہندی' ایوارڈ دیے جانے پر شکریہ ادا

مغربی بنگال کی وزیراعلیٰ ممتا بنرجی علامہ اقبال کو بعداز مرگ دیا گیا ترانہ ہندی ایوارڈ ان کے پوتے ولید اقبال کے سپرد کرتے ہوئے

کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ جب رابندر ناتھ ٹیگور امن کا نوبل انعام دیا گیا تھا، اس وقت علامہ اقبال کو نوبل انعام دینے کا مطالبہ بھی بلند ہوا، اس وقت کہا گیا تھا کہ علامہ اقبال آفاقی شاعر نہیں ہیں مگر تیج بہادر سپرو نے کہا تھا کہ علامہ اقبال کی شاعری آفاقی ہے اور ان کا پیغام پوری انسانیت کے لیے مشعل راہ ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ آج مغربی بنگال حکومت نے ٹیگور کی سرزمین پر علامہ اقبال کو ایوارڈ دے کر ان کے آفاقی شاعر ہونے کو سند دینے کا فیصلہ کیا ہے، جس کے لیے ہم مسرور و مشکور ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 31 مئی 2015

یونس آمرے کے نام سے منسوب لائبریری کا افتتاح

نئی دہلی: ترکی اور ہندوستان کے درمیان بہت دیرینہ تعلقات ہیں، دونوں ملکوں میں علمی، ادبی اور ثقافتی رشتے رہے ہیں۔ یہ نہایت خوش آئند بات ہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ اس تاریخی اور دیرینہ تعلقات کو مزید مستحکم کرنے کی کوشش کررہی ہے۔ ان خیالات کا اظہار ترکی کے سفیر براق اکچاپار نے شعبۂ ترکی جامعہ ملیہ اسلامیہ کی الوداعی تقریب کے موقعے پر کیا۔ انھوں نے اسی بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ شعبۂ ترکی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اپنی ذمے داری نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کررہا ہے۔ اس موقعے پر شیخ الجامعہ پروفیسر طلعت احمد اور ترکی سفیر کے ہاتھوں شعبۂ ترکی کی لائبریری کا افتتاح بھی عمل میں آیا، اس لائبریری کو ترکی کے مشہور و معروف صوفی شاعر یونس آمرے کے نام سے منسوب کیا گیا ہے، اس لائبریری کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں ترکی زبان و ادب سے متعلق تقریباً 2000 کتابیں ہیں۔ ترکی سے تشریف لائے شعبہ کے مہمان اساتذہ کی خدمت میں یادگاری مومنٹو پیش کیے گئے۔ اس کے علاوہ سال آخر کے طلبہ و طالبات کو مومنٹو سے نوازا گیا۔ ڈین آفس اسٹاف سمیر کوثر کو شعبہ ترکی کی خدمات کے لیے مومنٹو سے نوازا گیا۔ واضح رہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ ہندوستان کا واحد ادارہ ہے جہاں ترکی زبان و ادب میں گریجویشن (بی اے، آنرس) کا کورس ہوتا ہے اس کے علاوہ سرٹیفکیٹ، ڈپلوما اور اڈوانس ڈپلوما کورسیز بھی کرائے جاتے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 28 مئی 2015

دھلی:

اردو میڈیم اسکولوں کے طلبہ نے دسویں میں بھی اچھے نتائج لاکر نام روشن کیا

نئی دھلی: سی بی ایس ای دسویں جماعت کے حالیہ نتائج میں اردو میڈیم اسکولوں کے طلبہ و طالبات نے شاندار کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے مادر علمی کا نام روشن کیا ہے۔ ایس کے وی اردو میڈیم نمبر 2 جامع مسجد اسکول نے سی بی ایس ای دسویں جماعت کا رزلٹ صد فیصد پیش کیا۔ مریم ولد محمد شمیم نے سب سے زیادہ 9.4 سی جی پی اے حاصل کر کے پورے اسکول میں ٹاپ کیا۔ عالمہ اسلم ولد محمد اسلم نے 9 سی جی پی اے حاصل کر کے دوسری پوزیشن حاصل کی جبکہ عمرہ ولد محمد نیاز الدین نے 8.6 سی جی پی اے کے ساتھ تیسرا مقام حاصل کیا۔ ان کی شاندار کامیابی پر پرنسپل شبانہ نذیر اور سرپرستوں نے خوشی

کا اظہار کرتے ہوئے بچیوں کے روشن مستقبل کے لیے نیک خواہشات پیش کی ہیں۔ فتح پوری مسلم سینئر سیکنڈری اسکول نے سی بی ایس ای دسویں جماعت کے نتیجہ میں اس بار 83.3 فیصد نتیجہ پیش کیا۔ کل 65 طالب علموں نے امتحان میں حصہ لیا جن میں سے 54 طالب علموں نے کامیابی حاصل کی۔ 9.2 سی جی پی اے کے ساتھ محمد نبیل نے اسکول میں ٹاپ پوزیشن حاصل کی۔ دوسرے نمبر پر محمد حماد نے 8 سی جی پی اے حاصل کیا جبکہ محمد عبداللہ اور محمد واصف نے 7.2 سی جی پی اے کے ساتھ تیسری پوزیشن حاصل کی۔ سرودیہ بال ودیالیہ پٹودی ہاؤس اسکول کا نتیجہ بھی صد فیصد رہا۔ عامر ولد قمرالدین نے پہلی پوزیشن حاصل کی جبکہ ایاز الٰہی نے دوسرا مقام حاصل کیا۔ ہمانشو ولد نریش سینی اور محمد فہد ولد محمد واحد نے تیسری پوزیشن حاصل کی۔ دوسری جانب سی بی ایس ای بورڈ کے ذریعے دسویں جماعت کے نتائج کے بعد نظام الدین میں واقع نیوہورائزن اسکول کے طلبہ 10CGPA کے ساتھ محمد اریب ودود نے پوزیشن حاصل کی۔ 9.8CGPA کے ساتھ محمد محسن حسین نے دوسری پوزیشن اور 9.6CGPA کے ساتھ عبدالسمیع اور محمد یاسر نے تیسری پوزیشن حاصل کی۔ اس سال کل 67 طلبہ نے دسویں جماعت کے امتحان میں شرکت کی اور کامیاب رہے۔ اس سے قبل اسکول کی بارہویں جماعت کا نتیجہ بھی صد فی صد رہا اور اسکول کے تینوں شعبوں سائنس، کامرس اور ہیومنیٹیز کے سبھی طلبہ نے بہتر کارکردگی کے ذریعے نمایاں کامیابی حاصل کی۔ شعبۂ ہیومنیٹیز میں 95.25 فیصد نمبر حاصل کر کے حنا پروین نے پہلی پوزیشن حاصل کی۔ 95 فیصد نمبر کے ساتھ اریبہ عباسی نے دوسری پوزیشن اور 94.75 فیصد نمبر کے ساتھ فائزہ پروین نے تیسری پوزیشن حاصل کی۔ شعبہ سائنس میں 94.75 فیصد نمبر حاصل کر کے بشریٰ مسعود نے پہلی پوزیشن، 94.25 فیصد نمبر کے ساتھ حفصہ آصف نے دوسری پوزیشن اور 93.75 فیصد نمبر کے ساتھ محمد عمیر انصاری نے تیسری پوزیشن حاصل کی۔ جبکہ شعبۂ کامرس میں 83.5 فیصد نمبر کے ساتھ محمد سعد نے پہلی پوزیشن 76.25 فیصد نمبر کے ساتھ محمد طیب نے دوسری پوزیشن اور 74.75 فیصد نمبر کے ساتھ فردان خاں نے تیسری پوزیشن حاصل کی۔ دوسری جانب کریسینٹ اسکول موجپور دہلی کے دسویں کلاس کے 7 ٹاپر اسٹوڈنٹس جنھوں نے سی بی ایس ای کے بورڈ میں اچھے نمبرات سے کامیابی حاصل کی جن میں 22 لڑکیاں اور 42 لڑکے مجموعی تعداد 64 ہے۔ شفیق مہناز بنت ظفرالدین ظفر 93.1، مزمل اللہ ولد غوث اللہ 93.1، اریب کمال ولد کمال پرویز 89.3، الما خان بنت عارف خان 89.3، زینب فاطمہ بنت محمد یونس 89.3، کلثوم ارم بنت محمد شاکر 87.4، انشاء خان بنت پرویز اختر 87.4% حاصل کرنے میں کامیاب رہے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 30 مئی 2015

غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام فخرالدین علی احمد میموریل لیکچر کے انعقاد کا منظر

فخرالدین علی احمد میموریل لیکچر

نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام فخرالدین علی احمد میموریل لکچر کے موقعے پر ادیب و دانشور اشوک واجپئی نے 'اپنی اپنی آگ، کبیر اور غالب' کے موضوع پر خطبہ پیش کرتے ہوئے انھوں نے امیر خسرو، تلسی داس، کبیر اور غالب کو ہندوستانی تہذیب و ثقافت اور شعری روایت کا ستون قرار دیا۔ انھوں نے کبیر اور غالب کے کلام کا تقابلی مطالعہ پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ غالب اور کبیر کی شاعری کی سب سے خاص بات جس نے قاری کو سب سے زیادہ متاثر کیا وہ یہ کہ ان دونوں نے اپنی شاعری میں ایسے الفاظ کا استعمال کیا جس کا استعمال ان سے پہلے کم ہوتا تھا۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ غالب کی غزلوں میں ہمیں حادثوں کا ذکر ملتا ہے اور شادمانی کا بھی اور یہی باتیں ہمیں کبیر کی شاعری میں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ اس سے قبل غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اپنے تعارفی کلمات میں اشوک باجپئی کا خیرمقدم کرتے ہوئے خطبے کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے وائس چیئرمین ڈاکٹر پرویز علی احمد نے اپنے صدارتی کلمات میں ان عظیم شاعروں کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اس موقعے پر غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر رضا حیدر نے بھی اپنے تاثرات پیش کیے۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 26 مئی 2015

فتح پوری لائبریری کے نایاب نسخوں کے تحفظ پر وقف بورڈ سنجیدہ

نئی دہلی: دہلی وقف بورڈ کے تحت آنے والی فتح پوری لائبریری میں نادر و نایاب کتابوں کے برباد ہوئے علمی ذخیرے کو محفوظ رکھنے کے لیے دہلی وقف بورڈ نے ڈاکٹر سجاد عثمانی کو لائبریری کی حالت درست کرنے کی ذمے داری دے دی ہے۔ وہ یہاں موجود مخطوطات اور کتابوں کا تحفظ یقینی بنائیں گے ساتھ ہی لائبریری کی حالت میں بھی سدھار لائیں گے۔ دہلی وقف بورڈ کی چیئرپرسن ایڈوکیٹ رعنا صدیقی نے بتایا کہ ڈاکٹر سجاد عثمانی ڈی یو اور دارالعلوم دیوبند میں بحیثیت لابریرین اپنی نمایاں خدمات انجام دے چکے ہیں۔ ان کو بہتر تجربہ ہے۔ میں نے لائبریری کی ناگفتہ بہ حالت اور کتابوں کے قومی اثاثے کی بربادی کا ذکر کیا جس پر ڈاکٹر سجاد عثمانی نے بغیر اجرت کے لائبریری کے لیے کام کرنے کی پیش کش کی جس کو ہم نے قبول کرلیا۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر عثمانی نے اپنی مطلوبہ فہرست ہمیں بھیج دی ہے جس میں ٹیبل کرسیاں اور کمپیوٹر کے ساتھ چپراسی طلب کیا ہے۔ رعنا صدیقی نے کہا کہ اس بات سے ہم لاعلم تھے کہ لائبریری کی حالت اتنی خراب ہے کیونکہ کسی نے ہمیں اس تعلق سے نہیں بتایا۔ واضح رہے کہ شاہی فتح پوری مسجد کے جنوبی دروازے کے اوپر واقع قدیمی لائبریری میں بیس ہزار سے زائد کتابوں کا نسخہ موجود ہے اور اورنگ زیب عالمگیر کے ہاتھوں سے لکھا قرآن مجید کا نایاب نسخہ بھی موجود ہے۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 21 مئی 2015

آئی آئی سی سی میں اردو کلاسیز

نئی دہلی: انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر نے فنکاروں اور خاص طور پر گلوکاروں کا اردو تلفظ درست کرانے کے لیے

اردو کلاسز کا باقاعدہ افتتاح کیا۔ اس موقعے پر آئی آئی سی سی کے نائب صدر صفدر ایچ خان نے کہا کہ اردو پاکستان کی نہیں بلکہ ہندوستان کی زبان ہے اور اسے خالص مسلمانوں سے جوڑنا اس کی توہین ہے۔ انھوں نے کہا کہ گلوکاروں کے ذریعے نغموں میں اردو کے تلفظ کو بگاڑ کر

پڑھنے کے واقعات میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے اور اس کی وجہ سے اردو کو نقصان ہو رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ نئی نسل خواہ وہ ہندو ہو یا مسلمان فلموں اور گانوں کی زبان سن کر اپنی زبان کو ڈویلپ کرتی ہے اور جب اسے نغموں میں اردو کے غلط تلفظ سننے کو ملیں گے تو وہ بھی اردو کو اسی طرح بولے گی۔ اسی لیے انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر نے اس سمت میں کام کرنے کا فیصلہ کیا۔ پروگرام میں اردو کلاسز کے لیے اکرام مرزا اور بیگم شہناز مرزا کا بہ حیثیت استاذ تعارف کرایا گیا۔ یہ کلاسز ہفتہ میں دو دن، پیر اور منگل کو شام پانچ بجے سے سات بجے تک منعقد ہوا کریں گی۔ اردو کے فروغ کے لیے پچھلے 49 سالوں سے کام کرنے والے ایس کوہلی نے اس پروگرام کی صدارت کی۔ انھوں نے بتایا کہ آزادی سے پہلے نہ صرف ملک میں بلکہ پنجاب میں بھی سارا سرکاری کام اردو میں ہوتا تھا۔ تقریب میں بہت سے گلوکاروں نے بھی شرکت کی جن میں راگنی سنگھ، پوجا مہرا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 12 مئی 2015

جامعہ میں خصوصی مذاکرہ کا انعقاد

نئی دهلی: اکادمی برائے فروغ استعدادِ اردو میڈیم اساتذہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی میں غضنفر کی تازہ ترین تصانیف 'آنکھ میں لکنت' (شعری مجموعہ) اور 'روئے خوش رنگ' (خاکوں کا مجموعہ) کا اجرا عمل میں آیا۔ اس موقعے پر اکادمی میں دونوں کتابوں پر مذاکرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت معروف نقاد پروفیسر شمیم حنفی نے اور نظامت ڈاکٹر زبیر شاداب نے کی۔ انجم عثمانی پر غیر مطبوعہ خاکہ 'تلاشِ مشکِ شگفتگی' کے عنوان سے پیش کیا۔ پروفیسر شمیم حنفی نے اپنے صدارتی خطبے میں کہا کہ غضنفر ایک ایسے تخلیق کار ہیں جو وسعتِ خیال کی مناسبت سے نثر اور نظم کے مناسب پیرائے کا انتخاب کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نظم ونثر کی مختلف اصناف میں ان کی تخلیات وجود میں آتی رہی ہیں۔ پروفیسر خالد محمود نے خاکوں اور شاعری پر تفصیلی گفتگو کی۔ پروفیسر انور پاشا نے خاکوں کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ غضنفر کے بیشتر خاکے معاصرین سے متعلق ہیں۔ ایسے دور میں جب معاصرانہ چشمک کی بدترین مثالیں سامنے آتی رہتی ہیں۔ غضنفر کے خاکوں کی زبان نہایت شگفتہ اور رواں ہے۔ پروفیسر قمرالہدیٰ فریدی نے کہا کہ غضنفر اپنے خاکوں میں انسانی نفسیات اور اخلاقی اقدار کی مثبت ترجمانی کرتے ہیں۔ مشرف عالم ذوقی نے غضنفر کو خاکہ نگاری کی روایت کی مضبوط کڑی کے طور پر دیکھنے کی کوشش کی۔ انھوں نے کہا کہ غضنفر بنیادی طور پر فکشن نگار ہیں لہٰذا ان کے خاکوں میں افسانے کی دلکشی کا خوب خوب مظاہرہ ہوا ہے۔ انجم عثمانی نے غضنفر کے خاکوں پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ان خاکوں سے متعلقہ شخصیت کا خوبصورت تعارف ہو جاتا ہے اور ایسے قاری بھی جوان شخصیتوں کو نہیں جانتے، پورے طور پر واقف ہو جاتے ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 27 مئی 2015

غالب انسٹی ٹیوٹ میں کتاب بلراج مین را، ایک ناتمام سفر پر مذاکرے کا منظر

کتاب 'بلراج مین را، ایک ناتمام سفر' پر مذاکرہ

نئی دهلی: غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام 'شام شہر یاراں' کے موقعے پر اسکالر اور شعبہ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے استاد ڈاکٹر سرورالہدیٰ کی کتاب 'بلراج مین را: ایک ناتمام سفر' پر مذاکرہ کا اہتمام کیا گیا۔ صدارت پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کی اور مہمانِ خصوصی بلراج مین را تھے۔ ڈاکٹر رضا حیدر نے کتاب کے تعارف میں کہا کہ 'بلراج مین را: ایک ناتمام سفر' مین را پر پہلی باضابطہ کتاب ہے۔ ڈاکر خالد جاوید نے بلراج مین را کی افسانہ نگاری پر اظہار خیال کیا کہ جدیدیت کی کہانی بلراج مین را کی کہانیوں کے بغیر اپنا کوئی اختصاص قائم نہیں کر سکتی۔ سرورالہدیٰ نے مین را کی کہانیوں کو ایک سنجیدہ قاری کے طور پر سمجھنے اور تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے، انھوں نے تجزیہ میں اُن تمام امکانات کو کھنگالنے کی کوشش کی ہے جو عموماً تنقیدی انا کے سبب اوجھل رہے۔ فرحت احساس نے بھی اپنے تاثرات پیش کیے۔ پروفیسر شمیم حنفی نے بلراج مین را ایک ناتمام سفر کی اشاعت، مذاکرے اور مین را کی شرکت کو ایک اہم واقعہ قرار دیا۔ سرورالہدیٰ نے مطالعہ کا جو رخ اختیار کیا ہے اسے ہم متن کے گہرے مطالعے کا نام دے سکتے ہیں۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اپنی صدارتی تقریر میں بلراج مین را ایک ناتمام سفر کی اشاعت کو نئے افسانہ کی تنقید میں ایک اہم اضافہ قرار دیا۔ اردو کے استاد ڈاکٹر شفیق حسین شفق نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 مئی 2015

اردو ڈرامہ 'اورنگ زیب'

نئی دهلی: اردو ڈرامہ 'اورنگ زیب' ماہ اپریل کی 25 تاریخ کی صبح 11/ بجے دہلی کے منڈی ہاؤس میں واقع شری رام سینٹر آڈیٹوریم میں پیش کیا گیا۔ پہلے بھی یہ ڈرامہ کئی بار 'انڈیا انٹرنیشنل سینٹر' اور 'کمانی آڈیٹوریم' میں کھیلا جا چکا

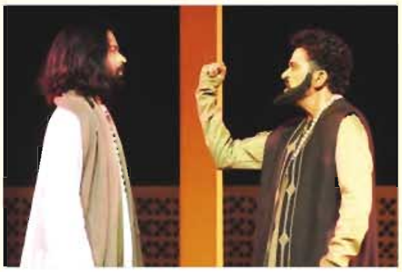

ہے۔ انجمن ترقی اردو کے 2013 کے 'داراشکوہ سیمینار' کے دوران یہ ڈرامہ ایوانِ غالب آڈیٹوریم میں اسٹیج ہونا تھا مگر اس سے قبل ہی اس کی نمائش منسوخ کر دی گئی۔ کمانی آڈیٹوریم میں ممتاز سیاستدان ایل کے ایڈوانی بھی ناظرین کی صف میں موجود تھے۔ ڈرامے کے اختتام پر انھوں نے اپنے تبصرے میں فرمایا تھا کہ اس کھیل میں اورنگ زیب کی زندگی کے کچھ نئے پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے میں گھر جا کر ان کی سوانح دوبارہ پڑھوں گا۔ یہی ڈرامہ دہلی ناٹیہ اتسو میں 23 جنوری 2014 کو شام ساڑھے چھ بجے شری رام سینٹر میں پھر دکھایا گیا۔ ڈرامہ مذکور کو ساہتیہ اکادمی سے انعام یافتہ مصنف اندرا پارتھا سارتھی نے تحریر کیا تھا اور ہدایت کار نیشنل اسکول آف ڈرامہ کے استاد کے ایس راجندرن تھے۔ اس ڈرامے کا انگریزی ترجمہ ٹی سری رمن نے اور اردو/ہندی ترجمہ شاہد انور نے کیا تھا۔ اس ڈرامہ کا دورانیہ دو گھنٹے ہے۔ ڈرامہ کی کہانی کا مرکزی خیال مغلیہ سلطنت کے وارث دو شہزادوں اورنگزیب اور داراشکوہ کی دہلی کے تخت کے حصول کی کشمکش کی داستان ہے۔ اساسی کرداروں میں اورنگزیب کے رول میں مہندر میواتی اور داراشکوہ کے کردار میں عمران رضا ہیں۔

پریس ریلیز: جاوید حمید، نئی دہلی، 8 جون 2015

آندھرا پردیش:

محفلِ اقبال شناسی، کی 800 ویں نشست

محفل اقبال شناسی کی 800 ویں نشست کا 2 اپریل بروز جمعہ بعد نماز مغرب اردو ہال حبیب گلشن حمایت نگر میں انعقاد عمل میں آیا۔ جناب سید امتیاز الدین نے جو خود بھی ماہر اقبالیات ہیں کہا کہ علامہ اقبال کا حیدرآباد سے خاص تعلق رہا ہے۔ بانگ درا جو اردو کلام ہے وہ سب سے پہلے حیدرآباد سے شائع ہوا ہے۔ انھوں نے کہا کہ محفل اقبال شناسی کی 800 ویں نشست میں سمجھتا ہوں ساری دنیا میں ایک ریکارڈ ہے۔ جناب ڈاکٹر شمشاد حسین اور جناب افتخار حسین نے گل پوشی کے فرائض انجام دیے۔ جناب محمد عبدالرحیم خان معتمد عمومی انجمن ترقی اردو نے تجویز پیش کی کہ محفل اقبال شناسی کے لیے مستقل فنڈ قائم کیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ علامہ اقبال کے ساتھ اگر الطاف حسین حالی کے کلام پر بھی اس قسم کا کام کیا جائے تو لوگ حالی سے واقفیت حاصل کریں گے۔ جناب ضیاء الدین نیر نائب صدر اقبال اکادمی نے علامہ اقبال پر لکھی گئی تصانیف پر سیر حاصل تبصرہ کیا۔

روز نامہ 'منصف' حیدرآباد، 7 مئی 2015

اے پی اردو لینگویج ٹیچرس ایسوسی ایشن کا انتخاب

کڑپہ: ریاست آندھرا پردیش اردو لینگویج ٹیچرس ایسوسی ایشن کا قیام حال ہی میں حیدرآباد کچی باؤلی کے آر ٹی سی میں عمل میں آیا جس میں اے پی اسٹیٹ کے 13 اضلاع کے اردو لینگویج ٹیچرس نے شرکت کی۔ انتخابات کے مشاہدہ کار کی حیثیت سے ایس ایس سی آر ٹی کے اردو کوآرڈینیٹر ارشاد بیگ رہے۔ ریاست آندھرا پردیش میں اردو لینگویج ٹیچرس کی یہ پہلی ایسوسی ایشن ہے۔ متفقہ طور پر انتخابات ہوئے اعزازی صدر حافظ عبدالرؤف کرنول، صدر قلندر بادشاہ چتور، جنرل سکریٹری ستار فیضی کڑپہ، نائب صدر رحمٰن خان نیلور، شریک معتمد محمود گنٹور، خازن فیروز احمد اننتاپور، ارکان مجلس عاملہ میں محمد جیلانی پرکاشم، سید خواجہ معین الدین ایسٹ گوداوری، محمد جابر کرنول، قدرت اللہ کرشنا، ڈاکٹر رحمت اللہ چتور، فیاض الرحمٰن کڑپہ، عبدالرزاق اننتاپور، ربانی گنٹور، متفقہ رائے سے چناؤ ہوا۔ معتمد عمومی ستار فیضی نے کہا کہ یہ انجمن اردو زبان کے اساتذہ کے حقوق کے لیے ہی نہیں بلکہ اردو زبان و ادب اور تہذیب و ثقافت کی ترقی و بقا کے لیے کام کرے گی۔

روز نامہ 'رہنمائے دکن' حیدرآباد، ص 10

اتر پردیش:

یوپی کے 99 مدارس گرانٹ لسٹ میں شامل

لکھنؤ: وزیر اعلیٰ اکھلیش یادو کی صدارت میں منگل کو ہوئی کابینہ کی میٹنگ میں عالیہ سطح تک کے مستقل تسلیم شدہ 99 مدارس کو گرانٹ لسٹ پر لینے کی تجویز کو منظوری دے دی گئی۔ مذکورہ 99 مدارس میں ان چھ مدارس کو بھی شامل کیا گیا ہے جنھیں ہائی کورٹ کے احکام پر عمل درآمد کے تحت پہلے ہی گرانٹ لسٹ پر لیا جا چکا ہے اور انھیں بھی منظور دے دی گئی ہے۔ حکومت کی سطح پر تشکیل کمیٹی کے ذریعے اہل پائے جانے والے 93 مدارس کو گرانٹ لسٹ پر لینے کا فیصلہ کابینہ کی میٹنگ میں کیا گیا۔ مدارس کو دو مرحلوں میں گرانٹ لسٹ پر لینے کی تجویز کی بھی کابینہ نے سفارش کردی ہے۔ واضح رہے کہ دینی مدارس کے فروغ اور ان کے تعلیمی معیار کو بہتر بنانے کے لیے ریاستی حکومت نے 2003 تک کے مستقل تسلیم شدہ مدارس میں سے 146 مدارس کو گرانٹ لسٹ پر لینے کی ترجیح کا تعین کرتے ہوئے انھیں آئندہ دو برسوں میں گرانٹ لسٹ پر لینے کا فیصلہ کیا تھا۔ فیصلہ پر عمل درآمد کے لیے مدارس کو گرانٹ لسٹ پر لینے کے لیے شرائط اور معیار مقرر کیے گئے تھے اور تجاویز حاصل کی گئیں۔

ڈائریکٹر محکمۂ اقلیتی بہبود کے ذریعے 192 مدارس پر سفارش سمیت رپورٹ مہیا کرائی گئی ان میں سے 6 مدارس کو ہائی کورٹ کے احکام پر عمل درآمد میں 20 مارچ 2015 کو گرانٹ لسٹ پر لیا گیا ہے۔ بقیہ 186 تجاویز پر مدارس کو گرانٹ لسٹ پر لینے کے لیے تشکیل کمیٹی کے ذریعے 27 فروری 2015 کے حکم نامے میں مقررہ معیار اور شرائط کو مکمل کرنے کے حالات کے پیش نظر 93 مدارس کو اہل پاتے ہوئے ان کی رجسٹریشن کے تاریخ سے سینئرٹی کی بنیاد پر گرانٹ لسٹ پر لینے کی سفارش کی گئی ہے۔ رجسٹریشن اور سروس ضابطہ 1987 کے قانون 22 پر عمل درآمد کیے جانے پر ضابطہ کے مطابق مقرر ٹیچر/غیر تدریسی ملازمین کو تنخواہ دی جاسکے گی۔ اس سلسلے میں رجسٹرار اتر پردیش مدرسہ تعلیمی بورڈ کے ذریعے تصدیق کے بعد ضروری کارروائی کی جائے گی۔ ان شرائط اور پابندی کے تحت ہی 93 مدارس کو گرانٹ لسٹ پر لیا گیا ہے۔ ماضی میں جاری جس حکم نامہ کا ذکر کیا گیا ہے اس کے مطابق ہر مدرسہ میں ایک پرنسپل، 12 ٹیچر اور ایک کلرک اور ایک چپراسی سمیت کل 15 عہدوں کا تعین کیا گیا ہے جس کے لیے چھٹویں تنخواہ کمیشن کی سفارشات کے مطابق ہر مدرسہ پر کل 46 لاکھ 6 ہزار 612 روپے سالانہ خرچ آنا فطری ہے۔ اس طرح 146 مدارس کو گرانٹ لسٹ پر لینے جانے کے لیے مالی برس 16-2015 میں 41 کروڑ 80 لاکھ روپے کے بجٹ کا نظم کیا گیا ہے۔

روز نامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 20 مئی 2015

اردو اکادمی کی جانب سے 8 ہونہار طالبات کو چیک تقسیم

امروہہ: یوپی اردو اکادمی کی جانب سے بیڑی ورکرس مسلم گرلس انٹر کالج میں 8 ہونہار طالبات کو چیک تقسیم کیے گئے جس میں سماجی کارکن محبوب حسین زیدی اور منیجر آفتاب الدین فریدی نے اردو زبان پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ہم اردو کو دوسری سرکاری زبان طے کیے جانے پر یوپی حکومت کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ انھوں نے یوپی حکومت کی جانب سے آئی اے ایس اور پی سی ایس اردو اکادمی کوچنگ سینٹر شروع کرنے پر بھی خوشی کا اظہار کیا اور اردو اکادمی کے چیئرمین نواز دیوبندی کو مبارکباد بھی پیش کی۔

روز نامہ 'صحافت' دہلی، 21 مئی 2015

اردو اکادمی کی جانب سے اردو میں اول آنے والی طالبات کو انعام

امروہہ: ہاشمی گرلس انٹر کالج میں اتر پردیش اردو اکادمی کے ذریعے اردو میں اول آنے والی طالبات کو چیک تقسیم کیے

گئے جس میں کل 13 طالبات کو 700 و 800 روپے کے چیک دیے گئے۔ جنھوں نے گزشتہ سال 15-2014 میں یہ مقام حاصل کیا تھا۔ انھوں نے اپنے اساتذہ و پرنسپل کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر کالج منیجر و اتر پردیش انجمن ترقی اردو کے نائب صدر حکیم سراج الدین ہاشمی نے طالبات کی حوصلہ افزائی کی، ساتھ ہی فی طالبہ کو اردو زبان کو زیادہ سے زیادہ عمل میں لانے کی تاکید کی۔ اس موقعے پر کالج کی اردو ٹیچر گلناز، و ریحانہ اور پرنسپل حنا خاں نے بھی طالبات کو مبارکباد دیتے ہوئے ان کی حوصلہ افزائی کی۔

روز نامہ 'خبریں' دہلی، 20 مئی 2015

رام پور میں کتاب میلے کا انعقاد

رام پور: الحسنات بک ورلڈ پبلشر کی جانب سے شمسی گرلز انٹر کالج دو محلہ روڈ کے وسیع وعریض ہال میں ایک کتاب میلے کا انعقاد کیا گیا۔ بچوں کے لیے معلوماتی وذہن سازی کی کتب پر مبنی اس میلے میں اسکول کی طالبات کے ساتھ ہی عام لوگوں نے بھی کافی جوش وخروش کا مظاہرہ کیا۔ اس موقعے پر الحسنات پبلشرز کے انچارج عبدالباری وسیم نے بتایا کہ اس کتاب میلے کا مقصد بچوں تک ایسی کتب کی رسائی ہے جو ان کے اخلاق وکردار کو بہتر بنانے کے لیے ضروری ہیں نیز بچوں اور نوعمروں میں کتابوں سے محبت اور شغف پیدا کرنا بھی ہمارا اہم مقصد ہے۔ انھوں نے کہا کہ اسی مقصد کے تحت مختلف اسکولوں میں کتابی میلہ لگانے کی مہم چلائی جارہی ہے جس کے تحت شمسی گرلز انٹر کالج میں یہ میلہ لگایا گیا ہے۔ اس موقعے پر عبدالباری وسیم نے شمسی گرلز انٹر کالج کی انتظامیہ اور اسٹاف کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 11 مئی 2015

ازہر ہند کی عظیم لائبریری میں 17 زبانوں پر مشتمل نادر ونایاب کتابیں موجود

دیوبند: ایشیا کی عظیم دینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند نے ہندوستان کو تاریخی عمارتیں، عالمی شہرت یافتہ علما، بلند پایہ

فقہا اور عظیم مقررین کے ساتھ ساتھ ملک و نایاب کتب خانہ بھی دیا ہے دارالعلوم دیوبند میں واقع یہ ہندوستان کا پہلا ایسا کتب خانہ ہے جس کو نہ تو سرکاری مدد ملتی ہے اور نہ ادارہ کی جانب سے اس کے لیے کوئی بجٹ خاص کیا جاتا ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے اس تاریخی کتب خانہ میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ کتابیں موجود ہیں جن میں زیادہ تعداد ان کتابوں کی ہے جن کو مختلف طبقات کے لوگوں نے ادارہ کو ہدیہ کیا ہے۔ اس کتب خانہ میں 17 زبانوں میں مختلف مضامین کی کتابیں موجود ہیں۔ ان میں عربی، فارسی، اردو، انگریزی، ہندی، گجراتی، پنجابی، تیلگو، تمل، فرانسیسی، بنگلہ، ترکی، ملیالم، مراٹھی، سندھی اور برمی زبانیں شامل ہیں۔ اس کتب خانے میں خوش خط تحریر میں ہاتھ سے لکھی ہوئی کتابیں موجود ہیں، جو فن خطاطی کے نایاب نمونے ہیں۔ 800 / 900 سال پرانی بادشاہوں، نوابوں کے زمانہ میں ہاتھ سے لکھی ہوئی تاریخی کتابیں اس کتب خانہ کی شان میں چار چاند لگا رہی ہیں۔ مشہور مغل بادشاہ اورنگ زیب کے ذریعہ لکھا گیا قرآن شریف، کندن لال سکندر آبادی کے ذریعہ لکھا گیا امیر نامہ اور سلطان سنگھ کے ذریعہ لکھی گئی گلستاں شیخ سعدی یہاں موجود ہیں۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 12 مئی 2015

'کیف مرادآبادی شخص اور شاعری'

مرادآباد: شاعر کیف مرادآبادی کے 108 ویں یوم پیدائش کے موقعے پر حمد ونعت فاؤنڈیشن مرادآباد کے زیر اہتمام ایک مذاکرے بعنوان 'کیف مرادآبادی شخص اور شاعری' کا انعقاد کیا گیا۔ مذاکرے کی صدارت مشہور شاعر گوہر زادہ منصور عثمانی نے ونظامت کے فرائض ڈاکٹر محمد آصف حسین نے انجام دیے، جبکہ بطور مہمان خصوصی مسلمہ گرلز ڈگری کالج کے پرنسپل ڈاکٹر منصور احمد صدیقی نے شرکت کی۔ مذاکرے میں مقررین نے کیف مرادآبادی کی شخصیت و شاعری پر اپنے مقالے پیش کرتے ہوئے ان کا نمونہ کلام بھی پیش کیا۔ ڈاکٹر محمد آصف حسین نے کیف مرادآبادی کی نثری خدمات پر سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ کیف صاحب جہاں ایک طرف شاعر فطرت تھے تو دوسری طرف بہترین نثر نگار اور انشاپرداز اور صحافی بھی تھے۔ سید محمد ہاشم قدوسی نے کہا کیف صاحب ایک صوفی منش شخص تھے، وہ انسانی ترقی اور اخلاقی اقدار کے فروغ کے لیے زندگی بھر کوشاں رہے۔ اس موقعے پر دیگر شرکا نے بھی اپنے خیالات پیش کیے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 26 مئی 2015

یوپی بورڈ کا پرچہ اب اردو میں

لکھنؤ: ثانوی تعلیم کے وزیر محبوب علی نے کہا ہے کہ درجہ 9 سے بارہویں تک ریاست کے تمام سرکاری اور تسلیم شدہ

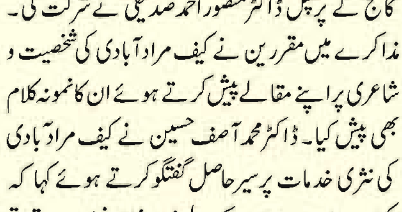

غیر سرکاری اسکولوں میں جہاں اردو مضمون پڑھنے والے طالب علم ہوں گے، وہاں اردو ٹیچروں کی تقرری حکومت کرے گی، یوپی بورڈ کا پرچہ اردو میں بھی طلبہ کو مہیا کرایا جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی تمام کالجوں کی لائبریریوں میں اردو اخبارات و اردو رسائل لازمی طور سے منگائے جائیں گے۔ انھوں نے کہا کہ تسلیم شدہ ایڈیڈ اور اور غیر ایڈیڈ کالجوں میں سائن بورڈوں پر نام وغیرہ ہندی کے ساتھ اردو میں بھی تحریر کرائیں گے جیسا کہ چیف جسٹس آف انڈیا آر ایم لوڈھا کی سربراہی والی پانچ رکنی بنچ نے اترپردیش میں اردو کے لیے دوسری سرکاری زبان کے درجہ پر اپنی مہر لگائی ہے۔ سرکاری زبان کی حیثیت سے ایک کام سرکاری ونیم سرکاری اداروں میں سائن بورڈوں اور نام کی تختی کو ہندی کے ساتھ اردو میں لکھنا بھی ہے۔ محبوب علی نے مذکورہ یقین دہانی آل انڈیا غنی تعلیمی مرکز کے ایک وفد سے ملاقات کے وقت کرائی۔ انھوں نے اپنے محکمہ کے پرنسپل سکریٹری کو اس بارے میں تمام ماتحتوں کو حکم نامہ بھی جاری کرنے کو کہا۔ اس موقعے پر ابتدائی تعلیم کے وزیر محمد وسیم نے کہا کہ محبان اردو کو چاہیے کہ وہ سپریم کورٹ کے اس فیصلے کی روشنی میں اردو کی ترقی کے لیے منظم کوشش کریں۔ ضیاء الدین رضوی نے کہا کہ محبان اردو کو چاہیے کہ اردو تعلیمی مراکز قائم کریں جس میں اردو نہ جاننے والے افراد کو اردو تعلیم دینے کا معقول نظم کریں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 10 مئی 2015

عصمت چغتائی: شخصیت اور قلم کار

لکھنؤ: عصمت چغتائی اردو ادب کا وہ معتبر نام ہے جس کی تحریروں میں ادب کے ساتھ ساتھ تہذیب، تاریخ، معاشرہ کی بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ عصمت چغتائی نے روایات کے دامن سے وابستہ خواتین کے حال کو بہت خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کی تمام تحریروں میں کسی نہ کسی واقعہ، حالات کی ترجمانی ہے، جسے انھوں نے اپنے اسلوب وبیان میں اس طرح پیش کیا کہ وہ ادب کا حصہ بن گیا اور قاری نے دلچسپی سے اسے پڑھا۔ ان خیالات کا اظہار مقررین نے اسٹار رائزنگ ویلفیئر فاؤنڈیشن کے تحت ہوئے سیمینار 'عصمت چغتائی شخصیت اور قلم کار' میں کیا۔ یوپی پریس کلب میں ہوئے سیمینار کی صدارت ممتاز انٹر کالج کے سابق پرنسپل عبدالسلام صدیقی نے کی۔ اس موقعے پر شاعرہ سلمیٰ حجاب نے کہا کہ عصمت چغتائی نے بہت بے باکی سے اپنی تحریروں میں خواتین کے مسائل کو پیش کیا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر عشرت ناہید نے 'خواتین کی کہانی عصمت چغتائی کی زبانی' کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے ادب

میں نسوانی کردار اور مشرقی معاشرہ میں حالاتِ نسواں پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ شان اسلام نے انگریزی ادب کے حوالے سے عصمت چغتائی کی خدمات پر گفتگو کی۔ صدر سیمینار عبدالسلام صدیقی نے عصمت چغتائی سے اپنے دیرینہ تعلقات کے حوالے سے گزشتہ صدی میں ادب و معاشرہ میں ان کی شناخت پر روشنی ڈالی۔ سیمینار کی نظامت معاذ اختر احسن نے کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 26 مئی 2015

ہندی یوم صحافت کا اہتمام

سہارنپور: ہندی یوم صحافت کے موقعے پر مختلف مقامات پر پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ تفصیلات کے مطابق انقلابی صحافی گنیش شنکر ودیارتھی سے منسوب یوم صحافت پر جن منچ گاندھی پارک کے آڈیٹوریم میں ایک کلچرل پروگرام

کا انعقاد کیا گیا جس میں کمشنر تنویر ظفر علی اور ایس ایس پی نتن تیواری نے اپنے نغموں اور گیتوں سے رنگ بھر دیا۔ ممبئی کی شویتا آنند نے بھی گیت سنایا۔ اس موقعے پر کمشنر تنویر ظفر علی نے کہا کہ صحافت کو زبان کے خانوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ صحافی کسی بھی زبان کا ہو، صحافت کا کام یکساں ہوتا ہے۔ انھوں نے جمہوریت میں صحافت کی اہمیت کا بھی ذکر کیا۔ سابق وزیر مملکت سنجے گرگ نے گنیش شنکر ودیارتھی کی صحافتی خدمات اور قربانیوں پر روشنی ڈالی اور صحافیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آج کے صحافیوں کو گنیش شنکر ودیارتھی کے آدرشوں اور اصولوں کے مطابق صحافت کرنی چاہیے۔ دریں اثنا ہندی اور اردو کے سرکردہ اور سینئر صحافیوں کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کو گنیش شنکر ودیارتھی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ انھیں کمشنر تنویر ظفر علی، ڈی ایم انرویر سنگھ، اے ڈی ایم (ایس) او پی یادو اور ایس ایس پی نتن تیواری کے ہاتھوں ٹرافی اور شال دیے گئے۔ اعزاز حاصل کرنے والوں میں وی وی گوتم، اکھلیش پربھاکر، چرنجی لال پنت، ڈاکٹر وریندر اعظم، پون شرما وغیرہ کے علاوہ اردو صحافیوں میں شبیر شاد، احمد رضا اور شاہد زبیری کا نام شامل ہے۔ پروگرام کا انعقاد پیٹ تھیٹر ایسوسی ایشن نے کیا تھا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، یکم جون 2015

جون ایلیا: فن اور شخصیت

امروہہ: سرزمین امروہہ میں پیدا ہوئے برصغیر کے ممتاز شاعر جون ایلیا نے پوری دنیا میں امروہہ کا نام روشن

کیا ہے لیکن افسوس کہ جون ایلیا کے نام سے آج بھی کسی بڑی عمارت، مخصوص شاہراہ اور کسی گیٹ کو منسوب نہیں کیا گیا، نئی نسل تک جون صاحب کی خدمات پہنچانے کے لیے ضروری ہے کہ اس جانب بھی خدمات انجام دی جائیں، ان خیالات کا اظہار ضلع کے افسر برائے اقلیتی فلاح و بہبود عبدالمجید خاں نے آئی ایم انٹر کالج کے میدان میں منعقد ایک سیمینار میں خطاب کیا۔ سرزمین علم ادب کی قدیمی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے یہاں کی نوجوان نسل کی قائم کردہ تنظیم آئی ایم کالج اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے زیراہتمام اردو شاعری کے ذریعے امروہہ کو ممتاز شہرت دلانے والے عالمی شہرت یافتہ شاعر جون ایلیا کی زندگی پر ایک روزہ سیمینار کا اہتمام بعنوان جون ایلیا فن اور شخصیت کا انعقاد شہر کی معروف علمی درسگاہ امام المدارس انٹر کالج امروہہ میں کیا گیا جس میں کثیر تعداد میں اہل علم حضرات اور سماجی، سیاسی و ادبی شخصیات نے حصہ لیا اور جون ایلیا کی شاعری و ان کی ادبی خدمات پر تبادلہ خیال پیش کیا گیا۔ عالمی مرثیہ سینٹر کے چیئرمین ڈاکٹر عظیم امروہی کی صدارت میں منعقد ہوئے اس سیمینار کا افتتاح ڈپٹی کلکٹر آزاد بھگت و ضلع اقلیتی افسر عبدالمجید خاں نے شمع روشن کی۔ رسم گل پوشی کے بعد ایسوسی ایشن کی جانب سے شائع خصوصی مجلّہ کی رونمائی مہمانان کے دست مبارک سے عمل میں لائی گئی۔

رضوان امروہی نے جون ایلیا کی غزل پیش کی اور یونس زیدی نے پیمبر عباس نقوی کے ذریعے جون صاحب کے انتقال پر لکھا گیا مرثیہ پیش کیا۔ ڈاکٹر چندن نقوی، ممتاز صحافی پریس کلب کے صدر ڈاکٹر مہتاب امروہی نے مقالے پیش کیے۔ صدر جلسہ ڈاکٹر عظیم امروہی نے صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے تمام مقالات پر رائے پیش کی۔ اخیر میں امداد عابدی نے شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 2 جون 2015

تلنگانہ:

تلنگانہ میں زبان اول کے طور پر اردو کی منظوری

حیدرآباد: تلنگانہ میں طلبا اب اردو کا پہلی سرکاری زبان کے طور پر انتخاب کرسکتے ہیں۔ ریاست کے وزیراعلیٰ کے چندر شیکھر راؤ نے اسکول اور اعلیٰ تعلیم میں اردو کو زبان اوّل کے طور پر استعمال کرنے کی اس تجویز کو منظوری دے دی ہے۔ فی الحال اردو زبان دوم کے طور پر ہی پڑھائی جارہی ہے جب کہ تیلگو پہلی سرکاری زبان ہے۔ قواعد میں کی گئی ترمیم کے بعد دلچسپی رکھنے والے طلبا زبان اوّل کے طور پر اردو میں تعلیم حاصل کرسکتے ہیں۔ تیلگو سے دلچسپی رکھنے والے طلبا کے لیے زبان اوّل کے طور پر برقرار رہے گی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ شہر حیدرآباد کی عثمانیہ یونیورسٹی ملک کی پہلی اردو میڈیم یونیورسٹی تھی یہاں پر کئی برسوں تک اردو میں تعلیم دی جاتی رہی۔ وزیراعلیٰ نے تلنگانہ کے ہر ضلع میں اقلیتی طبقات کے لیے علیحدہ اقامتی اسکولس اور ہاسٹلس کا بھی اعلان کیا اور اس سلسلے میں احکامات جاری کیے۔ انھوں نے اقلیتی گروپس کے اہل طلبا کے لیے پری میٹرک اسکالرشپس دینے کا بھی فیصلہ کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 21 مئی 2015

جموں و کشمیر:

سنٹرل یونی ورسٹی آف کشمیر میں توسیعی خطبہ

سرینگر: اردو کے معروف نقاد، محقق اور سابق صدر شعبۂ اردو، جموں یونی ورسٹی پروفیسر ظہورالدین نے شعبۂ اردو، سنٹرل یونیورسٹی آف کشمیر میں نہایت اہم موضوع 'متحرک، ساکن اور موقوف' پر ایک پرمغز اور بصیرت افروز خطبہ میں پیش کیا۔ انھوں نے متحرک، ساکن اور موقوف کو جدید لسانیات کی روشنی میں دیکھنے کی کوشش کی اور بہت سارے مروجہ اصول وضوابط کو رد کرنے کی سعی بھی کی۔ ان کا ماننا ہے کہ پہلے حرف نہیں بلکہ لفظ معرض وجود میں آئے ہیں۔ بعدازاں انسانی ذہن کی ترقی پذیری کے بعد حرف سازی کا کام ہوا ہے۔ اس پروگرام کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر نذیر احمد ملک نے کہا کہ زبان کے صوتی اور تحریری دونوں پہلوؤں پر غور کرنا ضروری ہے۔ انھوں نے پروفیسر ظہورالدین کے نظریے کے متعلق کہا کہ یہ پروفیسر ظہورالدین کا اپنا ذاتی نظریہ ہے اور اس میں اختلاف اور اتفاق دونوں کی گنجائش ہیں۔ پروگرام کے اخیر میں شکریہ کی رسم ڈاکٹر پرویز احمد اعظمی نے انجام دی۔ اس موقعے پر شعبۂ کے اساتذہ کے علاوہ طلبا و طالبات کی کثیر تعداد موجود تھی۔

پریس ریلیز: پروفیسر نذیر احمد ملک، شعبہ اردو سنٹرل یونیورسٹی آف کشمیر، 14 مئی 2015

دو روزہ نیشنل یونانی طبی سیمینار کا منظر

دو روزہ نیشنل یونانی طبی سیمینار

سرینگر: آل انڈیا یونانی طبی کانگریس (جموں وکشمیر یونٹ) کے زیر اہتمام بسلسلہ سلور جوبلی تقریبات 2015 کا انعقاد گاندھی بھون، کشمیر یونیورسٹی، سرینگر میں 13-12 مئی 2015 کو دو روزہ نیشنل یونانی طبی سیمینار عمل میں آیا۔ جس کا افتتاح کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر خورشید آئی اندرابی نے کیا۔ اس موقعے پر کشمیر کے معروف طبیب سی سی آر یو ایم کشمیر یونٹ کے سابق سربراہ بابائے طب حکیم محمد یوسف لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے سرفراز کیے گئے۔ یہ ایوارڈ انھیں وائس چانسلر پروفیسر خورشید آئی اندرابی کے بدست دیا گیا۔ سیمینار میں بڑے پیمانے پر ملک بھر سے اطباء کرام نے شرکت کی۔ اس موقع پر نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف یونانی میڈیسن بنگلور، سی سی آر یو ایم دہلی اور حیدرآباد، کشمیر یونانی میڈیکل کالج کے اساتذہ اور پی جی اسکالرز نے مقالے پیش کیے۔ دہلی سے آل انڈیا یونانی طبی کانگریس کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر سیّد احمد خاں نے خاص طور سے شرکت کی اور خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ طب یونانی کا مستقبل روشن ہے۔ قبل ازیں پروفیسر خورشید آئی اندرابی نے کشمیر میں طب یونانی کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالی اور کہا کہ یہاں دیسی جڑی بوٹیوں کا بڑا سرمایہ ہے اور طب یونانی کے فروغ کی بھی بڑی گنجائش ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ سی سی آر یو ایم کے ذریعہ حکیم محمد یوسف صاحب کی سربراہی میں جو کارنامے انجام دیے گئے، اُس سے طب یونانی کے فروغ میں بڑی تقویت ملی، ان کے کارنامے لائق ستائش ہیں۔ تمام شرکا کا شکریہ آل انڈیا یونانی طبی کانگریس (جموں وکشمیر یونٹ) کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر محمد یونس نے ادا کیا۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر یونس منشی، سکریٹری جنرل، آل انڈیا یونانی طبی کانگریس، جموں وکشمیر، 19 مئی 2015

ریاستی کلچرل اکادمی کی افسانوی ہیئت

جموں: اردو کے مشہور ادیب شری آنند لہر نے ریاستی کلچرل اکادمی کی طرف سے منعقد کردہ افسانوی نشست کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ اردو ہندوستان کے لوگوں کی ترجمان ہے۔ وہ محبت کرنے کا طریقہ بتاتی ہے اور آواز حق بلند کرنے کا سلیقہ عطا کرتی ہے۔ انھوں نے اس بات پر حیرانگی ظاہر کی کہ گو اردو جموں وکشمیر کی سرکاری زبان ہے مگر اس ریاست میں بھی اس کی حالت خستہ ہے اور یہاں تک کہ صوبہ جموں کے اسکولوں میں اردو کی تعلیم کا خاطر خواہ انتظام بھی نہیں ہے اور ابھی تک ریاست جموں وکشمیر میں اردو اکادمی کا قیام بھی نہیں کیا گیا ہے۔

بذریعہ ڈاک: آدتیہ شرما، سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) شاخ جموں، 19 مئی 2015

کرناٹک:

بلگام اردو صحافت پر یک روزہ سیمینار کا منظر

بلگام: برصغیر میں اردو صحافت کے 200 سال سے زائد تاریخی سفر کے تناظر میں منعقد ایک روزہ قومی سیمینار میں مختلف شعبۂ حیات میں اس کے شاندار رول کو سراہا گیا اور توقع کی گئی کہ مستقبل میں ایک مضبوط وموثر میڈیم کے طور پر اس کا یہ کارنامہ جاری رہے گا۔ مہمان خصوصی اور صدر آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس اور قومی ترجمان کانگریس م افضل نے اپنے کلیدی خطبہ میں کہا کہ ملک کی آزادی میں کلیدی کردار ادا کرنے اور دہلی اردو اخبار کے مدیر مولوی محمد باقر اور دیگر صحافیوں کی شہادت کا نذرانہ پیش کرنے سے لے کر آزادی کے بعد سے ہنوز سیاست، معاشرت، معیشت، روزگار، تہذیب وتمدن شعر وادب، مذہب، سائنس اور فلم وتھیٹر میں اہم وغیر معمولی کردار ادا کرنے کے سبب اردو صحافت کا مقابلہ برصغیر کی کوئی اور زبان نہیں کرسکتی ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ان تمام خدمات کے باوجود آزاد ہندوستان میں اردو صحافت کو اس کا صلہ نہیں ملا۔ اس موقعے پر وائس آف امریکہ نئی دہلی کے خصوصی نمائندے سہیل انجم نے پرمغز مقالہ پیش کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 8 مئی 2015

بیدر میں دس روزہ اردو کلاسز کا اہتمام

بیدر: مادری زبان اردو سے جڑے رہنا اور اس کی ترقی میں اپنا ہاتھ بٹانا اگر اولیائے طلبا اپنے اوپر لازم کرلیں تو یہ ہماری تہذیب اور ثقافت کے لیے اچھا ہوگا۔ جس بچے نے اردو سے تعلیم حاصل کی وہ ایک کامیاب نوجوان اور انسان بن کر نکلتا ہے۔ یہ بات محترمہ رخسانہ نازنین جنرل سکریٹری بزم غزالاں بیدر نے کہی۔ وہ 20 روزہ گرمائی تعطیلاتی مفت اردو کلاسیس کے اختتامی جلسہ سے بحیثیت صدر خطاب کر رہی تھیں۔ بزم غزالاں کے سرپرست جناب محمد امیر الدین امیر نے اپنے خطاب میں کہا کہ انگریزی میڈیم کے بچوں نے جس طرح 10 دن میں اردو سیکھنے کی سعی کی ہے اور اس کے لیے معلّمہ نوشاد بیگم نے جو دلچسپی دکھائی وہ قابل تعریف ہے۔ بزرگ شاعر جناب عبدالکریم کریم نے مختصر خطاب میں طلبا کو تلقین کی کہ اردو زندگی بھر ساتھ نبھانے والی زبان ہے۔ لہٰذا اس زبان سے ہی تعلیم حاصل کی جائے۔ جناب محمد یوسف رحیم بیدری رکن کرناٹک اردو اکادمی نے بحیثیت مہمان خصوصی اپنے خطاب میں کہا کہ ماں سے جدا ہونے کو بچہ جس طرح تیار نہیں ہوتا اسی طرح مادری زبان اردو سے بچوں کو تعلیم نہ دلانے کی تکلیف کو بھی محسوس کیا جائے اور یہ تکلیف بچہ بڑا ہو کر محسوس کرتا ہے۔ انگریزی سے تعلیم دلانے والے والدین کو چاہیے کہ وہ اپنے اپنے اسکولوں میں بچوں کو دوسری یا تیسری زبان کے طور پر اردو کو پڑھا کر بچوں کے اخلاق اور ان کی مذہبی وروحانی تربیت کا سامان کریں۔ پروگرام کی نظامت نوشاد بیگم نے کی اور ان ہی کے شکریہ پر دس روزہ کلاسیس کا اختتام عمل میں آیا۔

روزنامہ 'رہنمائے دکن' حیدرآباد، 10 مئی 2015

دھارواڑ میں محفل مشاعرہ کا انعقاد

دھارواڑ: دھارواڑ کے مالاپور میں ہاجرہ پیلس کے رسم اجرا کے موقعے پر اسٹار ایونٹ کے زیر اہتمام محفل مشاعرہ منعقد ہوا جس کی صدارت پروفیسر سید عبدالقدیر ناظم نے کی۔ پروفیسر سید واجد ہاشمی، ہاشم پیر درگاہ بیجاپور، امجد خان، پی کے مولا، شمیم بانو، ذاکر حسین، نظام الدین، سلیم الدین اور معین الدین شیخ مہمانان خصوصی رہے۔ اس موقعے پر صدارتی خطاب کرتے ہوئے پروفیسر قدیر ناظم نے کہا کہ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ آج بھی اردو زبان وادب سے محبت رکھنے والے باقی ہیں۔ قابل مبارکباد ہیں معین الدین شیخ اور ان کے برادران جنھوں نے ہاجرہ پیلیس کے رسم اجرا کے موقعے پر کسی میوزیکل ایونٹ کے بجائے اردو کے مشاعرے کو ترجیح دی۔ یہی وہ جذبہ ہے جس کے ذریعے ہم اردو زبان وادب کو زندہ رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

روزنامہ 'اردو ایکشن' بھوپال، 2 اپریل 2015

بیجاپور میں جشن اردو کا منظر

بیجاپور میں جشن اردو

بیجاپور: کرناٹک اُردو اکادمی بنگلور کے زیر اہتمام تاریخی شہر بیجاپور میں جشن اُردو کے موقع پر اُردو کے دو ڈرامے 'اللھم لبیک' اور' آرام باغ کی پیش کش کی گئی اور اُردو زبان اور ادب کے فروغ میں گرانقدر خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اُردو کے مقامی 43 قلمکاروں کو اکادمی کی جانب سے تہنیت پیش کی گئی اس تقریب کا افتتاح کرنے کے بعد ایک جم غفیر کو خطاب کرتے ہوئے شہر کے ایم ایل اے ڈاکٹر مقبول باغوان نے واضح طور پر بتایا کہ اُردو ہماری تہذیب ہے اور اس تہذیب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ زبان قومی یکجہتی کی علمبردار ہے۔ صدر جلسہ و کرناٹک اُردو اکادمی کی چیئرمین ڈاکٹر چودھری نے بتایا کہ شہر بیجاپور عادل شاہوں کی سرزمین ہے بیجاپور سے ادبی تہذیبی، ثقافتی اور مذہبی روایات کا تعلق ہمیشہ گہرا رہا ہے اور اُردو کی ترقی میں اس شہر کا نام سرفہرست ہے۔ ڈاکٹر چودھری نے کہا کہ اُردو زبان اپنی خوبیوں کی وجہ سے ہر حال باقی رہے گی اس کی خوبیوں کا مخالفین بھی معترف ہے۔

جلسہ کے مہمان خصوصی و محکمہ تعلمات علاقہ کے کمشنر جناب محمد محسن نے بتایا کہ اُردو ادب میں جہاں مسلمان ادیبوں اور شاعروں کے شہ پارے ہیں وہاں ہندو اہل قلم کے فن پارے بھی ہیں پریم چند، چکبست، دیاشنکر وغیرہ نے اُردو کے پودے کی آبیاری کی ہے۔ اس موقع پر اکادمی کے خبرنامہ کا اجرا کرنے کے بعد ویمنس یونیورسٹی کی وائس چانسلر پروفیسر مینا چنداور کرنے کہا کہ میں اُردو نہیں پڑھ سکتی بلکہ اس کی مٹھاس کو محسوس کرتی ہوں۔ جلسہ کی نظامت ڈاکٹر علیم اللہ حُسینی اور جناب ابوبکر مومن نے کی۔ جلسہ کا آغاز تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ جشن اُردو کے اس جلسہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد شرکت کی جنھوں نے مذکورہ دونوں اصلاحی ڈراموں کا لطف اُٹھایا۔

پریس ریلیز: رفیع بھنڈاری، کنونیر جشن اُردو بیجاپور و رکن کرناٹک اُردو اکادمی بنگلور، 20 مئی 2015

مدھیہ پردیش:

حسرت موہانی: فن اور کارنامے

اندور: شعبۂ اردو اسلامیہ کریمیہ کالج کے زیرِ اہتمام مجاہد آزادی مولانا حسرت موہانی کے یوم وصال کے موقعے پر اُن کی خدمات، فن اور کارنامے پر مقالات، تقاریر اور غزل سرائی کا انعقاد کیا گیا۔ جس کی صدارت پروفیسر اے اے عباسی (سابق وائس چانسلر دیوی اہلیہ یونیورسٹی اندور، ایم پی) نے کی۔ مہمان خصوصی مشہور محقق و ناقد، شاعر و ادیب، استاذ الاساتذہ پروفیسر آفاق احمد (بھوپال) اور

مہمان اعزازی کی حیثیت سے ڈاکٹر ورمنی نے شرکت کی۔ سب سے پہلے اندور کے معروف شاعر وادیب جناب رشید اندوری نے خاص طور پر اساتذہ سے درخواست کی کہ درس و تدریس کے ساتھ طلبا و طالبات کو حسرت کی سیاسی، سماجی اور صحافتی خدمات سے بھی آگاہ کریں تاکہ روشن شخصیات کو تاریخ میں زندہ رکھ سکیں''۔ پروفیسر حلیم خان (سکریٹری اسلامیہ کریمیہ سوسائٹی اندور، ایم پی) نے خطبۂ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے تمام حاضرین کا پرتپاک استقبال کیا۔ تقریب کا دوسرا اجلاس تحقیقی پرچوں پر مبنی تھا۔ جس میں پروفیسر شبانہ نکہت انصاری (صدر شعبۂ اردو اسلامیہ کریمیہ کالج) نے 'حسرت کی غزل گوئی کے چند پہلو' عنوان سے مقالہ پڑھا، جس طرح رشید احمد صدیقی کا قول بجا ہے کہ غزل اردو شاعری کی آبرو ہے، اسی طرح کہنا درست ہوگا کہ حسرت اردو غزل کی آبرو ہیں۔ اس موقعے پر ڈاکٹر وسیم افتخار انصاری (صدر شعبۂ اردو مہارانی لکشمی بائی گورنمنٹ گرلز پی جی کالج، اندور) نے پرمغز مقالے پڑھے۔ مہمان اعزازی ڈاکٹر نریندر ورمنی (ڈی لٹ اردو) اور مالوی کوی نرہری پٹیل صاحبان نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مہمان خصوصی پروفیسر آفاق احمد نے حسرت موہانی کی شخصیت اور شعری، سیاسی، سماجی، علمی و ادبی خدمات اور کارناموں پر خوبصورت انداز میں تفصیلی گفتگو فرمائی۔ تقریب کے صدر پروفیسر اے اے عباسی نے سبھی مقالات پر جامع تبصرہ فرمایا اور کہا واقعی کالج اور شہر اندور مبارک باد کے مستحق ہیں۔ آخر میں اسلامیہ کریمیہ کالج کے پرنسپل پروفیسر ایم کے جھنور نے مقالہ نگاران، اسٹاف ممبرس، سامعین اور تمام حضرات کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کیا۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر ارشد جمال علیگ نے بحسن وخوبی انجام دیے۔

پریس ریلیز: پروفیسر شبانہ نکہت انصاری، صدر شعبۂ اردو، اسلامیہ کریمیہ کالج، اندور، 18 مئی 2015

حسرت موہانی کو خراجِ عقیدت

نئی دھلی: عظیم مجاہدِ آزادی، شاعر انقلاب مولانا حسرت موہانی کے یوم وفات پر انجمن نوائے مستقبل نئی دہلی نے مولانا موصوف کی ادبی، سیاسی، قومی اور صحافتی خدمات کو یاد کرتے ہوئے خراجِ عقیدت پیش کیا۔ انجمن کی کنوینر ڈاکٹر ناصرہ خاتون رضوی نے کہا کہ مولانا حسرت موہانی ایک جید عالم، انقلابی شاعر، عظیم سیاست داں اور حق گو صحافی تھے۔ انھوں نے کہا کہ افسوس اس بات کا ہے کہ آج ہمارے سماج نے ایسی شخصیتوں کو فراموش کردیا ہے جو واقعی ہمارے لیے ایک نمونۂ عمل بن سکتی ہیں۔ ای ٹی وی اردو کو لائق تحسین وتعریف قرار دیتے ہوئے انھوں نے کہا کہ ای ٹی وی اردو نے مولانا کے یوم وفات پر ان کی یاد میں خصوصی پروگرام کرکے اصل معنی میں انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ اس موقعے پر ای ٹی وی اردو کے بیورو چیف خورشید ربانی، حسرت موہانی کے داماد ایڈوکیٹ نفیس صدیقی اور انقلاب کے نیشنل بیورو چیف ڈاکٹر ممتاز عالم رضوی نے حسرت موہانی کے فکر وفن پر گفتگو کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 15 مئی 2015

تہذیب و ثقافت:

پنجابی بھون میں محفل گنگ وجمن کا انعقاد

نئی دھلی: 'آئی ٹی او' دہلی پر واقع راؤز ایونیو روڈ پنجابی بھون میں اردو ہندی اور پنجابی کی مشترکہ ادبی تنظیم محفل گنگ وجمن کے زیر اہتمام ایک شعری نشست کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت آئی پی ایس آفیسر وادیب سوراج بیرے اور نظامت ادیب وشاعر صحافی حبیب سیفی نے کی۔ تنظیم کے ایگزیکیٹو سکریٹری ڈاکٹر ظفر مرادآبادی طبیعت علیل ہونے کے باعث شریک نہ ہوسکے۔ پروگرام کی سرپرستی ڈاکٹر جی آر کنول اور مہمان نائکش

چندرا نے کی جبکہ صدارت ڈاکٹر سوراج بیر نے کی اور تینوں زبانوں کے لکھنے والوں کو ایک ساتھ لے کر چلنے اور شاعری کے ذریعے زبانوں کا فروغ کرنے والوں کو اسٹیج شیئر کرانے پر محفل گنگ وجمن کو مبارکباد پیش کی۔ تنظیم کی طرف سے سردار ہروندر سنگھ نے شرف میزبانی ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 18 مئی 2015

کیفی اعظمی کی یاد میں شعری نشست

نئی دهلی: آل انڈیا ہندی اردو ایکتا منچ کے زیراہتمام سلطان پوری میں ملک کے معروف شاعر کیفی اعظمی کی یاد میں ایک ہندی اردو شعری نشست کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت ٹرومیڈیا کے ایڈیٹر اوم پرکاش پرجاپتی نے کی جبکہ مہمان خصوصی کے طور پر مقامی کونسلر ستپال سنگھ نے شرکت کی وہیں نظامت کے فرائض اردو زبان کے شاعر اسلم بیتاب نے انجام دیے۔ نشست کے کنوینر بھارتیہ وکاس سمیتی کے صدر رام شیام حسین تھے۔ اس موقعے پر دہلی اور بیرون دہلی سے تشریف لائے ہندی اور اردو زبان کے شعرا اور کویوں نے اپنے کلام سنائے جن میں طنز و مزاح کے شاعر ابراہیم علوی، اینمیش شرما، ڈی پی ورما اکیلا، بجیت سنگھ رونی، نردیش پابلے والا، شبھے کمارگری، راجیش تنور، رام شیام حسین، نیہا سنیتا، گنجن اگروال، وجے پرشانت، درگیش اوستھی، دنیش پارک، اجے ٹھاکر، منوج ٹھاکر، جتندر پریتم، یوگیندر سنگھ، کنور پرتاپ سنگھ کے نام قابل ذکر ہیں۔ نشست میں شامل شاعروں اور کویوں کو اعزاز سے بھی نوازا گیا۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 16 مئی 2015

اعزاز و اکرام:

آزرمی دخت صفوی کو اعزاز

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف پرشین ریسرچ کی ڈائرکٹر پروفیسر آزرمی دخت صفوی کو فارسی زبان و ادب کے تعلق سے ان کی غیر معمولی خدمات کے

اعتراف میں ایران کے سب سے موقر اور معروف فرہنگی ادارے 'انجمن آثار و مفاخر فرہنگی' (National Foundation of Cultural Heritage) نے 18 مئی کو تہران میں ایک عظیم الشان تقریب میں اعزاز سے سرفراز کیا۔ انجمن مفاخر ایران میں فارسی زبان و ادب کی خدمات کے لیے اہم اسکالرز دو اسکالرز کو نوازتا ہے۔ پروفیسر صفوی یہ اعزاز حاصل کرنے والی پہلی خاتون اسکالر ہیں۔ ہندوستان میں صرف دو اسکالرز کو یہ اعزاز حاصل ہوا اور وہ پروفیسر نذیر احمد اور پروفیسر امیر حسن عابدی ہیں۔ اس پروقار تقریب کے مہمان خصوصی ایرانی پارلیامنٹ کے سابق اسپیکر اور فرہنگستان زبان و ادب فارسی کے ڈائرکٹر ڈاکٹر غلام علی حداد عادل تھے۔ اس کے علاوہ اس تقریب میں ایران کی معروف علمی و ادبی شخصیتوں میں ڈاکٹر مہدی محقق، ڈاکٹر رضا نصیری، ڈاکٹر کریم نجفی برزگر، ڈاکٹر رضا مصطفوی سبزواری، ڈاکٹر مہدی ماحوزی، ڈاکٹر علی اشرف صادقی وغیرہ نے شرکت کی اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس موقعے پر پروفیسر صفوی کی حیات اور کارنامے پر ترتیب دی گئی کتاب کا اجرا بھی عمل میں آیا۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 22 مئی 2015

پاپولر میرٹھی کو فیس راشٹریہ گورو اعزاز

امروهه: دہلی کے پیارے لال بھون میں ایک ثقافتی بزم میں ممتاز فلمی ہستیوں اور معروف سیاست داں حضرات کی موجودگی میں مختلف فنون سے وابستہ شہرت

یافتہ شخصیات کو اعزاز سے سرفراز کیا گیا، اس پروگرام کے دوران شاہنشاہ طنز و مزاح سید اعجاز الدین شاہ پاپولر میرٹھی کو فیس راشٹریہ گورو اعزاز سے سرفراز کیا گیا، اس سلسلے میں امروہہ کی ادبی تنظیم اتر پردیش اردو ادب سوسائٹی نے پاپولر میرٹھی کو مبارکباد پیش کی ہے۔ انجمن کے صدر کوثر علی عباسی نے بتایا کہ فیس گروپ کی جانب سے بہادر شاہ ظفر مارگ پر قائم پیارے لال بھون میں سالانہ 15 واں ثقافتی تقریب کا اہتمام اپنے روایتی انداز میں منعقد ہوا، اچھیت گولاٹی کی صدارت میں منعقد اس بزم میں اجے ماکن، جگدیش ٹائٹلر، بالی ووڈ اداکار ہمانی شیوپوری، جونیئر محمود، راجیش وویک، راکیش شری واستو، سنسنی اینکر شیروردھن دویدی، ڈی ایم دہلی مسٹر کنانل، سماجی کارکن جتیندر سنگھ شنٹی، موسیقی کار پنکی پارس، شاعر طنز و مزاح سید اعجاز الدین شاہ پاپولر میرٹھی نے شرکت کی، اس دوران مہمانان کی موجودگی میں اعجاز الدین شاہ کے ساتھ دیگر شخصیات کو اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، 27 مئی 2015

جسونت سنگھ کو ایوارڈ

نئی دهلی: اردو اور پنجابی زبانوں کے فروغ کے لیے کام کرنے والی مشرقی دہلی کی سماجی تنظیم پنجابی پروموشن کونسل کے صدر جسونت سنگھ بابی کو اکال تخت امرتسر کی جانب سے اعزاز سے نوازا گیا۔ یہ اعزاز ان کے ذریعہ کی جارہی سماجی خدمات کے اعتراف میں اکال تخت صاحب کے جتھے دار گیانی گربچن سنگھ نے دربار صاحب امرتسر کے انفارمیشن سینٹر میں جسونت سنگھ کے اعزاز میں منعقد ایک پروگرام میں دیا گیا۔ اس موقعے پر گربچن سنگھ نے کہا کہ جسونت سنگھ کے ذریعے پنجابی اور اردو زبان کی نشر و اشاعت کا جو کام کیا جارہا ہے اس سے ملک بھر میں لوگوں کو پنجابی اور اردو سیکھنے کو مل رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ ملک کی مختلف جیلوں میں قیدیوں کو گربانی، رام نومی، رمضان المبارک کے مہینے میں روزہ افطار بھی کرواتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ جسونت سنگھ صرف سکھوں کے لیے ہی نہیں بلکہ دیگر مذاہب کے قیدیوں کے لیے بھی رام نومی، روزہ افطار جیسے پروگرام وقت وقت پر کراتے رہتے ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 23 مئی 2015

مشتاق دربھنگوی

کلکته: مغربی بنگال اردو اکادمی میں 'جشن اقبال' کے دوران مغربی بنگال اردو اکادمی کی جانب سے منعقدہ ایک خصوصی تقریب میں منفرد لب و لہجہ کے شاعر جناب

مشتاق دربھنگوی کو اُن کی تاحیات ادبی خدمات کے اعتراف میں ملک کے معروف شاعر جناب گلزار دہلوی کے ہاتھوں مومنٹو، توصیفی سند اور 25,000 روپے کا چیک پیش کیا گیا۔ اس موقعے پر مشتاق دربھنگوی نے کہا کہ آج کا دن میرے لیے تاریخی دن ہے۔

پریس ریلیز: مشتاق دربھنگوی، کولکاتہ، 8 جون 2015

مولانا آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ باغ عامہ میں صلاح الدین نیر کو استقبالیہ

حیدرآباد: صلاح الدین نیر کی زائد از 50 سالہ شعری ادبی و تہذیبی خدمات کے اعتراف میں یادگار جلسہ اعتراف خدمات مولانا آزاد ریسرچ انسٹی ٹیوٹ باغ عامہ میں زیرصدارت جناب سید شاہ نورالحق قادری سابق صدر

نشین اردو اکادمی منعقد ہوا۔ ممتاز شاعر ناصر کرنولی کے تہنیتی اشعار جناب سلیم ساحل نے سنائے۔ جناب آصف باشاہ سابق وزیر، جناب ای اسمٰعیل سابق جج، پرفیسر احمد اللہ خاں سابق ڈین آف فیکلٹی شعبہ جامعہ عثمانیہ، جناب بادشاہ نواز خان اسپیشل فرسٹ کلاس میٹروپولیٹن مجسٹریٹ کریمنل کورٹ نامپلی، پروفیسر ایس۔ اے شکور ڈائرکٹر اردو اکادمی، پروفیسر فاطمہ پروین سابق شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ، مسٹر نہپال سنگھ ورما سابق شعبہ ہندی انوار العلوم کالج، جناب رحیم اللہ خاں نیازی سابق اردو اکادمی، جناب خلیق الرحمٰن، پرنس شہامت جاہ اور ڈاکٹر محی الدین ڈپلومیٹ اقوام متحدہ (UNO) نے مہمانان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ اس موقعے پر صلاح الدین نیر کی کئی ادبی شخصیتوں اور ادبی انجمنوں کی جانب سے زائد از 20 محبان اردو نے شال پوشی وگلپوشی کی۔

روزنامہ 'رہنمائے دکن' حیدرآباد، 5 اپریل 2015

انجمن ارتقائے اردو ادب نیپال کے اشتراک سے ایوارڈ تقسیم

نئی دھلی: اردو کے فروغ کے لیے سرگرم نیپال کی تنظیم 'انجمن ارتقائے اردو ادب نیپال' اور دہلی کی تنظیم 'اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن' کے اشتراک سے ہندوستان کے صحافیوں کو ان کی خدمات کے اعتراف میں ایوارڈ تفویض کیے گئے۔ تقسیم ایوارڈ کی یہ تقریب غالب اکادمی بستی حضرت نظام الدین نئی دہلی میں منعقد ہوئی جس میں دہلی کے علمی وادبی اور صحافتی حلقوں سے بڑی تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔ یہ ایوارڈ انجمن ارتقائے اردو ادب نیپال کے صدر صحافی اور شاعر زاہد آزاد جھنڈانگری اور مولانا عبدالوہاب خلجی، پروفیسر عبدالحق، پروفیسر بصیر احمد، صحافی شیش نارائن سنگھ اور غالب اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد کے ہاتھوں پیش کیے گئے۔ یہ تقریب نیپال کی راجدھانی کاٹھمنڈو میں ہونے والی تھی مگر وہاں کے موجودہ حالات کے پیش نظر اسے دہلی میں منعقد کیا گیا جن شخصیات کو ایوارڈ دیے گئے ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں: سہیل انجم، نامہ نگار وائس آف امریکہ واشنگٹن دہلی (مولانا ابوالکلام آزاد ایوارڈ برائے تحقیقی وتصنیفی صحافت)، قطب اللہ خاں، ایڈیٹر عوامی سالار، لکھنؤ (مولانا عثمان فارقلیط ایوارڈ برائے تعمیری صحافت)، حقانی القاسمی دہلی ہفت روزہ عالمی سہارا دہلی (مولانا عبدالماجد دریابادی ایوارڈ برائے ادبی صحافت) مظفر اللہ، ایڈیٹر انچارج روزنامہ راشٹریہ سہارا، گورکھپور (مولانا ظفر علی خاں ایوارڈ برائے ادارتی صحافت)، فضل الرحمٰن، بیورو چیف روزنامہ انقلاب لکھنؤ (مولانا محمد علی جوہر ایوارڈ برائے تفتیشی صحافت) محمد عارف اقبال ایڈیٹر اردو بک ریویو، نئی دہلی (ایوارڈ برائے ادبی و اشاعتی خدمات) اور ڈاکٹر سید احمد خاں، جنرل سکریٹری اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن اور یونائیٹڈ مسلم آف انڈیا (حکیم عبدالحمید ایوارڈ برائے اردو خدمات)۔ ایوارڈ میں ایک مومنٹو، ایک شال، ایک توصیفی سند اور اکیاون سو روپے (نیپالی کرنسی) دیے گئے۔ اس تقریب کی صدارت دہلی یونیورسٹی میں شعبہ اردو کے سابق صدر اور موجودہ پروفیسر ایمریٹس عبدالحق نے کی۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 26 مئی 2015

شعبۂ اردو و فارسی گلبرگہ یونیورسٹی میں جلسہ تقسیم اسناد

شعبۂ اردو و فارسی گلبرگہ یونیورسٹی میں جلسہ تقسیم انعامات

بزم ادب اردو، شعبۂ اردو و فارسی، گلبرگہ یونیورسٹی، گلبرگہ کی جانب سے جلسۂ اختتامیہ و تقسیم انعامات اور شعبۂ اردو کا ترجمان گیسوئے اردو کی رسم اجرا پروفیسر عبدالحمید اکبر صدر شعبۂ اردو وفارسی کی زیر نگرانی منعقد ہوا۔ اس جلسہ میں ڈاکٹر فوزیہ چودھری، صدر نشین کرناٹک اردو اکادمی بنگلور، معروف شاعر جناب محبّ کوثر نے بحیثیت مہمانانِ خصوصی اور ڈاکٹر صاحب علی (رکن سنڈیکیٹ، گلبرگہ یونیورسٹی)۔ جناب واحد علی فاتحہ خوانی (رکن سنڈیکیٹ گلبرگہ یونیورسٹی) اور جناب یوسف رحیم بیدری (رکن کرناٹک اردو اکادمی) نے بحیثیت مہمانانِ اعزازی شرکت فرمائی۔

شعبۂ اردو کا تہذیبی، علمی اور ادبی ترجمان 'گیسوئے اردو (دکنی ادب نمبر)' کا اجرا بدست جناب محبّ کوثر عمل میں آیا۔ اس موقعے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس طرح کا علمی وتحقیقی کام شعبۂ اردو وفارسی کے لیے نیک فال ہے۔ اس مجلّہ پر جناب امجد جاوید نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ دکنی ادب پر تحقیق، مطالعہ ایک مشکل کام ہے جسے اس علاقے کے قلم کاروں نے محنت سے اس کام کو انجام دیا ہے۔ اکرم نقاش نے بھی اس موقعے پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے مسرت کا اظہار کیا کہ دکنیات میں بھی ہمارے علاقے سے لکھنے والے موجود ہیں جن کی کوششوں کو یقیناً سراہنا چاہیے۔ بزم ادب اردو شعبۂ اردو وفارسی گلبرگہ یونیورسٹی گلبرگہ کی سالانہ رپوٹ رئیس فاطمہ (ایم اے سالِ آخر) نے پیش کی۔ 24 اور 25 مارچ 2015 کو ڈگری کالجس اور پوسٹ گریجویشن طلبہ وطالبات کے مابین تحریری، تقریری، افسانہ نویسی، طنز ومزاح، بیت بازی، برجستہ تقریر اور غزل سرائی کے مقابلوں میں گلبرگہ اور نواح گلبرگہ کے مختلف ڈگری کالجس کے حصہ لینے والے طلبہ وطالبات کو ترغیبی انعامات واسنادات بدست مہمانانِ خصوصی کے ذریعے پیش کیے گئے۔ ڈاکٹر فوزیہ چودھری نے بھی اپنے خطاب میں طلبہ و طالبات کو مطالعہ کی عادت اور تہذیبی و ثقافتی پروگراموں میں شرکت کرنے پر زور دیا۔ پروفیسر عبدالحمید اکبر نے اپنے صدارتی خطاب میں انعام پانے والوں کو مبارک باد دیتے ہوئے تمام مہمانوں اور بالخصوص ڈاکٹر فوزیہ چودھری کا شکریہ ادا کیا۔ جلسے کا اختتام شاہد فریدی (صدر بزم) کے شکریے پر ہوا۔

پریس ریلیز: منظور دکنی، 15 مئی 2015

رسم اجرا:

ماہنامہ 'نیا دور' کا منشی دوارکا پرساد افق نمبر

لکھنؤ: ریاستی محکمۂ اطلاعات ورابطۂ عامہ کے اردو ماہانہ 'نیا دور' کے 'منشی دوارکا پرساد افق نمبر' کا 21 مئی کو ایک تقریب میں اجرا عمل میں آیا۔ اس موقعے پر محکمہ اطلاعات کے پرنسپل سکریٹری نونیت سہگل نے کہا کہ منشی دوارکا پرساد افق کی شاعری گنگا جمنی تہذیب کا ایک ایسا مینارۂ نور ہے، جس کی روشنی سے سبھی شائقین ادب مستفید ہو رہے ہیں۔ انیکسی کے میڈیا سینٹر میں 'نیا دور' کے منشی دوارکا پرساد افق نمبر کا اجرا کرنے کے بعد اظہار خیال کرتے ہوئے نونیت سہگل نے کہا کہ اس خاص نمبر کا ہندی اڈیشن بھی جلد شائع کرایا جائے۔ انھوں نے کہا کہ منشی جی نے مہابھارت، گیتا اور رامائن جیسے رزمیوں کا منظوم اردو ترجمہ کر کے ایک نئی روایت کی شروعات کی تھی۔ انھوں نے ایک پندرہ روزہ 'نظم اخبار' کی ادارت بھی کی تھی جس میں ساری خبریں شاعری کی شکل میں شائع ہوتی تھیں۔ انھوں نے کہا کہ جلد ہی نیا دور کا علی برادران نمبر بھی شائع کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ ہندی قارئین کے لیے مجاز، خمار بارہ بنکوی، انقلاب 1857 اردو صحافت اور شکیل بدایونی نمبر کے ترجمے کا کام بھی جاری ہے۔ پرنسپل سکریٹری اطلاعات نے منشی دوارکا پرساد کی پوتی ڈاکٹر کومل بھٹناگر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ انھی کی تحریک سے

اس خاص نمبر کو عملی شکل دیا جانا ممکن ہو سکا ہے۔ اس موقعے پر انھوں نے نیا دور کے ایڈیٹر ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی کو اس خصوصی شمارے کی ادارت کے لیے مبارکباد دیتے ہوئے توقع ظاہر کی کہ وہ اور ان کے معاونین مستقبل میں بھی اسی طرح اپنی صلاحیتوں سے محکمے کو خاص شناخت دلانے میں اہم کردار ادا کرتے رہیں گے۔ قابل ذکر ہے کہ اردو ماہنامہ نیا دور کی اشاعت گزشتہ 69 برسوں سے کامیابی کے ساتھ کی جا رہی ہے۔ ایڈیٹر نیا دور ڈاکٹر وضاحت حسین رضوی نے کہا کہ یہ کام پرنسپل سکریٹری اطلاعات اور ڈائرکٹر اطلاعات آشوتوش نرنجن کی رہنمائی میں کامیابی سے عمل میں آسکا ہے۔ ڈاکٹر کومل بھٹناگر نے اس موقعے پر بتایا کہ منشی دوارکا پرساد افق کی متعدد تخلیقات پٹنہ کی خدابخش لائبریری اور دیگر اداروں میں موجود ہیں۔ اس موقعے پر ڈپٹی ڈائرکٹر اطلاعات سید امجد حسین، اسسٹنٹ ڈائرکٹر یشو وردھن تیواری سمیت محکمہ کے دیگر افسران وملازمین اور ادب کے شائقین موجود تھے۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 22 مئی 2015

رضا لائبریری میں سنسکرت کیٹلاگ کا اجرا

لکھنؤ: رضا لائبریری میں موجود سنسکرت کے مخطوطات کا تفصیلی کیٹلاگ تیار کیا گیا ہے جسے راج بھون کے گاندھی

ہال میں منعقد ایک تقریب میں رضا لائبریری کے ڈائرکٹر پروفیسر ایس ایم عزیز الدین حسین کی موجودگی میں ریاستی گورنر رام نائک نے سنسکرت کیٹلاگ کا اجرا کیا۔ انھوں نے اس موقعے پر راج بھون میں تعینات ایس آئی کلدیپ سنگھ کے تحریر کردہ بھجنوں پر مبنی آڈیو کیسٹ 'بوٹی لے آئے ہنومان' کا بھی اجرا کیا۔ رام نائک نے اپنے خطاب میں کہا کہ رضا لائبریری عالمی شہرت کی حامل ہے جہاں قدیم کتابوں کا خزانہ موجود ہے جو شاید ہی ہندوستان کی کسی لائبریری میں ہو۔ اس لائبریری میں 60 ہزار کتابیں، 17 ہزار مخطوطات اور قدیم تصاویر موجود ہیں۔ چمڑے پر لکھی گئی کتابیں ہیں۔ رام نائک نے جو رضا لائبریری گورننگ بورڈ کے چیئرمین بھی ہیں، کہا کہ 1952 میں ملک کے پہلے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد نے مخطوطات اور قدیم کتابوں کے تحفظ پر زور دیا تھا۔ اردو، عربی، فارسی، پشتو اور ترکی کے مخطوطات کا کیٹلاگ تیار ہونے کے بعد سنسکرت مخطوطات کے کیٹلاگ کا نمبر آیا ہے۔ سنسکرت تک آنے میں کافی سال لگ گئے۔ گورنر نے کہا کہ سنسکرت ملک کی قدیم زبان ہے، سنسکرت مخطوطات کے کیٹلاگ کی تیاری ایک قابل تحسین عمل ہے۔ انھوں نے کہا کہ دو حصوں میں سنسکرت مخطوطات کا یہ کیٹلاگ ریسرچ اسکالرس کے لیے بہت مددگار ثابت ہوگا۔ رام نائک نے بتایا کہ پہلے حصہ میں 177 مینوسکرپٹ اور دوسرے حصہ میں 188 مینوسکرپٹ کا ذکر ہے۔ رضا لائبریری نے یہ کام کر کے ایک طرح سے سنسکرت کی خدمت کی ہے۔ تفصیلی کیٹلاگ تیار کرنے والی ڈاکٹر پریتی اگروال کی محنت کو بھی گورنر نے سراہا۔ اس سے قبل پروفیسر ایس ایم عزیز الدین حسین نے کہا کہ رضا لائبریری کی تاریخ میں یہ ایک یادگار دن ہے۔ ملک میں جتنی بھی اورینٹل لائبریریاں ہیں کسی نے بھی مخطوطات کا تفصیلی (ڈسکرپٹیو) کیٹلاگ نہیں تیار کیا ہے۔ نیشنل میوزیم بھی یہ کام نہیں کر سکا۔ تقریب میں گورنر کی پرنسپل سکریٹری جوتھیکا پاٹنکر، پروفیسر مسعود فلاحی اور دیگر افراد موجود تھے۔ نظامت کے فرائض ارون کمار سکسینہ نے انجام دیے۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 9 مئی 2015

سعادت حسن منٹو کے شاہکار افسانے

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پرو وائس چانسلر بریگیڈیئر سید احمد علی نے اردو کے ممتاز قلم کار سعادت حسن منٹو کے 105ویں یوم پیدائش پر ڈاکٹر جسیم محمد کی ترتیب کردہ کتاب 'سعادت حسن منٹو کے شاہکار افسانے' کا اپنے دفتر میں اجرا کیا۔ رسم اجرا کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے بریگیڈیئر سید احمد علی نے کہا کہ سعادت حسن منٹو نے کہانی کو نہ صرف ایک انقلابی تبدیلی سے روشناس کرایا بلکہ ان کی کہانیاں اس دور کے سماجی اور سیاسی پس منظر کی آئینہ دار ہیں۔ کتاب کے مرتب ڈاکٹر جسیم محمد نے کہا کہ منٹو کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ انھیں اپنے گرد و پیش کے سماجی ماحول سے پیار تھا اور سماج میں پھیلے شدید مسائل پر ان کی گہری نظر تھی۔ انھوں نے اپنی کہانیوں کے توسط سے ہمیشہ سچائیوں کو اجاگر کیا۔ اس موقعے پر خصوصی طور پر سید حامد سینئر سیکنڈری اسکول کے پرنسپل میجر (ریٹائرڈ) ایس ایس مصطفیٰ بھی موجود تھے۔ روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 12 مئی 2015

عرفان

لکھنؤ: مسرور ایجوکیشنل سوسائٹی کے زیر اہتمام سینٹ روز پبلک اسکول، گڑھی پیر خاں میں ممتاز شاعر سید عارف حسین عارف محمود آبادی کے تازہ ترین مجموعۂ کلام 'عرفان' کی رسم اجرا 'اردو رائٹرس فورم' کے روح رواں وقار رضوی کے دست مبارک سے عمل میں آئی۔ اس شعری وادبی تقریب کے صدر مولانا کلب عابد خاں سلطانپوری اور مہمان خصوصی ڈاکٹر محمد امیر احمد خاں (راجکمار محمود آباد) تھے جبکہ مہمانان اعزازی کی حیثیت سے علامہ قیصر جونپوری اور ارمان خاں شریک ہوئے۔ تقریب کی نظامت معروف شاعر شکیل گیاوی نے انجام دی۔ روزنامہ 'خبریں' دہلی، 13 مئی 2015

عادل پبلی کیشن کے زیر اہتمام 11 ناولوں کا اجرا

پونہ: مہاراشٹر ایجوکیشن ٹرسٹ کے زیر تحت چلائے جانے والے ادارے میں 11 ناولوں کا اجرا ادارے کے بانی وصدر رشید حسن خان صاحب کے دست مبارک سے کیا گیا۔ عادل پبلی کیشن کے زیر اہتمام اس پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ پروگرام کی غرض و غایت شیخ محمد کامل ریاض الدین (پروپرائٹر عادل پبلی کیشن) نے بتائی۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی پردیپ بابا ڈھال نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اردو کی تصانیف، ناولوں، اور کتابوں کا اجرا اس ادارے میں ہو رہا ہے یہ بڑی خوشی کی بات ہے اور مجھے خاص طور پر اس موقعے پر مہمانِ خصوصی کا درجہ دیا گیا اس کے لیے میں محمد کامل شیخ کا شکر گزار ہوں۔ صدارتی تقریر میں عالی جناب رشید حسن خان صاحب نے محمد کامل کی ستائش کی۔ روزنامہ 'اردو ایکشن' بھوپال، 6 اپریل 2015

شگفتگی کی تلاش میں

نئی دہلی: معروف افسانہ نگار انجم عثمانی کی تحریر کردہ کتاب 'شگفتگی کی تلاش میں' کی رونمائی معروف صحافی م افضل اور کمشنر برائے لسانی اقلیات پدم شری پروفیسر اختر الواسع کے ہاتھوں غالب اکادمی بستی حضرت نظام الدین اولیا، نئی دہلی عمل میں آئی۔ کمشنر برائے لسانی اقلیات پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ انجم عثمانی کے یہاں پرانی قدریں آج بھی موجود ہیں اور وہ اس کے امانت دار بھی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ انجم عثمانی نے 'شگفتگی کی تلاش میں' شاعروں، نقادوں اور دیگر حضرات پر جو طنز کیا ہے وہ

حقیقت اور مشاہدے پر مبنی ہے۔ اس موقعے پر معروف صحافی سہیل انجم، چوتھی دنیا کی ایڈیٹر محترمہ وسیم راشد، پروفیسر خالد محمود نے بھی اپنے تاثرات پیش کیے۔ کتاب کے رائٹر اور معروف افسانہ نگار انجم عثمانی نے اپنی تحریر کردہ کتاب 'شگفتگی کی تلاش میں' کے چند اقتباسات پڑھ کر حاضرین کو سنایا جس سے سامعین کافی محظوظ ہوئے۔ اس کے علاوہ مہمان خصوصی پروفیسر شمس الحق، منظور عثمانی، تحسین منور اور دیگر مقررین نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ غالب اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے نظامت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا'، دہلی، 10 مئی 2015

مکتوبات محبوب راہی بنام نذیر فتح پوری

پونہ: ڈاکٹر ذاکر نعمانی کی مرتبہ کتاب 'مکتوبات محبوب راہی بنام نذیر فتح پوری' کے اجرا کے سلسلے میں اعظم کیمپس پونہ میں

ایک شاندار تقریب کا انعقاد عمل میں آیا۔ محترم منور پیر بھائی صدر اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ پونہ نے تقریب کی صدارت فرمائی کیمپس کے کانفرنس ہال میں منعقدہ پروگرام کا آغاز لکچرار عظمت صاحبہ کی تلاوتِ کلامِ پاک سے ہوا۔ بعدازاں محترم منور پیر بھائی کے ہاتھوں مذکورہ بالا کتاب کا اجرا عمل میں آیا۔ کتاب کے مشمولات پر محترمہ ممتاز پیر بھائی، ساجد محشر (اکولہ)، صابر کمال (اکولہ)، ڈاکٹر نذیر فتح پوری اور ڈاکٹر محبوب راہی نے اظہار خیال کیا۔ اس تقریب میں نذیر فتح پوری صاحب کی کتاب 'پشاور کی 17 کہانیاں' کا اجرا بھی منور پیر بھائی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔

رپورٹ: اطہر قریشی، بی ای او، اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ پونہ، 25 مئی 2015

النور انٹرنیشنل کے مجلّہ کا اجرا

امروهه: امریکی سرزمین پر اردو کا پرچم بلند کرنے میں اہم کردار ادا کرنے والی ادبی تنظیم النور انٹرنیشنل کے زیراہتمام ہوئے تازہ مشاعرہ و کوی سمیلن کے بعد حال ہی میں شائع ہوئے مجلّہ کا امروہہ میں اجرا ہوا۔ اس سلسلے میں ایک تقریب کا انعقاد ہاشمی پی جی کالج امروہہ میں ہوا جس میں بطور مہمان خصوصی وزیر تعلیم حکومت اتر پردیش محبوب علی نے شرکت کی۔ یاد رہے کہ سرزمین امروہہ سے آبائی وابستگی رکھنے والی عالمی شہرت یافتہ ادبی شخصیت نور امروہوی کی زیرقیادت امریکہ ٹیکساس میں النور انٹرنیشنل نامی ایک ادبی تنظیم ہر سال وہاں مشاعرہ و کوی سمیلن کا انعقاد کرتی ہے۔ ڈاکٹر ہاشمی اس ذمے داری کو بخوبی انجام دیتے ہوئے ہر سال مجلّہ کی رونمائی معروف ادبی و سیاسی شخصیات سے کراتے ہوئے متعلق افراد کو روانہ کرتے ہیں اسی سلسلے میں امریکہ ٹیکساس میں النور انٹرنیشنل کے زیراہتمام ہوئے تازہ مشاعرہ و کوی سمیلن کے تازہ مجلّہ کی رونمائی ہاشمی گرلس پی جی کالج میں بدست وزیر تعلیم ثانوی حکومت اتر پردیش محبوب علی، چیئرمین ہاشمی ایجوکیشنل گروپ ڈاکٹر سراج الدین ہاشمی، پرنسپل کالج ڈاکٹر نوشابہ پروین، صدر شعبہ بی ایڈ ڈاکٹر سنت کمار مشرا و دیگر شرکا کی موجودگی میں ہوئی۔

روزنامہ 'خبریں' دہلی، یکم جون 2015

دریافت

امراوتی: ودربھ لائبریری، جمیل کالونی، امراوتی میں منعقد ایک مختصر لیکن باوقار تقریب میں ڈاکٹر محمد یحییٰ جمیل کے تحقیقی و تنقیدی مضامین کے مجموعے 'دریافت' کی رسم رونمائی انجام پائی۔ اس تقریب کی صدارت پروفیسر خلیل الرحمٰن انصاری نے کی۔ معرف نقاد ڈاکٹر سید صفدر اور مشہور شاعر جناب حفیظ مومن صاحب مہمانان خصوصی کے طور پر موجود تھے۔ حافظ محمد اسرائیل کی تلاوت کلام پاک سے جلسے کا آغاز ہوا۔ ودربھ لائبریری کے صدر شیخ عمر کوثر نے گلدستوں اور شالوں سے مہمانوں کا استقبال کیا۔ بعدازاں تقریب کی غرض و غایت بیان کی۔ اس کے بعد صدر جلسہ نے 'دریافت' کی رسم رونمائی انجام دی۔

روزنامہ 'سیاسی تقدیر' دہلی، 28 مئی 2015

تماشہ میرے آگے

بھوپال: کوہ فضا واقع ہیلدی کلب میں احد پرکاش کی غزلوں کی کتاب 'تماشہ میرے آگے' کی رسم اجرا مشہور ہندی شاعر ظہیر قریشی اور اشوک مزاج کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ اس موقعے پر بھوپال کے مشہور شاعر ظفر صہبائی، فاروق انجم، تاج الدین تاج، اقبال مسعود، مہیش اگروال نے دور حاضر سے جڑی اور سماجی بیداری سے لبریز غزلوں کو سنا کر سامعین کو مسحور کردیا۔ شعری اکادمی سب رنگ خوشبو کلچرل سوسائٹی کے زیراہتمام یہ پروگرام منعقد کیا گیا تھا۔ پروگرام کی نظامت فرح خان نے کی۔ فرح خان نے ہی اس کتاب کی ترتیب دی ہے اور شعری اکادمی نے کتاب کو شائع کیا ہے۔ پروگرام کی صدر ظہیر قریشی نے احد پرکاش کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ دراصل سچی غزلیں وقت کا آئینہ ہوتی ہیں۔ احد پرکاش نے سچی اور دل کو چھونے والی غزلیں لکھی ہیں۔

روزنامہ 'ندیم' بھوپال، 24 مئی 2015

وفیات:

پروفیسر مجیب رضوی

نئی دهلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ ہندی کے سابق صدر پروفیسر مجیب رضوی

کا انتقال ہوگیا وہ 81 برس کے تھے۔ ان کے پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ 2 بیٹیاں ہیں۔ مرحوم سانس کے عارضہ میں مبتلا تھے اور طویل عرصے سے علیل بھی تھے۔ پروفیسر مجیب رضوی جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ ہندی کے اولین سربراہ تھے۔ ان کے ہی دور صدارت میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبہ ہندی کا آغاز ہوا تھا اور اسی زمانے میں ہندی میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کورسز کی شروعات ہوئی تھی۔ پروفیسر مجیب رضوی پرووائس چانسلر کے عہدے پر بھی فائز رہے تھے۔ مرحوم کو فارسی، اودھی اور ہندی میں مہارت حاصل تھی۔ ان کے جنازہ کی نماز پیر کی صبح 10 بجے جامعہ مسجد جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ادا کی گئی اور تدفین بٹلہ ہاؤس قبرستان میں عمل میں آئی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 25 مئی 2015

م۔ق۔خان

گیا: اردو اور انگریزی کے بے حد مشہور اور مقبول افسانہ نگار ڈاکٹر م۔ق۔خاں 26 مئی کو داغ مفارقت دے گئے۔ ان کی نماز جنازہ 27 مئی کی صبح سات بجے گیا کی معروف گنج مسجد کے قریب ادا کی گئی اور اس کے بعد ان کے جسد خاکی کو ان کے آبائی گاؤں گیا کے موضع بھیڑا (گرارو) لے جایا گیا، جہاں کے قبرستان میں انھیں سپرد خاک کیا گیا۔ اسی گاؤں میں 11 جنوری 1940 کو ان کی پیدائش ہوئی تھی۔ اردو کے معروف افسانہ نگار اور صحافی ڈاکٹر سید احمد قادری نے بتایا کہ ڈاکٹر م۔ق۔خاں کی رحلت سے افسانوی ادب کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ وہ ادب اور سماج کے ہر دلعزیز فنکار اور شخصیت تھے۔

دہائیوں تک گیا کے مہابیر اسکول میں انگریزی زبان و ادب میں درس و تدریس کے فرائض انجام دینے کے بعد چند سال قبل وہ سبکدوش ہوئے تھے۔

ڈاکٹر م۔ق۔خاں نے اپنا افسانوی سفر افسانہ 'ایک مشت غبار' سے شروع کیا جو کہ ماہنامہ 'شاعر' کے 1971 کے ایک شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ بعدازاں معروف افسانہ نگار اور صحافی کلام حیدری نے اپنے رسالہ 'آہنگ' کا ایک خصوصی گوشہ بھی ان کے افسانوں پر شائع کیا تھا،

جس کی ادبی دنیا میں خوب پذیرائی ہوئی تھی۔ ان کے تین افسانوی مجموعے 'میں نہیں کہہ سکتا' (1980)، 'تیشۂ صدا' (2000) اور 'تنہائی میں مکالمہ' (2003) شائع ہوکر ادبی دنیا میں موضوع بحث بن چکے ہیں۔ ان کے علاوہ چوتھا افسانوی مجموعہ زیرترتیب تھا۔ انھوں نے گیا ضلع انجمن ترقی اردو کے صدر کی حیثیت سے کئی کارہائے نمایاں انجام دیا تھا۔ ان کی کتابوں کو اترپردیش اور بہار اردو اکادمیوں نے گرچہ انعامات سے نوازا تھا، پھر بھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا۔ روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 28 مئی 2015

شمیم حیدر نقوی

نئی دہلی: کئی دہائیوں تک دہلی اور اطراف میں مختلف علمی ادبی اور مذہبی انجمنوں میں سرگرم رول ادا کرنے والے سید شمیم حیدر نقوی کا انتقال ہوگیا۔ پسماندگان میں

اہلیہ کے علاوہ ایک بیٹا سید عظیم حیدر نقوی، تین بیٹیاں اور ایک داماد شامل ہیں۔ ان کی عمر 68 سال تھی۔ کربلا کوٹلہ قدیمی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ مرحوم پوری زندگی علم و ادب اور مذہبی انجمنوں سے وابستہ رہے۔ غالب اکادمی میں لائبریرین کے عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد روزنامہ صحافت اور اس کے بعد روزنامہ انقلاب سے وابستہ تھے۔ بزم یادگار انیس کے تحت وہ ہر سال بڑے پیمانے پر ایک پروگرام منعقد کرتے تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 20 مئی 2015

خراج عقیدت:

اقبال متین کے انتقال پر تعزیتی نشست کا انعقاد

حیدرآباد: مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد کے شعبۂ اردو میں اردو کے مشہور و معروف فکشن نگار و شاعر اقبال متین کے سانحہ ارتحال پر پروفیسر خالد سعید کی صدارت میں تعزیتی اجلاس کا انعقاد عمل میں آیا۔ پروفیسر خالد سعید نے اپنے صدارتی خطبے میں اقبال متین کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس عظیم الشان فکشن نگار کی وفات سے اردو دنیا میں ایک خلا پیدا ہوا ہے۔ انھوں نے ان کے افسانے 'شعلہ پوش' کے حوالے سے کہا کہ اس میں اقبال متین نے جس فنکاری سے دور حاضر کے انسانوں کی بے حسی اور بے ضمیری کو پیش کیا ہے وہ بے مثال ہے۔ پروفیسر نسیم الدین فریس نے اقبال متین کی شخصیت، فن اور سوانحی کوائف پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اقبال متین کا اصل نام مسیح الزماں اور اقبال متین قلمی نام تھا ان کا تعلق حیدرآباد کے مہذب اور باوقار گھرانے سے تھا۔ ان کے پہلے ہی افسانوی مجموعہ کے پیش لفظ میں سلیمان اریب مدیر صبا نے لکھا کہ ان کا افسانہ نگاری کی طرف کوچ کرنا شاعری کے لیے نقصان دہ تو ہے لیکن افسانے کے حق میں فال نیک ہے۔ اقبال متین نے 'چراغ تہہ داماں' کے عنوان سے ایک ناول بالکل منفرد اور انوکھے موضوع پر لکھا جس پر تبصرہ کرتے ہوئے عابد سہیل نے کہا تھا کہ یہ اس طرح کا موضوع ہے جسے سوچتے ہوئے بھی خیال کی انگلیاں جل جاتی ہیں۔ وہ ایک بڑے فنکار تھے انھوں نے بڑی ہنرمندی اور احتیاط سے اس ناول کی کہانی بیان کی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ اقبال متین کے ذکر کے بغیر اردو فکشن کی تاریخ نامکمل ہوگی۔ ڈاکٹر بی بی رضا خاتون نے اقبال متین کی وفات پر رنج والم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ بہت اچھے افسانہ نگار تھے۔ انھوں نے ایک ناول اور سات افسانوی مجموعے اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ ڈاکٹر مسرت جہاں نے اقبال متین کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ وہ ایک بے حد مخلص انسان تھے۔ ان تحریروں سے غریب الوطنی کے درد کا احساس ہوتا ہے۔ وہ اپنی تحریروں کے ذریعے زندہ رہیں گے۔ اس نشست میں شعبہ اردو کے اساتذہ اور طلبا نے شرکت کی اور مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کے ساتھ اجلاس اختتام کو پہنچا۔ روزنامہ 'رہنمائے دکن' حیدرآباد، 8 مئی 2015

اقبال متین

گیا: اردو کے مشہور فکشن رائٹر اقبال متین کا انتقال 5 مئی کو حیدرآباد میں ہوگیا۔ ان کی موت پر ایک تعزیتی نشست انجمن ترقی پسند مصنفین کی جانب سے وہائٹ ہاؤس کمپاؤنڈ میں ہوئی۔ جس کی صدارت پروفیسر افصح ظفر نے کی اور نظامت کا انجام ڈاکٹر احمد صغیر نے بحسن خوبی نبھایا۔ اس تعزیتی نشست میں شاہد اختر نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اقبال متین اپنے زمانے کے بہت ہی مشہور و معروف فکشن رائٹر رہے۔ انھوں نے اُردو فکشن کی روایت کو وقار بخشا۔ بہار سینٹرل یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر احمد کفیل نے کہا کہ اقبال متین کے فکر میں ترقی پسندی ہے اور اسلوب میں رومان ہے۔ ان کی زبان بہت صاف ستھری اور زمین سے جڑی ہوئی ہے۔ فردوس گیاوی نے کہا کہ اقبال متین فکشن کے حوالے سے ایک بڑا نام تھا جو ہم سے رخصت ہوگیا۔ ان کا ناول 'چراغ تہہ داماں' بے حد اہم ناول ہے۔ جس نے مجھے کافی متاثر کیا۔ احمد صغیر نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میں نے اقبال متین کے بہت سارے افسانے پڑھے لیکن ان کا ناول 'چراغ تہہ داماں' مجھے بے حد پسند ہے جس پر میں نے ایک مضمون بھی لکھا ہے اور یہ مضمون اقبال متین کو بے حد پسند آیا۔ پروفیسر حسین الحق نے اقبال متین کے حوالے سے بہت اہم باتیں بتائیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم لوگوں نے جب لکھنا شروع کیا تو اقبال متین کا چرچہ زیادہ تھا۔ وہ ترقی پسندوں کے ساتھ ہمیشہ رہے۔ اس کے باوجود فکشن کے ذکر میں یا فکشن کے مین اسٹریم کا حصہ نہیں بن پائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے حیدرآباد میں رہتے ہوئے بھی حیدرآباد کی تہذیب کو اس طرح نہیں دیکھا اور نہ اپنے افسانوں میں برتا جس طرح جیلانی بانو اور واجدہ تبسم نے برتا ہے۔ پروفیسر محفوظ الحسن نے کہا کہ اقبال متین مزاجاً بہت اکھڑ تھے۔ وہ اپنی شرطوں پر جینا چاہتے تھے۔ اپنی شرطوں پر لکھتے اور اپنی شرطوں پر منوانا چاہتے تھے۔ شاید اسی وجہ سے تمام صلاحیتوں کے باوجود وہ اس طرح مشہور نہیں ہوئے یا ان کی نمایاں پہچان نہیں بن سکی۔ اپنے صدارتی خطبے میں پروفیسر افصح ظفر نے کہا کہ اقبال متین سے میرا تعلق بہت پرانا رہا ہے۔ ایک بار ایسی ناراضگی ہوئی کہ رشتہ ٹوٹ گیا۔ ناراضگی کی وجہ ان کا ناول 'چراغ تہہ داماں' تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ اس ناول پر میں لکھوں لیکن اس وقت نہیں لکھ سکا جس کی وجہ سے وہ ناراض ہوگئے۔ تخلیق کار ایک ماں کی طرح ہوتا ہے۔ اس کو اپنی ہر تخلیق اچھی لگتی ہے۔ اس لیے وہ اپنی کسی تخلیق کی برائی سننا پسند نہیں کرتا۔ ان کا افسانوی مجموعہ 'نچا ہوا البم' بے حد اہم افسانوی مجموعہ ہے۔ آخر میں جلیل احمد علائی نے شکریہ کی رسم ادا کی۔ پریس ریلیز: احمد صغیر، گیا، 8 جون 2015

سکندر احمد

مالیگاؤں: 5 مئی، اردو کے معروف و بیباک نقاد جناب سکندر احمد کی دوسری برسی کے موقع پر ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی فاؤنڈیشن، سولاپور کے زیر اہتمام، مہر فاؤنڈیشن دھولیہ، انٹرنیشنل افسانچہ فاؤنڈیشن مالیگاؤں کے اشتراک سے میڈیا سینٹر مالیگاؤں میں ادبی تقریب بیاد سکندر احمد و محفل افسانہ منعقد کی گئی۔ جلسے کی صدارت راحت ہاسپٹل کے روح رواں ڈاکٹر ارشد یوسف نے فرمائی۔ بطور مہمان خصوصی سماجی خدمت گار، خادم اردو، جنتا بینک مالیگاؤں کے نائب چیرمین یعقوب برکت اللہ نے سکندر احمد کی علمی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ان کی ناگہانی موت کو اردو تنقید کا نقصان قرار دیا۔ ڈاکٹر شبیر اقبال نے کہا سکندر احمد صف اول کے نقاد تھے۔ معروف شاعر امان افسر نے کہا ہے کہ سکندر احمد کی شاعری حسن تعلیل اور خیال بندی کے لحاظ سے فنکارانہ ہنرمندی کی آئینہ دار ہے۔ معروف افسانہ نگار و ناقد شمس الضحیٰ اسرائیل نے کہا کہ "سکندر احمد نے افسانے کی تنقید کو نئی جہت عطا کی۔" اس موقعے پر دیگر مہمانان و شعرا و ادبا کثیر تعداد میں شریک تھے۔ پریس ریلیز: سلطان اختر، مالیگاؤں، 13 مئی 2015

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

فرہنگ اصطلاحات (انگریزی-اردو) کامرس

ادارہ
صفحات: 306
قیمت: 141 روپے

زندگی نامہ: قرۃ العین

تحقیق وترتیب: جمیل اختر
صفحات: 296
قیمت: 143 روپے

حیوانات کی دلچسپ دنیا

مصنف: محمد خلیل
صفحات: 83
قیمت: -/24 روپے

باقیات علی سردار جعفری

مرتب: علی احمد فاطمی
صفحات: 498
قیمت: 228 روپے

ٹی وی نیوز پروڈکشن فن اور طریقۂ کار

مصنف: سمیع الرحمٰن
صفحات: 217
قیمت: 93 روپے

کیلی گرافی اور گرافک ڈیزائن

مصنف: خورشید عالم
صفحات: 180
قیمت: 144 روپے

دیوانِ بیدار

مرتب: پروفیسر نسیم احمد
صفحات: 256
قیمت: 122 روپے

اسلوبیاتی تنقید: نظری بنیادیں اور تجزیے

مصنف: پروفیسر مرزا خلیل احمد بیگ
صفحات: 500
قیمت: -/174 روپے

اکیسویں صدی میں اردو کا سماجی وثقافتی فروغ

مرتب: پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین
صفحات: 549
قیمت: -/235 روپے

اکیسویں صدی میں اردو: فروغ اور امکان

مرتب: پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین
صفحات: 349
قیمت: -/163 روپے

عصری لغت

مصنف: پروفیسر عبدالحق
صفحات: 749
قیمت: 240 روپے

اردو لوک ناٹک: روایت اور اسالیب (حصہ اوّل)

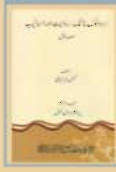

مصنف: کنول ڈبائیوی
ترتیب وترمیم: پروفیسر ابن کنول
صفحات: 482
قیمت: 170 روپے

اردو لوک ناٹک: روایت اور اسالیب (حصہ دوم)

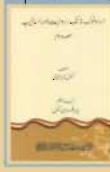

مصنف: کنول ڈبائیوی
ترتیب وترمیم: پروفیسر ابن کنول
صفحات: 482
قیمت: 162 روپے

حصولِ آزادی کے لیے ہندوستان کی جدوجہد

مترجم: سعید احمد انصاری
صفحات: 680
قیمت: -/234 روپے

عربی ادب کی تاریخ (جلد سوم)

مصنف: عبدالحلیم ندوی
صفحات: 695
قیمت: -/178 روپے

عربی ادب کی تاریخ (جلد اوّل)

مصنف: عبدالحلیم ندوی
صفحات: 372
قیمت: -/112 روپے

انگریزی اصطلاحوں اور محاوروں کی جدید صحافتی فرہنگ

مصنف: سید راشد اشرف
صفحات: 493
قیمت: -/238 روپے

جسم وجاں

مصنف: عبدالمعز شمس
صفحات: 354
قیمت: -/138 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

URDU DUNIYA Monthly, July-2015, Vol.17, Issue:07
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2014-16
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/06/2015
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

سوچ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش
اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے
مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!
ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے
(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:
شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director, NCPUL on behalf of NCPUL, FAROGH-E-URDU-BHAWAN, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi-110025 and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 on 80 GSM Art Paper produced by JK Editor : Prof. Syed Ali Karim, Tel : 49539000